جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا

الْاَنْہَار

یعنی

تنقیدِ ہشت بہشت

نوشتہ

جناب مولانا سیّد محمد سلیمان اشرف صاحب پروفیسر مدرسۃ العلوم علیگڑھ

جو

اوّل کلیات حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ میں مثنوی ہشت بہشت کے ساتھ

طبع ہو کر اب ایک مستقل کتاب کی شکل میں مندرجہ عنوان اسم سے موسوم ہوئی

اور

باہتمام محمد مقتدی خاں شروانی

مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ کالج میں طبع ہوئی ۱۹۱۸ء

(اور آدم جی پیر بھائی منزل کالج سے شائع ہوئی)

ہشت بہشت

فہرست مضامین

التماس

فقیر کے جو خدمت کہ سپرد کی گئی تھی اُس میں کہاں تک کامیابی ہوئی اس کے متعلق صرف اسقدر گزارش ہی کہ حق تعالیٰ نے جو کچھ چاہا اور جیسا کچھ چاہا وہی ہوا۔ اگر مضمون تشنہ ہی یا بیان ناقص تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا اکمال کسی اور کے قلم سے مقدر ہو چکا ہی۔ یہ سعادت جب کہ میرے حصّہ میں نہ تھی تو پھر اُس کا تکملہ میرے ہاتھوں سے کیونکر ہوتا۔ کوئی اللہ کا بندہ لکھ کر طالبین کی پیاس بجھا دیگا۔ فقیر گوشہ نشین بھی اُس سے استفادہ کر لیگا۔ اس کے بعد یہ گزارش ہی کہ پہلے محض تنقید ہشت بہشت کا کام سپرد ہوا تھا۔ اُس کے بعد کتاب کی تصحیح متعلق ہوئی۔ لیکن دل یہ چاہتا تھا کہ اس ایک کتاب کی تنقید مفصّل اور دیگر اصناف نظم پر خسرو علیہ الرحمہ کے ایک مجمل تبصرہ لکھا جائے۔ اور تبصرہ سے پہلے فارسی شاعری کے ادوار دکھائے جائیں گو بعض اصحاب اس تبصرہ اور ادوار شاعری کے مضمون کو تنقید سے بے تعلق سمجھینگے لیکن کسی نہ کسی حیثیت سے اُن مضامین کا پیوند تنقید سے ضرور صحیح ہو سکتا ہی۔ میں اسی فکر میں تھا کہ سیدائے علم و فن و نقاد سخن **نواب حاجی محمد اسحٰق خاں** متع اللہ المسلمین بطولِ بقائہ نے بھی اس کی تحریک فرمائی۔

اُن حضرات کی خدمت میں جو کسی کتاب کی تنقید کا دائرہ اُسی کتاب میں محدود سمجھتے ہیں اور اَن کی تحقیق میں اُس سے سرِ مو تجاوز کرنا یا تعلقات سے بحث ایک ناقابل معافی گناہ ہی) یہ گزارش ہی کہ فقیر کو مورد عتاب نہ قرار دیں اور چین بجبیں نہوں حصص ماقبل کو چھوڑ دیں۔ اور صفحہ ۱۶۹ سے کتاب کا مطالعہ شروع فرمائیں۔ یہ بحث پھر کبھی ہو رہیگی کہ تنقید کا کیا مفہوم ہے اور اُس کے اجزاء و لوازم کیا ہیں۔ اس وقت صرف اس ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں ؎

حافظ بخود نپوشید این خرقۂ می آلود ... اے شیخ پاکدامن معذور دار ما را

اب میں مخدوم قوم عالی جناب **نواب حاجی محمد اسحاق خاں** صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے اشفاق والطافِ گوناگوں نے مجھ جیسے ناکارہ و ہیچ کارہ کو اس سعادت کا موقع دیا۔

اپنی حالت تو اس شعر کی مصداق ہے ؎

نہ شگوفہ ام نہ برگم نہ درختِ سایہ دارم ... ہمہ حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت ما را

ایک وجود معطل ہے جو کام کرنے سے ہمیشہ گریزاں و ترساں رہا۔ جیلہ جو کاہل و سست طبیعت میں کبھی کسی کام کی ہمت ہی پیدا نہ ہوئی۔ پھر ایسا مہتم بالشان کام جس کی نہ اپنے میں قابلیت نہ صلاحیت اس کے انجام کا کیا سامان تھا۔ لیکن ممدوح موصوف الصدر نے اپنے عنایاتِ بزرگانہ کے ایسے مینھ برسائے کہ کاہلی کے خوابِ گراں سے نفس کو مجبوراً بیدار ہی ہونا پڑا اور اپنی عادت کے خلاف کام کرنے پر یہ کہتا ہوا آمادہ ہوا ؎

بہ تے چوں ماہ زانو زدمی چوں لعل پیش آورد ... تو گوئی تائبم حافظ ز ساقی شرم دار آخر

خسرو علیہ الرحمۃ کا کلام اور اس کے احیاء پر نواب صاحب جیسا علم پرور آمادہ و کمربستہ پھر سستی اور کاہلی! توبہ!! توبہ!!!

آخر کتاب کی تصحیح لغات کا حل مشکلات اشعار کی تشریح سب سے مقدم کی گئی اس کے بعد کتاب کی تنقید تمام کی۔ پھر مقابلہ کی سخت کشاکش سے فرصت ملی۔ اب ایک تبصرۂ اجمالی خسرو کی عام شاعری کے متعلق لکھا گیا۔ آخر میں مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر اپنے کار مفوضہ سے سبکدوشی پائی۔

لیکن تصحیح کا کام ہرگز انجام نہ پاتا اور اپنے دیگر خیالات خانۂ تخیل سے ہرگز آگے نہ بڑھتے اگر ایک پیکرِ علم کی مدد فرمائی نہ ہوتی۔ یعنی مولانا **محمد احتشام الدین** صاحب ایم اے سلالۂ خاندان حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ۔

مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں جہاں جذبات گوناگوں رکھنے والے اشخاص پائے جاتے ہیں وہاں یہ ایک وجود علم و فن کا والہانہ شیدا گوشۂ تنہائی میں بیٹھا ہوا مشرقی و مغربی مصنفین سے محققانہ مشورہ میں محو رہا کرتا ہے۔

یہ فقیر کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ ایسے مجسمۂ علم سے ابتدائے تعلق کالج سے آج تک مسلسل نیازمندی و ارادت کا سلسلہ قائم ہے۔ اور اُس جانب سے کرم فرمائی و ذرّہ نوازی۔

کتاب ہشت بہشت کا پہلا نسخہ جو خاص کتب خانہ کالج کا تھا مجھے جس وقت ملا تو اُس کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جو کتاب اہل علم کی خدمت سے محروم رہی اور گروہِ کملا کی صحبت اُسے نصیب نہ ہوئی وہ ظاہر آرا صحبتوں میں پھنسکر سیرت کی خوبی کھو بیٹھی۔ طرفہ یہ کہ کالج کا یہ نسخہ کرم خوردہ بھی تھا جس کی ہر سطر میں کوئی نہ کوئی حرف یا لفظ کیڑوں کی نذر ہو گیا تھا۔

اب معلوم ہوا کہ یہ کتاب دو بار مطبع نولکشوری میں طبع ہوئی ہے۔ میں نے لکھنؤ اپنے عزیز دوست ملک محمد علی افضل بی اے کو اس کے بھیجنے کی تکلیف دی۔

ایک ہفتہ میں کتاب پہنچی شوق کے ہاتھوں لیا اور نہایت بیتابی سے تار نظر سطور پر پڑنے لگے لیکن وہی تین اشعار کے بعد جو نا اُمیدی کی تلخی محسوس ہوئی ہے اُس کا کیا اظہار کیا جائے۔ خیال گذرا کہ شاید پہلا مطبوعہ نسخہ کچھ صحیح ہوگا اب اُس کی تلاش ہوئی آخر وہ بھی ملا لیکن ایک سے دوسرا غلطی زیادہ پیش کرنے میں مستعد و آمادہ تھا۔

اب پھر خیال قلمی نسخوں کی طرف گیا ایک نہایت ہی نایاب نسخہ نوّاب حاجی محمد اسحاق خاں صاحب نے اپنے خاص کتب خانہ سے عنایت فرمایا دوسرا نسخہ خمسہ کا بانکی پور لائبریری سے منگوایا۔ تیسرا کتب خانہ حبیب گنج سے حاصل ہوا اس کے بعد اور نسخے بھی رامپور، سہارنپور، حیدرآباد، دیوبند وغیرہ سے وقتاً فوقتاً ملتے گئے۔

قریب قریب ہر ایک نسخہ حسین نقش و نگار پاکیزہ حروف و نقاط سے آراستہ تھا لیکن جو جتنا حسین تھا اُتنا ہی صحت سے بعید۔ چنانچہ بانکی پور کا نسخہ حسنِ خط میں لاجواب و بے مثل دیگر

اوصافِ ظاہری میں بھی بے نظیر لیکن ایسی فاش غلطیاں اُس میں قدم قدم پر ملتی تھیں کہ حسن ظاہر بھی اُس کا بدنما معلوم ہونے لگتا تھا۔ غرض کتاب کی تصحیح کیا تھی چیونٹیوں بھرا کباب تھا۔ اگرچہ دس نسخے موجود تھے لیکن اُن کانٹوں میں سے پھول چننا میرے لیے نہایت ہی دشوار تھا آخر اپنے اُسی کرم فرما شیدائی علم وفن کی طرف دستِ استمداد پھیلانا پڑا اور اُس علم دوست نے بھی اپنے کرم کریمانہ سے اس سائل کے دامن کو اُمیّد سے کہیں زیادہ بھر دیا۔ تصحیح و مقابلہ نسخ کا نہ صرف طریقہ بتایا بلکہ پانچ ماہ کامل تک اپنے مشاغل علمیہ کا ایک کثیر حصہ برابر تصحیح و مقابلہ میں صرف کرتا رہا۔ میں حیران ہوں کہ اپنے مکرم کا کیونکر شکریہ ادا کروں جزاھم اللہ خیرالجزاء۔

کسی کتاب کی تصحیح واقعی طور پر جس نے کی ہوگی وہی سمجھ سکتا ہے کہ تصحیح کا کام کسقدر اہم ہے۔ کامل برس روز کی محنت کا نتیجہ ہے جو آج ہشت بہشت کا صحیح نسخہ ناظرین کے ہاتھوں میں ہے۔ کاپی و پروف تین تین اور چار چار بار دیکھے گئے ہیں جس میں ہمارے عزیز طلبائے کالج کی یاوری کا بہت بڑا حصہ ہے۔ خاصکر سیّد منظور حسن و سیّد وصی احمد رضوی متعلم بی اے کلاس و حافظ غلام غوث کا میں تہِ دل سے دعاگو ہوں کہ ان عزیزوں نے بہت گراں بہا امداد کی ہے۔

منیجر مطبع مولانا محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی کا بھی دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے کاپی و پروف کی تصحیح میں بہت مُبالغہ سے محنت کی ہے۔ جو دیدہ سوزی و عرق ریزی کہ مولانا محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی نے فرمائی ہے کوئی منیجر مطبع تو کیا کر سکتا ہے بعض مالک مطابع و مصنفین و مولفین بھی اس دماغ کاوی کے متحمّل نہیں ہو سکتے۔

اب باوجود اس سعی و کوشش کے اگر نقاط و حروف یا مرکز کی کوئی غلطی رہ گئی ہو تو وہ بشریت کا اقتضا ہے۔ حتی الامکان یہ کوشش کی گئی ہے کہ یقینی طور پر وہی الفاظ ملجائیں جو خسرو علیہ الرحمہ کے قلم سے نکلے ہیں۔ اصح و انسب الفاظ متن میں رکھے گئے ہیں اختلاف نسخ علامت ن دیگر فٹ نوٹ میں لکھ دیئے گئے ہیں ح نشان حل کا ہے اور ن نسخہ کی علامت ہے۔

سہولت کے لیے ہندسہ بھی دے دیا گیا ہی۔ جس نسخہ کا لفظ فٹ نوٹ میں لیا گیا ہی وہاں اُس کا حوالہ بھی حرفِ اوّل سے دیدیا گیا ہی۔ مثلاً ج علامت کتب خانہ جہانگیر آباد ریاست نواب حاجی محمد اسحاق خاں صاحب ح علامت کتب خانہ حبیب گنج ریاست مولٰنا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی۔ ر علامت رام پور۔ س علامت سہارن پور۔ ب علامت کتب خانہ بانکی پور وغیرہ

خسرو علیہ الرحمہ کی تصنیف تصحیح و تنقید کو چھ سو برس سے ان باہمت علم دوست حضرات کی منتظر تھی یتیمی ایسا داغ ہی جس سے سینکڑوں داغ اور بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ الا ماشاء اللہ خسرو علیہ الرحمہ جب سایۂ بے پدری میں آئے تو اُنکے نانا عماد الملک نے کنارِ عاطفت میں لے لیا اور اُن کی تربیت و نگرانی میں یہ پودا نہالِ کمال بن کر پھولا اور پھلا۔

لیکن اُن کا کلام جو معنوی اولاد کہلانے کا اصل مستحق تھا سایۂ خسروی سے محروم ہوا تو کسی نے ان یتیموں کے سر پر شفقت کا ہاتھ نہ رکھا آخر نسّاخوں اور کاتبوں کی بیدرد صحبت میں ایسے پھنسے کہ اپنے اصلی اور دلکش جوہر کو کھو بیٹھے حتّٰی کہ جوہر شناس اور نکتہ رس نگاہیں صحت و سقم کی تمیز میں مضطر و پریشان ہو گئیں۔

خدائے پاک **نواب عماد الملک سیّد بلگرامی** کا بھلا کرے جن کی علم دوست نگاہوں نے خسروؒ کے فرزندانِ معنوی کو اس خستہ و خراب حالت میں دیکھکر اُن کی تہذیب و تربیت کا خیال کیا لیکن یہ خیال خانۂ تخیّل سے آگے نہ آتا اگر شاعری اور کمال کے اصلی وارث **نواب حاجی محمد اسحاق خاں** صاحب آنریری سکریٹری مدرسۃ العلوم علی گڑھ کمربستہ و آمادہ نہ ہو جاتے۔

اس طرح کے علمی کام کا جنھیں اتفاق نہیں ہوا ہی وہ تو اُن انتھک اور حوصلہ شکن صبر آزما کوششوں کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے لیکن اگر کسی کو اس دورِ ایّام میں اس قسم کے کام کرنے کا اتفاق پڑا ہی تو وہی اس کو سمجھ سکتا ہی کہ اہلِ علم کی تلاش اُن کی طرح طرح کی نازبرداریاں اور پھر نتیجہ نفی میں دیکھکر کسی اور کی جستجو میں سرگرداں پھرنا، پیہم مایوسیوں سے نہ تھکنا اور سعی کا مسلسل جاری رکھنا کسقدر اہم و معرکۃ الآرا ہی۔

زمانے کا دستور ہے باغ عالم میں دورِ خزاں کے بعد فصلِ بہار ضرور آتی ہے خوابِ غفلت میں تنگ لباسوں کے مسکنے اور آنکھ کے کاجل پھیل جانے اور زلف تا کمر رسیدہ کے اُلجھنے سے جو بے ترتیبی پیدا ہو جاتی ہے نیند کھلنے کے بعد دوسرے کپڑوں کا بدلنا کاجل کا پوچھنا بالوں کا سُلجھانا کچھ اور نکھار پیدا کر دیا کرتا ہے۔ جس پر حُسنِ خدا داد کے سوا مشّاطہ کی سحر آفرینیاں اور بھی ستم ڈھاتی ہیں۔ حضرت خسرو کے کلام پر جسے بے ترتیبی کی گرد نے غازۂ جمال بنکر اور بھی چمکا دیا تھا زمانہ کی غفلتوں اور اہلِ کمال کی انقلابی صعوبتوں نے اُنھیں بہت کچھ قابل آراستگی بنا رکھا تھا جس کا مخصوص شرف خدا نے **نواب حاجی محمد اسحٰق خاں صاحب** کے لیے ازل میں ودیعت کر رکھا تھا۔ طباع کا حُسنِ صورت اور تصحیح کا حُسنِ سیرت، تنقید کا ہر ہفت کرنا یہ وہ چیزیں ہیں کہ لطائف معنوی اگر اہل مذاق کے دل موہ لینگے تو صفائیِ طبع و عمدگی خط و کاغذ اربابِ بصر کو بھی متحیر کرنے میں کمی نہ کرینگے۔ اب اُس ارحم الراحمین سے یہ دعا ہے کہ خدا اپنے اُن بندوں کی اِن علمی خدمات کو شرفِ قبول عطا فرمائے جنھوں نے اُس میں کسی نہ کسی طرح کی معاونت کی ہے۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

یارب از جنسِ ما چہ خیر آید
تو کرم کن کہ ربِ اربابے

حررہٗ بقلمہ
فقیر محمد سلیمان اشرف عفی عنہٗ
بہار شریف
محلہ میرداد
ضلع پٹنہ

۱۲ ذوالقعدہ ۱۳۳۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً

مقدمہ

شاعری

مدارجِ نطق | کائنات کا ایک ایک ذرہ جس طرح قانونِ ارتقا کا پابند ہے اسی طرح زبان بھی آہستہ آہستہ درجہ بدرجہ اپنے مرتبۂ کمال تک پہنچتی ہے۔ ایک طفلِ شیرخوار جب اپنی زبان کھولتا ہے اگر اس کی گویائی کی تدریجی ترقی کی طرف ایک حکیمانہ نگاہ ڈالی جائے تو فلسفہ بہت اچھی طرح حل ہو سکتا ہے کہ قانونِ ارتقا کی ہمہ گیری کس طرح زبان کے کامل بنانے میں جاری ہے۔

ابتدا میں بچے جب نطق سے زبان آشنا ہوتے ہیں اور اپنے جذبات اور خواہشات کا اظہار اپنے تکلّم سے کرنا چاہتے ہیں تو اس وقت اُن کی کمزور زبانیں جن کے

پاس اظہار مدعا کے وسائل محض برائے نام ہوتے ہیں، صرف چند حروف پر اکتفا کرتی ہیں مثلاً اگر بھوک نے اُنھیں بیتاب کر دیا ہی اور دودھ پینے کی طرف طبیعت مضطر ہی تو صرف لفظ "دُودُو" کا شور مچاتے ہیں اور روتے جاتے ہیں۔ اگر پیاس نے تڑپا دیا ہی تو "مم مم" کہتے جاتے ہیں اور بلبلاتے جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر ماں کی آغوش شفقت نے یاد آ کر بیکل کر دیا ہی یا باپ کے کنار عاطفت میں راحت پانے کو جی چاہا ہی تو "مَم مَ ب بَ" کہکر اپنی دلی تمنا کا اظہار کرتے ہیں۔ اس سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہی ایک تو یہ کہ جو چیزیں قریب تر ہوتی ہیں اور جن کی طرف حاجت مضطر کرتی ہی سب سے پہلے وہی چیزیں خیال میں آکر الفاظ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ابتدائے امر میں جب کہ اظہار خیال پر اس قدر قدرت بھی نہیں ہوتی کہ اپنے مطلوب و مرغوب کا کم از کم نام ہی بتا دیں تو اس وقت اس کمی کو اپنے حرکات و افعال سے پورا کرتے ہیں۔

اب وہی لڑکا ذرا بڑھتا ہی زبان میں اُس کے طاقت کچھ زیادہ ہوتی ہی والدین و دیگر اہل خاندان کے گفتگوئیں پیہم اُس کے کانوں میں پہنچتی رہتی ہیں۔ اُس وقت اُس کی قوتِ آخذہ اشیائے کے اسما سیکھ لیتی ہی اور اب وہ بچہ حروف کے بجائے اظہارِ مطلب میں اسما استعمال کرتا ہی۔ لیکن اس کے ساتھ نہ فعل ہوتے ہیں اور نہ حروف کا انضمام ہوتا ہی۔ اگر ماں یا باپ کے متعلق اُسے کچھ کہنا ہی یا خود اُنھیں متوجہ کرنا ہی تو صرف "اماں" اور "ابّا" کا پیارا لفظ اُس کی زبان سے نکلتا ہی۔ پھر کچھ اور بڑھتا ہی اور اب اسمائے کے ساتھ افعال بھی ملاتا ہی "اماں آؤ"، "ابّا جاؤ"۔ اس کے بعد سنِ تمیز کو پہنچکر اسما، افعال و حروف

سے کامل مرکب جملے اُس کے مُنھ سے ادا ہوتے ہیں۔ تاہم ہنوز اس کے جملوں میں الفاظ کی نشست صحیح نہیں پائی جاتی ہی۔ تلفظ میں ہمواری پیدا نہیں ہوتی ہی۔ موقع و وقت کی مناسبت سے اس کی باتیں نہیں ہوتی ہیں۔ اُس کے خطاب کرنے میں فرق مراتب پایا نہیں جاتا۔ لیکن وہ اب تعلیم پاتا ہی، بزرگوں کی صحبت سے مستفیض ہوتا ہی۔ مختلف مدارج و حیثیات کے انسانوں سے اُسے ملنا پڑتا ہی جن میں کوئی اُستاد ہی، کوئی دوست ہی، کوئی باپ ہی، کوئی بزرگ ہی اور کوئی خادم ہی۔ غرض ہر ایک کا اندازِ خطاب و تکلم مختلف دیکھتا ہی جس کے مطابق اپنی گفتگو میں اصلاح کرتا جاتا ہی۔ کچھ کتابوں کی تعلیم اور کچھ عملی زندگی کا سبق مل جل کر اُس کی اُس کمی کو پورا کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جوان ہو کر اب وہ فرق مراتب بھی اپنے کلام میں قائم کرتا ہی اور موقع و مصلحت کے مطابق گفتگو کرتا ہی۔

جس قدر تعلیم کا دائرہ وسیع اور مہذب و شایستہ صحبتوں کا اثر قوی ہوتا جائے گا اُسی قدر اُس کے الفاظ میں قوت، جملوں میں زور کلام میں حسن و دل آویزی بڑھتی جائیگی اور جس قدر الفاظ کے ذریعہ سے خیال کی ترجمانی پر قدرت بڑھتی جائیگی اُسی قدر حرکات (جو اب تک ادائے مطلب کے ایک عنصرِ اعظم تھے) کم ہوتے جائینگے اور اُن میں بھی ایک معتدل شایستگی و شان پیدا ہو جائے گی۔

اس تمہید کا مدعا یہ ہی کہ جس طرح ایک بچے کی زبان آہستہ آہستہ تمدن و تعلیم و تربیت کے سہارے درجۂ کمال کو پہنچتی ہی یہی حال ہر ایک ملکی زبان بلکہ بنی نوع انسان کی زبان کا ہی۔ انسان میں جذبات رکھے گئے ہیں اُس میں قوتِ متخیلہ کا خزانہ ودیعت کیا گیا ہی وہ

تاثیر و تاثر کا مجسمہ بنایا گیا ہو۔ گرد و پیش کی چیزیں اُس کی حاجت روائی کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ پس وہ ابتدا میں خیالات کی مصوری اپنے حرکات اور غیر موضوع الفاظ سے شروع کرتا ہو۔ پھر جیسے جیسے تعلیم و تمدن اُس میں آتا جاتا ہو وہ الفاظ وضع کرتا ہو اور ہر مفہوم و ہر شے کے لئے ایک اسم قرار دیتا ہو۔ جب الفاظ کا ذخیرہ کافی ہو جاتا ہو اور نازپروردگی بڑھ جاتی ہو تو اُس وقت الفاظ کے قالب پر نظر کی جاتی ہو۔ نفاست طبع الفاظ کی درستگی کی طرف متوجہ ہوتی ہو۔ اب اُن کی ثقالت و خفت دیکھی جاتی ہو، اختصار مطبوع خاطر ہوتا ہو غرض اسی طرح بآہستگی زبان میں لطافت و روانی پیدا ہو جاتی ہو اور خیالات کی دھندلی تصویر الفاظ کے آئینہ میں اپنا جلوہ دکھانے لگتی ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان خیال کا آئینہ ہے، مگر کچھ زنگ آلود۔ انسان چاہتا ہو کہ خیالات و جذبات کی کامل ترجمانی الفاظ سے ہو جائے، مگر نہیں ہوتی۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم، تہذیب اخلاق، تمدن و سیاست اگر سب مل کر اس کی مدد کریں تو بہت کچھ اس آئینہ کا زنگ دور ہو جاتا ہو لیکن حرکات اعضا و جوارح کے بغیر اس تصویر کے خط و خال واضح طور پر نمایاں نہیں ہوتے۔ الغرض انسان کی یہ کوشش کہ خیالات یا جذبات کی بعینہٖ و بجنسہٖ تصویر الفاظ کے قالب میں منعکس ہو جائے ایوانِ شاعری کے در کی کنجی ہو۔

شعر اور شاعر موزوں و مناسب الفاظ میں جو حقائق کی تصویر کشی کی جاتی ہو وہی شاعری کی سنگِ بنیاد ہو۔ شاعر خیالات، جذبات، کیفیات، محسوسات و معقولات کو چوں کہ اپنے بیان سے اس طرح ظاہر کرتا ہو کہ سننے والوں کے سامنے اُس کا نقشہ کھنچ جاتا ہو دلوں پر

کیفیت طاری ہو جاتی ہے اس لئے اُسے شاعر کہتے ہیں۔ اب جس قدر کلام میں یہ وصف زیادہ ہوگا اُسی قدر اُس کی شاعری کامل سمجھی جائیگی۔ لفظ شاعر کا مادّہ (یعنی حروفِ اصلیہ) ش ع ر ہیں یہ مادّہ جہاں جہاں پایا جائے گا اُس میں ظہور کے معنی کا لحاظ ضرور ہوگا۔ اس لئے عربی میں بال کو شَعر کہتے ہیں جو جسم پر ظاہر ہوتے ہیں جسم سے اوپر جو کپڑا پہنا جائے اُسے شعار کہتے ہیں۔ حواس جو قوّتِ مدرکہ کے سامنے موجودات کو ظاہر کرتے ہیں اُنھیں مَشاعر کہتے ہیں۔ وہ کلمات جو خیال کے لئے صاف آئینہ ہوں اور واضح شکل میں خیالات کو ظاہر کریں وہ شعر ہیں۔ اسی بنا پر وزن و قافیہ کو بعضوں نے شعر کی حقیقت سے خارج رکھا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ شعر کے یہ اجزا ہیں بھی نہیں، بلکہ اُس کے شرائط ہیں مثلاً ؎

اکھتر بہتر تہتر چوہتر پچھتر چھہتر ستتر اٹھتر

دیکھو اس میں وزن و قافیہ موجود ہے، لیکن اسے شعر کہنا کیا حماقت نہیں؟

اجزا، لوازم و شرائطِ شعر | پس باعتبارِ حقیقت شعر کے دو اجزا ہیں، دو لوازم ہیں، اور دو شرائط۔ محاکات و تخیل اجزا ہیں اکتارِ الفاظ و مطالعۂ صحیفۂ کائنات لوازم ہیں وزن و قافیہ شرائط ہیں۔

۱۔ محاکات | محاکات کے معنی نقالی ہیں یعنی جو واقعہ جس طرح دیکھا جائے یا سنا جائے یا جو اثر و کیفیت کہ دل پر گزرے اُس کو اس طرح ادا کر دیا جائے کہ غائب اُسے سُن کر اپنے کو حاضر سمجھنے لگے۔ لیکن صرف اسی قدر شعر ہونے کے لئے کافی نہیں ہے مثلاً ؎

چشمانِ تو زیرِ ابرو انند دندانِ تو جملہ در دہانند

۲۔ تخیل | بلکہ محاکات کے ساتھ تخیل کا انضمام بھی لابد و ضروری جز ہے تاکہ شعر تُک بندی کا

مصداق نہو۔ مثلاً خسرو اُس حالت کو بیان کرتے ہیں جب کہ برسات میں پانی برستا ہے۔ اور درختوں کی لچکدار شاخیں پیہم پانی اور ہوا کے جھونکوں سے جھک جھک جاتی ہیں۔ زمین پر پانی بہتا ہوتا ہے اور ان شاخوں کا لچکنا ایک خاص لطف پیدا کرتا ہے۔ اس منظر کو امیر خسرو شاعرانہ تخیل کے ساتھ یوں دکھاتے ہیں ؎

نگوں سر شاخہائے سبز گوئی دُر ہمی چیند   زبس کا برد رافشاں لولوئے غلطاں ہمی بارد

یعنی سبز شاخیں جو زمین پر جھکی پڑتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابر نے جو بے انتہا موتی برسائے ہیں اُن کے رولنے کو جھکی جاتی ہیں۔ یا مثلاً ایک عاشق جو اپنے محبوب کی ایک ایک ادا پر مٹا ہوا ہے اور اُس کی نزاکت و لطافت پر والہانہ فریفتہ و شیدا ہے وہ کاغذ کے اُن چاک شدہ ٹکروں میں بھی ایک لطافت محسوس کرتا ہے جسے اُس کے معشوق نے ریزہ ریزہ کر دیا ہو۔ اب وہ اپنے اس لطیف کیف کی حکایت کرتا ہے ؎

ہر کجا برگِ گلے افتادہ بینم در رہت   از تو پارہ کردنِ مکتوب یاد آید مرا

یعنی اگر گلاب کی پتیاں کہیں بکھری ہوئی ہیں دیکھ لیتا ہوں تو مجھے مکتوب کے وہ ٹکرے یاد آ جاتے ہیں جو تیرے ہاتھوں سے چاک ہو کر برگِ گل جیسے نازک و خوشبو ہو جاتے ہیں

۳۔ اکتنازِ الفاظ و مطالعۂ صحیفۂ فطرت

لیکن تخیل و محاکات اُس وقت تک اپنا فرض پورا نہیں ادا کر سکتے جب تک اُن کے پاس الفاظ کا کافی ذخیرہ نہو، تاکہ نازک سے نازک پہلو بھی واقعہ کا قلتِ الفاظ کے سبب چھوٹ نہ جائے یا لطیف سے لطیف جذبہ صرف الفاظ کی کم یابی کے نذر ہو کر ظاہر ہونے سے نہ رہ جائے۔ جیسے کہ بہار کا موسم جس نے دیکھا نہو

یا اُس وقت جو سرورو مستی کہ دلوں پر چھا جاتی ہی اُس سے لذت آشنا نہو تو پھر بہار کے متعلق اُس کی شاعری کیا ہوگی مُنھ چڑھانا ہوگا۔ اور اگر لفظ کی بھی کمی ہو تو پھر بہار کا نقشہ کھینچنا بالکل ہی ناممکن ہو جائے گا پس حکایت و تخیل کے لئے اکثار الفاظ و مطالعہ صحیفہ کائنات لوازم میں سے ہیں۔

۴۔ وزن و قافیہ | اب جب کہ کلام میں حکایت و تخیل مع اپنے لوازم کے پائے جائیں تو اُس وقت وزن و قافیہ کا ہونا بھی ایک ضروری شرط ہی اس لئے کہ جس اسلوب میں ایک قادر البیان فصیح اللسان اپنا کلام مخاطب کے سامنے پیش کرتا ہی جب اُنھیں اسلوبوں میں وزن کی کھچاوٹ اور قافیوں کا تناسب پایا جاتا ہی تو کلام شعر کے سانچے میں ڈھل کر مخاطب کے لئے ایک نوع کا تعجب اور تعجب کے ساتھ خوشی پیدا کر دیتا ہی، اور یہی مخاطب کے دل کی شگفتگی متکلم کے خیالات کا کامل نقش دل پر بٹھا دیتی ہی۔ مثلاً پانی برس رہا ہی عاشق سے معشوق رخصت ہو رہا ہی مدتوں بعد جو لذتِ دیدار ملی تھی یوں ہاتھ سے جا رہی ہی عاشق کی آنکھیں بے اختیار بہہ نکلتی ہیں۔ جذبِ کامل و محبتِ صادق رنگ لاتی ہی معشوق کے دل پر بھی اس فراق کا صدمہ گزرتا ہی۔ اسی کو امیر خسرو یوں کہتے ہیں ؎

ابر باران و من و یار ستادہ بوداع   من جدا گریہ کناں ابر جدا یار جدا

شعر کیا ہی واقعہ کی ایک بولتی تصویر ہی۔ ہم نثر میں ادا نہ کر سکے اور خسرو نے ایک شعر میں ادا کر دیا۔ ایک ایک لفظ پر غور کرو۔ اُس حالت و کیفیت و موقع کا لحاظ کرو۔ اور پھر شعر کی بلاغت کو دیکھو۔ بہر حال محاکات، تخیل، اکثار الفاظ، مطالعہ صحیفہ کائنات، وزن و قافیہ شعر کے لئے

یہ امور بمنزلۂ ضروریہ ہیں جن کے بغیر شعر کامل نہیں ہو سکتا لیکن کلام ایسا ہو جس میں جابجا بجلیاں کوندتی نظر آئیں اور اُس کی ہر تجلی دلوں کو تڑپا دینے والی ہو اس کے لئے صرف شعر کا مجسمۂ ہیولانی ہی کافی نہیں ہے۔ ان کے علاوہ چند اور جزئیات ہیں جن کی رعایت شعر کے حسن کو نکھار کر دل آویز و دل پذیر بناتی ہے۔ اور یہی ایک باکمال شاعر کی آخری منزل ہے اور بڑی کڑی منزل ہے۔ وہ چار چیزیں ہیں بلاغت، سلاست، اصلیت اور جوش

بلاغت | بلاغت تو یہ ہے کہ کلام وقت اور حال کے مطابق ہو۔ انسان میں گوناگوں خیالات و جذبات پائے جاتے ہیں کبھی غم و غصہ ہے اور کبھی مسرت و مہربانی ایک وقت بیتابی و بیقراری ہے تو دوسرے وقت راحت و سکون کبھی مستی و بیہوشی ہے اور کبھی باخودی و ہوشیاری پس جس حالت و کیفیت کا بیان ہو کلام اگر اُس میں اس طرح ڈوبا ہوا ہے کہ کہنے والا کہہ رہا ہے اور سننے والے کی آنکھوں کے سامنے اُس کا نقشہ کھنچا جاتا ہے تفصیل کی جگہ وضاحت ہے اور اجمال کی جگہ اختصار تو وہ کلام بلیغ کہا جائے گا۔ اور اسی کو بلاغت کہتے ہیں۔

سلاست | سلاست کے یہ معنی ہیں کہ الفاظ وہ ہوں جو روزمرّہ کے استعمال میں ہوں۔ محاورہ وہ ہو جو عام طور پر زبانوں پر جاری ہو۔ استعارہ و تشبیہ ایسے ہوں کہ سامع کا ذہن فوراً اُس طرف منتقل ہو جائے۔ اضافات کی کثرت و پیچیدگی نہ ہو۔ ادنیٰ، اوسط، اعلیٰ ہر شخص اپنے فہم و مرتبے کے مطابق برابر کا لطف اُٹھائے۔ اسی مضمون کو خاتم الشعرا غالب دہلوی نے کہا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

صاحب عقد الفرید شعر کے محاسن بیان کرتے ہوئے آخر میں قول فیصل یہ لکھتے ہیں کہ اس باب میں سب سے بہتر زہیر ابن سلمیٰ کا قول ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

وَاِنَّ اَحْسَنَ بَیْتٍ اَنْتَ قَائِلُہٗ　　　بَیْتٌ یُّقَالُ اِذَا اَنْشَدْتَہٗ صَدَقَاً

یعنی سب سے بہتر وہی شعر ہے کہ جب تو اُسے پڑھے تو سُننے والا بے اختیار کہہ اُٹھے کہ سچ کہا۔ یہی شعر ایک جگہ حضرت حسّان انصاری کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے جس سے اس رائے کی موافقت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن فقیر کے خیال میں بہترین فیصلہ ابن رشیق کا ہے۔ سلاست شعری کی جو تصویر اُس کے قلم نے کھینچی ہے اُس سے بہتر ناممکن ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

فَاِذَا قِیْلَ اَطْمَعَ النَّاسَ طُرًّا　　　وَاِذَا رِیْمَ اَعْجَزَ الْمُعْجِزِیْنَا

یعنی جب شعر پڑھا جائے تو اُس کی سلاست و سادگی سے ہر شخص کو یہ طمع ہو کہ ایسا میں بھی کہہ سکتا ہوں، لیکن جب کہنے کا قصد کریں تو ادنیٰ اور اوسط کا تو کیا ذکر ہے معجز بیان بھی عاجز آجائیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابن رشیق کا یہ فیصلہ فیصلۂ ناطق ہے۔ ایک قصہ مشہور ہے کہ مفتی صدرالدین مرحوم آزردہ کے مکان پر مومن خاں، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ وغیرہ کا مجمع تھا۔ کسی نے انھیں میں سے میر کا یہ شعر پڑھا ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے　　　دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

ہر ایک نے قلم ہاتھ میں اُٹھایا کہ جواب اس کا لکھیں لیکن گھنٹوں گزر گئے اور قلم نے ہاتھ سے صفحۂ کاغذ تک آنے کی جرأت نہ کی۔ اسی عرصہ میں کوئی دوسرے بے تکلف دوست آگئے اُنھوں نے ایک مجمع سراپا محو استغراق دیکھ کر پوچھا خیر ہے؟ مومن نے کہا ہاں قل ھو اللہ کا جواب لکھنا چاہتے ہیں

اصلیت | اصلیت کے یہ معنی ہیں کہ جس چیز کا بیان ہو وہ باعتبار واقعہ یا شاعر کے عندیہ میں یا مخاطب کے عقیدے میں ویسا ہی ہو جیسا کہ اُس کے الفاظ اُس کو کہہ رہے ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو کلام کا اُس قدر نقص اُسے بے اثر بنا دے گا۔

جوش | جوش کے یہ معنی ہیں کہ شعر کو سنکر یہ اثر پیدا ہو کہ مضمون نے شاعر کو مضطر کر دیا ہے شاعر مضمون نہیں لایا ہے۔ یہ وہ امور جزئیہ ہیں جن سے شعر کا آب و رنگ کھلتا ہے۔ اور زبان سے نکل کر دلوں کو تڑپا دیتے ہیں

فارسی شاعری

اقسام شاعری | اب آیئے فارسی زبان کے نشو و نما اور فارسی شاعری کے اوجِ کمال پر ایک نظر ڈالیں کتابوں میں زبان فارسی کی سات قسمیں پائی جاتی ہیں۔ فارسی، دری، پہلوی، ہروی، سگزی، زاولی، سغدی۔ ہمارے مصنفین جب ان زبانوں کی حقیقت بیان کرتے ہیں تو اُن کا اضطراب عجیب عجیب پہلو سے کروٹیں لیتا ہے۔ حالانکہ بات صرف اس قدر ہے کہ یہ تقسیم کچھ تو باعتبار اُن ملکی خصوصیات کے ہے جو بعض بعض حصصِ ملک میں پائے جاتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو شہر اور دیہات کی وجہ سے ہوئیں مثلاً ملک ہندوستان کو لو۔ یہاں ایک زبان تو وہ ہے جو تقریباً تمام ہندوستان میں سمجھی جاتی ہے اور جس سے کاروبار میں، لین دین میں، تبادلۂ خیالات میں کام لیا جاتا ہے۔ اُسے تھوڑی دیر کے لئے اُردو کہہ لیجئے لیکن جب اس کو باعتبار حصص ملک یا شہر اور گاؤں کے آپ تقسیم کیا چاہیں گے تو بے شمار اُس کی قسمیں پیدا ہو جائینگی کلکتہ کی اُردو کو دہلی کی اُردو سے کیا مناسبت اور بمبئی کی زبان کا لکھنؤ کی اُردو سے کیا علاقہ۔

اُردو زبان دہلی میں پیدا ہوئی اور اسی جگہ اُس نے نشو و نما پایا اپنے آخر عہد میں یہ لکھنؤ پُہنچی اس لئے یہ کہنے کا حق ہے کہ اُردو وہی ہے جو ان دونوں شہروں میں بولی جائے لیکن اگر اُردو ایک نئی زبان نہ ہوتی تو کیا ملک کے مختلف گوشے کچھ اپنی خاص خصوصیت نہ رکھتے۔ یہ ہر زبان کا قاعدہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے بُعد مسافت سے کچھ کچھ متغیر ہوتی جاتی ہے۔ عربی زبان جو نہایت ہی کامل زبان ہے اُس کو دیکھئے یہی اختلاف آپ کو وہاں بھی نظر آئے گا۔ اہل عرب جہاں باعتبار قبائل آپ کو باہم ایک دوسرے سے ممتاز ملیں گے وہاں اُن کے محاورے الفاظ بلکہ حروف تہجّی کے اصوات و تلفظ میں بھی ایک علیحدہ شان ہوگی پس یہی حال ایران کے اقسام ہفت گانہ زبان کا ہے۔ عہدِ قدیم میں فارس کا علاقہ کنارۂ جیحون سے فرات تک اور باب الابواب سے کنارۂ عمّان تک پھیلا ہوا تھا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ ملک کا علاقہ جب اس قدر وسیع ہو گا تو ہر وہ گوشۂ ملک جو دوسرے ملک کے ٹکڑے سے پیوستہ یا قریب ہوگا یا جن غیر ممالک کے باشندوں سے معاشرتی کاروبار میں سابقہ رہتا ہوگا اُن کی زبان کا اثر اس گوشۂ ملک کی زبان پر ضرور پڑیگا۔ پھر اُس کے ساتھ ہی ایک ایسی عام زبان ملکی ہوگی جو ہر گوشۂ ملک میں سمجھی جا سکے یا بولی جا سکے۔ اب خیال فرمایئے۔

فارسی تو وہ زبان ہوئی جو تمام ملک میں بولی جاتی یا سمجھی جاتی تھی۔

پہلوی بیرون شہر کی زبان تھی اس میں قصبات و دیہہ و درۂ کوہ کے باشندے متفق اللسان تھے۔

دری دربار کی زبان تھی جس میں صفائی اور نزاکت حروف کو گھٹا بڑھا کر پیدا کی گئی تھی

زاولی قندھار و غزنی و زابلستان کی گفتگو کا نام ہے۔

سگزی۔ یہ وہ زبان ہے جو سیستان میں بولی جاتی تھی۔ عہدِ قدیم میں سیستان کا نام سگزی تھا۔

سغدی۔ سمرقند کے قرب و جوار میں سرسبز و شاداب قطعہ پر ایک نامور اور آباد شہر تھا یہ زبان اُس شہر کی طرف منسوب ہے۔

ہروی ہرات و ماژندران کی زبان ہے۔

قدیم و جدید زبان | جسے عہدِ قدیم کی فارسی زبان دیکھنے کا شوق ہو وہ ژند و پاژند و دساتیر کو دیکھے۔ ان کتابوں کے جو فقرات یا کچھ حصص ملتے ہیں اُن کو جب عہدِ جدید کی فارسی سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو صاف طور پر دکھائی دے جاتا ہے کہ یہ لفظ کیوں کر کیا سے کیا ہوتے گئے محض تفننِ طبع کے طور پر ہم پانچ چار لفظ لکھے دیتے ہیں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو سخندانِ فارس

فارسی	پھلوی	ژند	پاژند
انبار	انبار	ہاں بار	انبار
شرم	شرم	فشارما	شرم
ناسپاس	اسفاکس	.	ان سپاس
اکنوں	اکنی	.	اکنین
خان	خوانو	.	اخان

انھیں چند لفظوں کو دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ تعلیم تہذیب تمدن و سویلیزیشن اس طرح

آہستہ آہستہ زبان میں تصرف کرتے رہتے ہیں کہ ایک صدی کے اولٹ پھیر کے بعد زبان
کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ اہل شہر اور اربابِ علم کی زبان صفائی اور لچک رکھتی ہے۔ قریہ و دیہہ
کے باشندے اپنی زبان میں سختی اور لہجے میں درشتی رکھتے ہیں ان کی ضرورتیں تھوڑی
ہوتی ہیں اور ضرورت کی پوری کرنے والی چیزیں ضرورت سے بھی کم خیالات محدود، واقفیت کا
دائرہ بہت ہی چھوٹا اس لئے الفاظ کا ذخیرہ بھی ان کی زبانوں میں قلیل ہوتا ہے لیکن
ان کی خالص ملکی زبان ہوتی ہے۔ اس لئے شعرائے ایران کبھی کبھی پہلوی زبان کی مدح
کا راگ گاتے ہیں۔ چوں کہ وہ اصلیت پر قائم ہے شہر کے باشندے تمدن کے گہوارے میں
زندگی بسر کرتے ہیں نازپروردگی و تنعم ضروریات روز افزوں کرتی رہتی ہے تبادلۂ خیالات سے
دماغ میں وسعت پیدا ہوتی ہے، علمی مضامین صیقل و جلا کرتے رہتے ہیں۔ اسی سے الفاظ
کا اکثار ہوتا ہے اور اُن میں لطافت پیدا ہوتی ہے۔ پس شعرا جب زبان کی لطافت و نزاکت کا
خیال کرتے ہیں تو دری زبان کی ثنا میں رطب اللسان پائے جاتے ہیں۔ نظامی فرماتے ہیں

نظامی کہ نظم دری کارِ اوست — چنیں نظم کردن سزاوارِ اوست

اُردو کی مثال اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ہندوستان کی سرزمین میں جب اُردو
پیدا ہوئی ہے اُس وقت کے الفاظ کو دیکھئے پھر جو اُن میں تغیر پیدا ہوا اُس کو دیکھئے مثلاً
سوں بجائے سے۔ ہمن کو بجائے ہم کو۔ نمن بجائے طرح یا مثل۔ بھیتر بجائے اندر
اسی طرح جب انگریزی سلطنت مع اپنے تمدن و علوم کے ہند پر حکومت کرنے لگی تو
کتنے لفظ نئے داخل ہو کر اُردو کے وسیع کرنے والے ہوئے اور کتنے الفاظ کے مفہوم و معنی

متغیر و متبدل ہو گئے مثلاً گلاس، لالٹین، فلالین، کوچبان وغیرہ یہ سب یورپ سے آئے ہوئے ہیں جنھوں نے ہندی لباس پہن لیا ہے۔

تغیر معنی کی مثال کوٹھی پہلے مہاجنوں اور تاجروں کی کاروبار کی جگہ کو کہتے تھے اب اُس کے زیادہ مستعمل معنی ایسے مکان کے ہیں جس میں یورپ کی شان باعتبار ساخت و آرائش ہو۔ صاحب ایک تعظیمی لفظ تھا معزز القاب کے ساتھ بولا جاتا۔ مولوی صاحب خان صاحب اب اُس کے معنی یورپین یا ہندی یورپین وضع و معاشرت رکھنے والا۔ اسی طرح تعلیم یافتہ کے اصلی معنی ظاہر ہیں لیکن اب اس کا اطلاق انگریزی داں پر ہوتا ہے بشرطیکہ کچھ مغربیت کی اداؤں پر فریفتگی رکھتا ہو۔

غرض جس طرح اُردو زبان امتداد زمانہ و انقلاب حالات سے متغیر ہوتی رہی اسی طرح ایران کی زبان بھی موقع بموقع متبدل ہوتی گئی۔ اگر تحقیق کی نظر سے اُن اوراق کا مطالعہ کیا جائے جو جابجا بکھرے ہوئے اب بھی پائے جاتے ہیں تو صاف طور پر یہ واضح ہو سکتا ہے کہ ایرانی زبان بھی ٹھیک اُسی طرح جیسا کہ ایک طفلِ شیرخوار ہُوں ہاں غُوں غاں سے دیباچہ اپنی گویائی کا شروع کرتا ہے فارسی زبان بھی اپنے عہدِ طفلی کی منازل کو طے کرتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی ہے لیکن مرتبۂ کمال تک پہنچنے کے لئے شاعری کی محتاج ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ زبان میں اصلی حسن و خوبی اور نزاکت شاعری سے پیدا ہوتی ہے۔ اور کلام شعر کے ہی سانچے میں ڈھل کر سچا اور صحیح فوٹو جذبات کا ہوتا ہے پس اس کے لئے زبان فارسی ہمہ تن عربوں کے مبارک قدم کی منتظر معلوم ہوتی ہے۔

فارسی شاعری پر عربی شاعری کا اثر | اس میں شک نہیں کہ بعض محبانِ ایران کو یہ بات تلخ

گزرتی ہے کہ عرب کو شاعری میں ایران کا اوستاد کیوں کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کا جواب بجز اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ واقعہ یوں ہی ہے۔ پس مجبوری ہے۔ بعضوں نے اس ثبوت میں جو متفرق اشعار یا بعض مصطلحات شعریہ پیش کیے ہیں وہ خود اُن کے رد دعوی کے دلائل ہیں یا شہادت میں ناقص۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے بہرام نے اور اُس کی معشوقہ نے مل کر ایک شعر برجستہ موزوں کیا تھا، اور یہی شعر سنگِ بنیاد ایران کی شاعری کا ہے۔ بہرام نے جب ایک شیر کو زندہ پکڑ لیا اور اُسے اس قدر زیر و مجبور کیا کہ دونوں کانوں کو اُس کے کھینچکر گرہ باندھ دی تو بہادری کے جوشِ فخر میں بے ساختہ اُس کے مُنھ سے یہ مصرع نکلا

منم آں پیلِ دمان و منم آں شیر یلہ

اُس کی معشوقہ جو بہت ہی حاضر جواب تھی اور جو ہمہ دم اُس کے ساتھ رہتی تھی اُس کی طرف بہرام نے ایک نگاہ تحسین طلب ڈالی۔ اُس نے برجستہ یہ مصرع کہا

نام بہرام ترا و پدرت بوجبلہ

اگر اس واقعہ کو بعینہٖ اسی طرح مان لیا جائے تب بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لفظِ بوجبلہ عرب کی اوستادی کا کیا ثبوت نہیں دے رہا ہے؟ اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ بہرام نے دیارِ عرب میں پرورش پائی تھی اور مصرع یوں ہے نام بہرام مرا و پدرم بوجبلہ یوں ہی سہی۔ پھر بھی تو عجیب نے عرب کی اُستادی ہی ثابت کی۔

اس کے علاوہ چند اور متفرق اشعار ہیں۔ من جملہ اُن کے ایک یہ شعر ہے ؎

هزبرا بگیهاں انوشه بدے جهاں را بدیدار نوشه بدے

اِس کے متعلق ہمدردانِ ایران یہ روایت کرتے ہیں کہ عضدالدولہ دیلمی کے عہد میں بعض عمارتیں جو قصرِ شیریں کی قائم تھیں اُن کے کسی دروازہ پر یہ شعر کندہ تھا۔ لیکن اس شعر کا انداز خود اپنی قدامت سے انکار کرتا ہے۔ یہ دعائیہ شعر اور عمارت کے در پر کندہ۔ یہ تو موزوں فقرات ہیں جو شعر کے قالب میں لائے گئے ہیں۔ اہلِ ایران حضورِ شاہ میں انھیں فقرات سے سلام و تحیۃ پیش کرتے تھے۔

اسی طرح خانِ آرزو کا یہ کہنا کہ "سلاطینِ قدیمہ میں سے فرہوش نام ایک عالی شان بادشاہ تھا اس کے دربار میں گروہِ کثیر اہلِ سخن کا حاضر رہتا تھا۔ ان میں سے شیدوش شاعر نے ایک موقع پر بادشاہ بیگم کے حق میں کہا ؎

زنِ شاہ ہست در داور گردا　　　گوزگرد د ندارد بیم از کس

(زبانِ قدیم میں در داور بمعنی شجاعت۔ گردا بمعنی سمندر۔ گوز بمعنی ہرن) یعنی بادشاہ بیگم شجاعت میں سمندر ہے ہرن کی طرح پھرتی ہے اور کسی سے نہیں ڈرتی"۔ فارس جیسا ملک جس میں چار سلسلے سلاطین باآئین کے گزر گئے اور ایسے شان و شکوہ کے ساتھ سلطنت کر گئے جس کی باتیں آج افسانے ہیں علوم و فنون اس کے یونان و روما کا پہلو مارتے ہیں۔ گلزار زمین، خداداد حُسن تفریح کے سامان اور عیش و طرب میں پرستان طبیعتیں زندہ" اور شعر کی قوت یہ۔ شاہی دربار کا شاعر بادشاہ بیگم کی مدح سرائی کرے اور وہ مدح ایسی ہو اگر ایران جیسے ملک کے لئے ایسی شاعری مایۂ ناز و فخر ہے اور ملک کی سرسبزی و شادابی آبِ ہوا کی تازگی و ولولہ انگیزی نے اسلام سے قبل ایسے ہی شاعر دربارِ شاہی کے لئے

پیدا کئے تو کسی کو اس کے ماننے میں کوئی عذر نہیں کہ ایران ہمیشہ سے شاعر تھا۔ بلکہ ایک قدم آگے بڑھائیے تو دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہ ملے گا جو ایسے باکمال شاعر ہر وقت تعداد کثیر میں پیش نہ کر دے۔ یا دش بخیر قوم افغان جو آج ہند کے مختلف گوشوں میں آباد ہے اس میں رامپور کے بے پڑھے پٹھان چار بیتی کہتے ہیں۔ وہ سماں دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ پھر ہر فریق جو کچھ کہتا ہے وہ ان اشعار سے کہیں زائد پر معنی ہوتا ہے۔

افسوس ایران کو عربوں کا شاعری میں شاگرد کہنا اس کے پایۂ منزلت کو کچھ کم نہیں کرتا ہے۔ لیکن ایسے باکمالوں کا کلام اور پھر شعرا کی فہرست میں اُن کے اسمار کا شمار بیشک اُن کی شان کے منافی ہے۔ یہ خان آرزو کی ذاتی آرزو ہے جس نے چند متروک لفظوں کے ساتھ شعر کی صورت میں ظہور کیا ہے۔ دیکھئے ارباب یورپ کی جستجو نے پہلوی زبان کی متعدد کتابیں بہم پہنچائیں۔ جو علوم و فنون کہ ایران میں تھے اُن کا نہ صرف سُراغ ہی ملا بلکہ حکما و ارباب فن کے اقوال و اسمار تک معلومات کی رسائی ہوئی۔ لیکن نظم کے متعلق نہ تو ایک شعر مل سکا نہ کسی شاعر کا نام ہی معلوم ہو سکا۔ کیا زبان قدیم اور علوم و فنون تو اپنا نشان دینے کے لئے زندہ رہ گئے مگر فنِ ادب و انشار کا بہترین سرمایہ لٹریچر کا نادر الوجود گنجینہ (یعنی نظم)، خود قوم کے کنج خانۂ دماغ اور اہل وطن کے حافظوں سے اس طرح محو و سہو ہو گیا کہ ایک دھندلا سا نشان بھی پایا نہیں جاتا۔ پس جس طرح ایران عربوں سے مفتوح ہونے کا انکار نہیں کر سکتا اُسی طرح اُن کے اس احسان کو بھی مٹا نہیں سکتا کہ دینِ صحیح کی تلقین کے بعد شاعری بھی فاتح و جواد عرب کا ہی عطیہ ہے۔

دوسری بدیہی دلیل یہ ہے کہ شاعری زبان کو بہت جلد تراش خراش کر گھٹا بڑھا کر مہذب و نازک بنادیتی ہے ایران پر چار خاندانوں نے مسلسل صدیوں تک حکومت کی میدانِ کارزار کی جو گرماگرمی رہی وہ شاہنامہ سے ظاہر ہے۔ شاہنامہ جہاں اُن کے طرزِ جنگ و فنِ سپاہگری کو بتاتا ہے وہاں وہ ایران کا دائرۃ المعارف یعنی انسائکلوپیڈیا کہے جانے کا بھی مستحق ہے۔ اہل ایران کی معاشرت باہمی تعلقات ماکل و مشارب لباس و پوشاک ان سب کا جہاں اُس سے سراغ ملتا ہے وہاں شاعری کا نام ونشان بھی پایا نہیں جاتا۔ جس عہد کی داستانیں ہیں اُس وقت کے کسی شاعر کا ذکر بلکہ اسم تک نہیں پایا جاتا۔ پھر خود شاہنامہ کی زبان ایسی ہے جس میں بہت کچھ سختی و سنگینی ہے جس کو فردوسی سے بعد آنے والوں نے بنا سنوار کر اُس درجہ تک پُہنچایا جہاں پُہنچ کر وہ مسندِ کمال پر مستقر ہوگئی اور یہ ساری ترقی چوتھی صدی سے شروع ہوکر پانچویں صدی پر ختم ہوجاتی ہے۔

دورِ اوّل کے شعرا کے کلام کو پڑھئے بندش ڈھیلی الفاظ پھس پھسے۔ بے ضرورت حروف کا بڑھنا گھٹنا بے قاعدہ متحرک کو ساکن ساکن کو متحرک بنادینا نہایت بے موقع لفظ فارسی کو مشدد کردینا آپ جا بجا پائیں گے۔ اُس پر الفاظ کا ثقل اور بھی غضب ڈھاتا ہے۔ اضافتِ تشبیہی کا نام نہیں استعارہ خال خال جس میں کوئی ندرت نہیں اگر وزن کو توڑ دیجئے تو ڈھیلی عبارت نثر کی ہوجائے۔ شعر میں وہ چستی نہیں کہ الفاظ تھوڑے اور معنی وسیع کو محیط۔ یعنی ایک شعر کا مضمون اگر نثر میں لایا جائے تو دو سطریں ہوں یہ سب اس امر کے بین ثبوت ہیں کہ ابھی شاعری کی مشقِ اوّل ہے زبان ترقی پاکر شاعری تک آگئی لیکن شاعری

اپنے عہد طفولیت میں ہے۔ اس سے بھی بڑھکر یہ ثبوت ہے کہ اس وقت جو کلام دور اوّل کے شعرا کا پایا جاتا ہے اُس میں اگر کوئی شعر اپنے معنی کی وجہ سے بلیغ ہے تو وہ بعینہٖ ترجمہ کسی عربی شعر کا ہے اس کثرت سے عربی اشعار کا ترجمہ قدیم شعرائے ایران کے کلام میں پایا جاتا ہے جس سے بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ ابتدائی مشق اس طرح شعر کی گئی ہے کہ عربی اشعار کو فارسی میں ترجمہ کیا ہے۔ پھر اُسے نظم میں لے آئے ہیں اگر شاعری ایران میں قبل از اسلام موجود ہوتی تو ناممکن تھا کہ جہاں عرب کے کلام کو منظوم کیا تھا وہاں اپنے شعرائے سلف کے کلام کو بھی موجودہ زبان کا لباس نہ پہناتے۔ دیکھئے کعب ابن زہیر جو عرب کے مشہور شعرا میں سے ہیں سبعہ معلقہ کے سات قصیدوں میں سے ایک ان کا قصیدہ بھی ہے وہ ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

مَا أَرَانَا نَقُولُ إِلَّا مُعَاراً　　أَوْ مُعَاداً مِنْ قَوْلِنَا مَكْرُوراً

یعنی ہم جو کہتے ہیں وہ اگلوں سے مستعار لیا ہوا خیال ہوتا ہے یا اپنے ہی ایک بار کے کہے ہوئے کو پھر دوہرا دیتے ہیں۔ جیسا کہ شراب کی مدح میں اعشیٰ کا ایک شعر ہے ؎

وَكَأْسٍ شَرِبْتُ عَلَىٰ لَذَّةٍ　　وَأُخْرَىٰ تَدَاوَيْتُ مِنْهَا بِهَا

یعنی پہلا ساغر تو میں نے لذت و سرور کے لئے پیا، لیکن دوسرے جام سے اُس درد کی دوا کی جو پہلے پیالے سے پیدا ہوگیا تھا۔ اسی مضمون کو بغداد کا مشہور شاعر ابو نواس عجب مستانہ طرز سے ادا کرتا ہے ؎

دَعْ عَنْكَ لَوْمِي فَإِنَّ اللَّوْمَ إِغْرَاءُ　　وَدَاوِنِي بِالَّتِي كَانَتْ هِيَ الدَّاءُ

یعنی ملامت کرنا چھوڑ اس لئے کہ ملامت شراب نوشی پر تو اور بھی برانگیختہ کرتی ہی۔ ہاں جو مرض ہی اُسی سے دوا کر (یعنی شراب لا) ، یہی ابو نواس کا دوسرا شعر وہ ہی جو اُس نے فضل بن ربیع کی شان میں کہا تھا جس میں بلا کا اچھوتا تخیل ہی ؎

لَیْسَ عَلَی اللّٰہِ بِمُسْتَنْکَرٍ　　اَنْ یَّجْمَعَ الْعَالَمَ فِیْ وَاحِدٍ

یعنی قدرت خداوندی کے نزدیک یہ کیا محال ہی کہ وہ ایک شخص واحد میں ایک عالم کو جمع کردے۔ بغداد کی گلی گلی میں اس شعر کا چرچا پھیل گیا۔ لوگوں نے ابو نواس سے پوچھا کہ یہ نادر خیال تمھاری قوتِ متخیلہ نے کیوں کر پیدا کیا۔ اُس نے کہا کہ جریر کے ایک شعر سے یہ مضمون ماخوذ ہی۔ اُس نے قبیلہ بنو تمیم کے مدح میں جو قصیدہ کہا ہی اُس کا ایک شعر یہ ہی ؎

اِذَا غَضِبَتْ عَلَیْکَ بَنُوْ تَمِیْمٍ　　حَسِبْتَ النَّاسَ کُلَّھُمْ غِضَابًا

یعنی جب تم سے بنو تمیم غصہ ہو جائیں تو سمجھ لو کہ تمام بنی آدم تم سے غصہ ہو گئے۔ اب اسی مضمون کو عنصری کہتا ہی ؎

کس از خدائے ندارد عجب اگر دارد　　ہمہ جہان را اندر یکے تنِ تنہا

کیا یہ ابو نواس کے شعر کا ترجمہ نہیں کیا اس کی بندش ڈھیلی نہیں۔ پورے شعر میں ابو نواس کے جس قدر الفاظ ہیں اُس قدر یہاں ایک مصرع میں موجود ہیں پس اگر ایران میں شاعری پہلے سے ہوتی تو جس طرح ابو نواس نے جریر یا اعشیٰ کے شعر سے ایک مطلب لیکر اپنی چست بندش سے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اُسی طرح اہلِ ایران بھی اپنے اسلاف کے کلام کو بلند کر دکھاتے۔ لیکن جب کہ اسلاف کا خزانہ اس گنج سے خالی ہو تو یقیناً دوسروں

کی طرف دستِ تمنا دراز کرنا ہوگا۔ اسی بنا پر انوری نے اپنے محسن و معطی کی سپاس گزاری اور اُن کی تقلید و تلمذ کا نہایت فراخ حوصلگی سے اقرار کیا ہو وہ کہتا ہو ؎

شاعری دانی کدامی قوم کردند آنکہ بود　　اوّلِ شاں امرأ القیس آخرِ شان بو نواس

اب صرف اس امر کو مقام دلیل میں لانا کہ اصنافِ سخن کے لیے اصطلاحیں خالص فارسی لغات میں موجود ہیں یہ اسلام کی بے تعصبی و نصفت پسندی سے چشم پوشی کا نتیجہ ہو۔ اسلام نے کبھی کسی کے مذہب یا زبان سے تعرض نہیں کیا۔ یہ ایک ایسا بدیہی مسئلہ ہو جو براہین و دلائل کا محتاج نہیں ع

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

لیکن اب اس کو کیا کیا جائے کہ خود ہی باطل صدق وحق میں آہستہ آہستہ جذب ہوتا گیا۔ اور اس طرح ایرانی مذہب نیست و نابود ہو کر تقریباً ایرانی مسلم کا مرادف ہو گیا۔ اسی طرح عربی زبان (جو بولتی زبان ہو) اپنی گویائی و نطق سے بے معنی صداؤں کو خاموش کرتی گئی۔ اُس وقت کہ اسلام کا مبارک قدم ایران میں آیا ہو اُن کی اپنی زبان پوری قوت کے ساتھ زندہ تھی۔

فارسی میں اصطلاحات شعریہ | اسلام کی بے تعصبی اور زبان کی زندگی دونوں نے مل کر اہل ایران سے اصطلاحات وضع کرائیں۔ فاروقِ اعظم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد میں ایران فتح ہوا۔ اُس وقت سے لیکر ابتدائے عہد حجاج تک دفتر کی زبان فارسی رہی۔ دفاتر جب خلیفہ کے سامنے معائنہ کے لئے پیش ہوتے تو اُن کا ترجمہ عربی میں ہو کر ملاحظہ کے لئے آتا۔

خدا کی بے شمار رحمت اُن نفوسِ قدسیہ پر جنہوں نے براہ راست بارگاہ نبوت سے تزکیہ و تصفیہ حاصل کیا تھا جس کی بدولت ان میں اس قدر بے تعصبی و شفقت علی الخلق پیدا ہوگئی تھی۔ اُن کے حوصلے کی بلندی و دماغ کے وسعت نے کبھی اس طرح کی تنگ خیالی کا وہم بھی ہونے نہ دیا۔ یہ تو صرف عربی زبان کے ذاتی محاسن و کمال کا نتیجہ تھا جو فارسی زبان نے غریب الوطن بدیسی عربی مہمان کو اس فراخ دلی سے اپنے ہم وطن جیسا بنا لیا۔ حکومت عربوں کی تھی عمال و گورنر عرب ہی ہوتے تھے۔ رعایا کو آئے دن جو ضرورتیں پیش آتی تھیں اُن کے انصرام کے لئے نیز حکام کے ساتھ تعلقات و روابط کو صحیح طور پر مستحکم بنانے کے لئے عربی سیکھنے کی اُنھیں ضرورت پیش آئی۔ جب عربی کی تعلیم شروع ہوئی اور اس زبان سے اہل ایران مانوس ہوئے تو اُس کے ہر لفظ میں جو فلسفہ تھا اُس کی خوبی نے انھیں اپنا والہ شیدا بنا لیا۔ اب جو دیکھا تو عربوں کے پاس اظہار جذبات کا فوٹو بھی تھا جسے وہ شاعری کہتے تھے۔ فارسیوں نے زبان عربی کے ساتھ اس نقاشی اور فوٹو گرافی کو بھی سیکھنا شروع کر دیا۔ اہل ایران کے لئے شاعری ایک عجیب و غریب شے تھی جس کی لذت سے قبل میں وہ قطعاً آشنا نہ تھے۔ پس ملک کے ہر فرد کو اس کی حقیقت سمجھانے کے لئے تعلیم یافتہ اشخاص نے اُسی وقت فارسی زبان میں ہر صنفِ سخن کے لئے ایک علیحدہ اسم قرار دیا اور اس طرح اصطلاحاتِ شعریہ کا وجود عالمِ لغت میں آگیا۔ نظم کا نام "چامہ" نثر کا "چکامہ" غزل کا "پیوستہ" قصیدہ کا "پرگندہ" وزن شعر کا "پساوند" اسم و رسم قرار پایا۔ لیکن عربی زبان کا ایک ایک لفظ جو فلسفہ و حکمت سے لبریز تھا اور جس میں اپنی وسعت و حلاوت کے سبب یہ کمال تھا

کہ ہر طرح کے خیالات بلا تخصیص بہت سہولت سے پوری طرح ادا ہو جاتے تھے۔ اُس نے اپنی حلاوت و شیرینی سے بہت سے مواقع پر فارسی کے لب بند کر دیے اور بہت سے الفاظ فارسیہ اُس کے وسیع دامن میں گم ہو گئے۔ جب میزبان و مہمان باہم شیر و شکر ہو کر مل گئے تب روزمرہ کی گفتگو میں بھی چاشنی الفاظ عربی کی ہوئی۔ وہ کلام بے نمک ہوتا، وہ تقریر بے مزہ ہوتی جس میں عرب و عجم کی آمیزش نہ ہوتی۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب اپنی زبان کے الفاظ ایک معتد بہ مقدار میں اُن سے متروک ہو گئے اور اُن کی جگہ صرف عربی الفاظ رہ گئے۔ اب نہ نظم کا نام چامہ رہا نہ نثر کا چکامہ۔ ہاں ان مصطلحات کا وجود صرف لغات میں مثل دیگر متروک الفاظ کے رہ گیا۔ اب باوجود ان قرائنِ واضحہ کے پھر بھی یہ دعویٰ اور اس پر غلو کہ ایران میں شاعری پہلے سے تھی یہ تو محض خوش اعتقادی و وہم پرستی اور دورِ آخر کے تعصب کا نتیجہ ہے جس کے سامنے تمام دلائل بے سود ہیں۔

آب و ہوا کا اثر شاعری پر

ہاں یہ ضرور ہے کہ ایران میں جب شاعری آئی تو اس نے یہاں پہنچکر نئی نئی حسین شکلیں پیدا کر لیں اور ملک کی آب و ہوا نے اپنی شادابی و تازگی سے بہت جلد فارسی شاعری کو ایک عروسِ دل آرا بنا دیا۔ لیکن پھر بھی بعض خصوصیاتِ عرب ایران میں نہ آسکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شاعری پر ملک کی آب و ہوا کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے جو چیزیں کہ نگاہوں کے سامنے ہوتی ہیں اور خصوصیات ملکی جس طرح کے جذبات و کیفیات قلوب میں پیدا کیا کرتی ہیں اُسی کو شاعری کا مایۂ خمیر سمجھنا چاہیے۔ اِس لئے ہر ملک کا باشندہ اپنے پسند کا معیار جداگانہ رکھتا ہے۔ ایک ہندی عاشق زلفِ معشوق کی

تشبیہ و توصیف میں بھونرے اُڑاتا ہی، برسات کی رات اور کالی گھٹا کو اُس کا عکس بتاتا ہی۔ عرب رنغال یعنی کوئلہ کو شرمندہ کرتا ہی۔ جی چاہتا ہی تو عنبر و مُشک سے بھی دماغ معطر کرلیتا ہی۔ ایرانی سنبل سُنگھاتا ہی۔ اہل یورپ سونے کو مقابل میں لاتے ہیں۔ یہ اپنے اپنے ملک کی خصوصیتیں ہیں قاعدہ ہی کہ جس چیز سے انسان کو راحت ملتی یا فرحت و انبساط حاصل ہوتا ہی تو اُس چیز کے ساتھ ایک گونہ دل کا لگاؤ ہوجاتا ہی۔ پھر جب کہ وہ چیزیں اپنے ہی ملک کی ہوں تو پھر دلی میلان کا کیا پوچھنا۔ دیکھئے عرب کا ملک ریگستان اور کوہستان ہی۔ پتھریلی خاکی، ہموار ناہموار نشیب و فراز متعدد اقسام کی زمین اُس میں تھی۔ پھول اور پھل کے درخت کا وہاں نام تک نہ تھا۔ جو درخت پائے جاتے تھے وہ روکھے سوکھے اور اکثر خاردار تھے۔ زراعت کے لئے نہ زمین قابل تھی، نہ پانی میسر تھا۔ عربوں کا اسی ملک میں رات دن رہنا سہنا اور خانہ بدوش پھرنا کام تھا۔ قدرت نے ان کے زندہ رہنے کے لئے دو چیزیں دے دی تھیں حیوانوں میں اونٹ اور نبات میں کھجور۔ انھیں دو چیزوں سے عربوں نے ہر طرح کے سامان عیش و حیات اپنے لئے پیدا کرلئے تھے۔ دشوار گزار کوہستانی و ریگستانی منازل کو اس عجیب الخلقت جانور کی مدد سے طے کرتے تھے اس کی اُون سے کپڑے بناتے اس کی کھالوں کا خیمہ بنتا اس کے دودھ سے پورا کنبہ پرورش پاتا۔ ذبح کرکے اس کے گوشت سے پورے قبیلہ کی دعوت کرتے اور داد سخاوت لیتے۔ یہی حال کھجور کا تھا۔ اُس کو کھاتے اُس کے شیرے سے ہر طرح کی شیرینی بناتے اُس کی شاخوں سے مکان چھاتے اُس کو کاٹ کر ستون بناتے

غرض یہ اونٹ اور کھجور چونکہ عربوں کی ہر طرح کی راحت کا سامان تھے اور ان کا کوئی جز
اُن کے لئے بے کار نہ تھا اس لئے اُن کے کلام میں ان دونوں کے لئے بکثرت لغات
وضع ہوئے۔ استعارے اور تشبیہ میں ان دونوں سے کام لیا گیا۔ ان دونوں کی مدح میں طرح طرح
کے راگ گائے گئے۔ یہ سب اس لئے کہ ان دونوں نے عربوں کو بہت ہی آرام پہنچایا تھا۔ اور
خود اُنکے ملک کی چیزیں تھیں پھر کیا وجہ جو عربوں کو محبوب نہ ہوتیں۔ عرب کی آب و ہوا جس طرح
کے جذبات دلوں میں پیدا کرتی ہے وہی شعراے عرب کے گلزارِ کلام کا شگفتہ چمن ہے
اب اگر کسی ملک کا باغ اس تختۂ چمن سے محروم ہو تو یہ کون سے تعجب کا مقام ہے۔

اقوام و امم کا مورخ جب عرب کی وادیوں میں قدم رکھتا ہے تو اُسے عربی قوم کے
خون کا نظام تمام اقوام عالم سے جدا اور عزت و شرافت انسانی سے مالا مال دکھائی دیتا ہے۔
آزاد عرب حریت کے والہ و شیدا شجاعت و سخاوت کے دلدادہ جفاکشی و محنت کے عادی
غیرت و حمیت کے فدائی کاہلی و بزدلی سے نفور بخل و دناءت سے بمراحل دور۔ غرض یہ کہ محکومیت کے
شکنجے سے مامون رہ کر آزاد زندگی بسر کرنے والے اور فضاے حرّیت میں جذباتِ فطری کو
نشو و نما دینے کے عادی تھے۔ ہمت کی وہ پستی اور حوصلے کی وہ تنگی جو مسلسل محکومیت سے
قوم میں پیدا ہو جاتی ہے اُس سے قطعاً آشنا نہ تھے۔

اس لئے ایام جاہلیت کے قصائد دوسروں کی تعریف میں بہت کم ہیں اور جو کچھ ہیں وہ
ممدوح کے واقعی اوصاف کے مظاہر ہیں۔ حرص و آز عرب کی قوّتِ بیانیہ کو جنبش دے نہیں سکتے
تھے۔ جیسا کہ بنو تمیم نے جب کہ ایک شاعر جاہلیت سلامہ بن جندل کے سامنے یہ درخواست

پیش کی کہ مَجِّدْنَا بِشِعْرِكَ یعنی اپنے اشعار مدحیہ سے مجھے عزت بخش تو اُس نے نہایت صفائی سے یہ جواب دیا کہ اِفْعَلُوْا حَتّٰی اَقُوْلَ یعنی کچھ کر دکھاؤ تو ہم بھی کچھ کہیں۔

عربی شاعری کی بنیاد کمالات ذاتی پر ہے

عرب کی شاعری ہمیشہ اس عیب سے پاک و صاف رہی کہ اُس کی فصاحت و بلاغت اور اُس کا جوشِ بیان سلاطین و امرا کے خوف و طمع سے مرعوب و مرہون نہ رہا۔ عربوں میں شاعری کی ابتدا رجز خوانی سے ہوئی اور یہ صنفِ کلام کمالاتِ ذاتی چاہتی ہے، نہ تنایلے ملوک و اہلِ دول۔ اس لئے شعراے عرب کے قصائد اُن کے محاسن و فضائل کے روشن آئینے ہیں جن میں جوہر ذاتی کے تمام خط و خال جھلک رہے ہیں اور اُن پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

نے گلم نے بلبلم نے شمع نے پروانہ ام
عاشقِ حسنِ خودم بر حسنِ خود دیوانہ ام

عربی شاعری اسی پیمانے پر اُس وقت تک رہی جب تک عرب کا تمدن ایران کی دل فریب معاشرت سے ہم آغوش نہ ہوا۔ دیکھئے عرب جب بے یار و مددگار رہ جاتا ہے اور حوادثِ دہر اُس سے خویش و اقارب احباب و اعزہ کو چھین لیتے ہیں تو وہ اپنی اُس بیکسی و تنہائی کو بھی اپنی اُسی شجاعت و خودداری عزم و استقلال کے لہجے میں بیان کرتا ہے ؎

ذَهَبَ الَّذِيْنَ اُحِبُّهُمْ
وَبَقِيْتُ مِثْلَ السَّيْفِ فَرْدًا

(جن لوگوں کو میں دوست رکھتا تھا۔ وہ سب کے سب چل بسے اور میں مثل تلوار کے تنہا رہ گیا)

اسی طرح مصیبت کے وقت دوسروں کا دست نگر ہونا یا مضطرب و بے قرار ہو کر اپنے پاے استقامت کو متزلزل کرنا عرب کی غیور طبیعت گوارا کر نہیں سکتی وہ شرافتِ نفس کو بدرجۂ غایت عزیز

رکھتا ہی اور حرّیت جیسے گراں مایہ جوہر کو سنگِ مصائب و اضطرار سے چکنا چور ہونے نہیں دیتا وہ کہتا ہی ؎

فَلَوْ كَانَ يُغْنِي اَنْ يُّرَى الْمَرْءُ جَازِعًا ۔ بِحَادِثَةٍ اَوْ كَانَ يُغْنِي التَّذَلُّلُ

لَكَانَ التَّعَزِّيْ عِنْدَ كُلِّ مُصِيْبَةٍ ۔ وَنَائِبَةٍ بِالْحُرِّ اَوْلٰى وَاَجْمَلُ

[اگر نزول حادثہ کے وقت مرد کا مضطر ہونا یا لوگوں کے روبرو ذلیل ہونا مفید معلوم ہو۔ تب بھی آزاد مرد کے لئے مصیبت میں صبر ہی زیبا تر و لائق تر ہی]

جنگ کی گرما گرمی میں جب کہ تلوار اور نیزوں کی چمک تیروں کی بارش لڑنے والوں کو فرار کی راہ بتا رہی ہو اُس وقت عرب کا شاعر یوں کہتا ہی ؎

فَلَسْنَا عَلَى الْاَعْقَابِ تُدْمٰى كُلُوْمُنَا ۔ وَلٰكِنْ عَلٰى اَقْدَامِنَا تَقْطُرُ الدِّمَاءُ

(یعنی ہم وہ نہیں ہیں جن کی ایڑیوں پر خون بہے۔ بلکہ ہمارے خون کے قطرے بہہ کر قدم پر گرتے ہیں)

عرب جس طرح کہ تذلیل نفس اور جُبن و بزدلی کو اپنی شان کے خلاف جانتا ہی اُسی طرح بخل و مال اندوزی اُس کے علو ہمتی و شرافت عربی کے خلاف ہی۔ اُس کو مالکِ گنج و خزانہ کہنا اُس کی سخت توہین کرنی اور کھلی گالی دینی ہی ؎

اَعَيَّرْتَنَا اَلْبَانَهَا وَلُحُوْمَهَا ۔ وَذَالِكَ عَارٌ يَا ابْنَ رَيْطَةَ ظَاهِرٌ

[ہم پر اونٹوں اور اُن کے دودھ و گوشت کے بکثرت ہونے کا تو نے عیب لگایا ہی۔ اے ابن ریطہ اُس کا مصرف جب ہم بیان کرینگے تو تیرا یہ الزام جاتا رہے گا]

نُحَابِيْ بِهَا اَكْفَائَنَا وَنُهِيْنُهَا ۔ وَنَشْرَبُ فِيْ اَثْمَانِهَا وَنُقَامِرُ

[اونٹوں کو ذبح کر کے اعزّہ و اقارب فقرا و مساکین کو کھلاتے ہیں اور ان کی قیمتوں سے ہم شراب پیتے ہیں اور جوا کھیلتے ہیں]

ایک دوسرا شاعر اپنے اور اپنے قبیلہ کی نفرت و بریت بخل سے یوں بیان کرتا ہے

وَاللّٰومُ دَاءٌ لِوَبْرٍ يُقْتَلُوْنَ بِهٖ وَلَا يُقْتَلُوْنَ بِدَاءِ غَيْرِهٖ اَبَدًا

[یعنی بنی وبر کے لئے بخل ہی ایک قاتل مرض ہے۔ اور بجز اس درد کے کسی اور مرض سے کبھی نہیں مرتے]

ایک تیسرا شاعر اپنے عزم بالجزم کا اظہار کرتے ہوئے اس طرح قسم کھاتا ہے

بَقِيْتُ وَفْرِيْ وَانْحَرَفْتُ عَنِ الْعُلٰى وَلَقِيْتُ اَضْيَافِيْ بِوَجْهٍ عَبُوْسٍ

[میں بہت مال چھوڑ کر مروں اور بلندی مراتب کی طلب سے انحراف کروں اور اپنے مہمانوں کا استقبال ناگواری و ترش روئی سے کروں]

اسی طرح وہ شرافتِ نسب کو اپنے اخلاق و شریفانہ جذبات سخاوت و شجاعت کا محافظ جانتے تھے نسب کی بربادی کو اپنے لئے اپنے قبیلہ و خاندان کے لئے ایک مصیبتِ عظمیٰ جانتے اگر کہیں سلسلۂ نسب میں کچھ بھی نقص نکل آتا تو ساری عزت کا خاتمہ ہو جاتا۔ اخلاق و سیرت میں نسب کا دخل و اثر وہ یہاں تک تسلیم کرتے تھے کہ گھوڑے اور اونٹ کا نسب نامہ بھی ان کے پاس ہوتا۔ اور حیوانوں میں بھی شریف و اعلیٰ نسب کو خراب و تباہ نہ ہونے دیتے۔ عرب کہتا ہے

لَعَمْرُكَ مَا اَخْزٰى اِذَا مَا نَسَبْتَنِيْ اِذَا لَمْ تَقُلْ بُطْلًا عَلَيَّ وَمَيْنًا

(تیری جان کی قسم میں رسوا نہ ہونگا جب کہ تو میرا نسب صحیح صحیح ٹھیک بلا دروغ و افترا بیان کرے گا)

مضامین کے اعتبار سے یہ وہ خصوصیات ہیں جن کو ایرانی شاعر اپنے آپ میں پا نہیں سکتا صدیوں تک پیہم جو اُن پر زبردست حکومت رہی اُس نے اُن کے اُن جذبات کو فنا کر دیا جو عرب میں بدرجۂ کمال موجود تھے اور جس کا تلاطم اُن کے سینوں میں جب موجیں مارتا تو ایسے اشعار بے ساختہ اُن کے مُنہ سے نکلتے اور طرفہ یہ کہ اُن کے افعال اُن کے اقوال سے بھی بڑھکر آزاد و غیور رہتے۔

آب و ہوا کا ایک اور اثر | ملکی آب و ہوا کا ایک یہ بھی اثر تھا جو عرب اپنے اسلوب بیان کا انداز خاص رکھتا ہے۔ عموماً جب قصیدہ شروع کرتا ہے تو سامع کی دلچسپی اور اپنے مقصد کی دل آویزی کے لئے پہلے دیار یار کا ذکر کرتا ہے۔ وہاں کے کھنڈروں اور آثار کو اپنی شاعرانہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ خود روتا ہے دوسروں کو رولاتا ہے۔ شکستہ در و دیوار کو کبھی خطاب کرتا ہے اور کبھی اُن پتھروں کو دیکھکر جن سے چولھے کا کام لیا جاتا تھا ایک نالۂ جگر دوز کرتا ہے۔ وہاں کی ہودج نشین مستورات کا تذکرہ تصویر درد و غم ہو کر کرتا ہے۔ مصیبت کی داستان جب کہ ایسے دل گداز پیرایہ میں بیان کی جائے تو سامع کی ہمدردی قائل کے ساتھ ہو ہی جاتی ہے۔ اب وہ یہاں سے مضامین عشقیہ کی طرف رجوع کرتا ہے جسے اصطلاح شعرا میں نسیب کہتے ہیں۔ اِس میں اپنے عشق کے ولولے اور محبت کے جوش کو ظاہر کرتا ہے۔ فراق کے درد سے آہ سرد بھرتا ہے۔ یہ عشق و حُسن کی داستان اُن غم خوار سامعین کو اور بھی متوجہ و مائل بنا دیتی ہے۔ وہ کونسا دل ہے جو حُسن کا خواہاں نہیں اور کس کا قلب ہے جس میں عشق کی چاشنی نہیں۔ اِس قدر کلام کا حصہ جب سامع کو ہمہ تن گوش بنا دیتا ہے تو وہ

اپنے شعر میں سفر کرتا ہی۔ راتوں کی بیداری، تمازت آفتاب کی گرمی، لو کی لپیٹ تند و تیز ہواؤں کے ہوش رُبا جھونکے، راستے کی ناہمواری، اونٹ کی مضبوطی و تیز روی اُس کی بعد مسافت و شدائد سفر سے اُس کی لاغری۔ غرض ایسی ایسی باتیں کہتا ہی جن سے اُس کی جفاکشی استقلال ہمت و مردانگی ظاہر ہوتی ہی۔ اب وہ اپنے قصیدے میں گریز کرتا ہی اور کہتا ہی جو کچھ کہنا چاہتا ہی۔ چاہے میدانِ جنگ کے اپنے شجاعانہ حملوں کا بیان کرے یا اپنی شرافتِ نسب و حریت کا خطبۂ بلیغ پڑھے یا اپنے ممدوح کو اپنے کلام سے عزت بخشے

عربی قصائد کے چند اور لوازم

عربی قصائد میں علاوہ ان باتوں اور اپنے ذاتی فخر و مباہات کے (جس کے وہ ہر طرح مستحق ہیں)، چند اور چیزیں ہیں ایک تو اُن کا وہی محبوب جانور اونٹ جس کا بیان ہزاروں طرح سے عرب کرتا ہی اور پھر بھی اُس کی طبیعت سیر نہیں ہوتی دوسرے پہاڑ اور ریگستان اور ان مقامات کے لوازم یہ وہ چیزیں ہیں جن کو وہ خوب کہتے ہیں۔ چوں کہ یہ سب چیزیں عرب کے پیشِ نظر ہیں اور ان کا ملک ان چیزوں کے سوا اور کچھ اُن کے سامنے پیش نہیں کرتا اس لئے کلام بھی اور چیزوں کے ذکر سے مستغنی ہی۔

مناظر قدرت

ہاں کبھی کبھی بارش اور موسلا دھار پانی کی روانی بھی اُن کے کلام میں پائی جاتی ہی۔ اگرچہ وہاں بھی اُونٹ اپنی ہیولانی صورت کے ساتھ پانی کا بند بنا ہوا معلوم ہوتا ہی۔ چنانچہ عرب کا مشہور شاعر ابن مطیر جب کہ والی مدینہ کے پاس پہنچا تو اُس روز وہاں پانی خوب برسا تھا۔ والی نے فرمائش کی کہ آج کی بارش کے متعلق کچھ کہو۔ ابن مطیر نے کہا کہ پہلے منظر اور سماں دیکھ لوں پھر کچھ کہہ سکتا ہوں۔ چنانچہ ایک بلند مقام

پھر چڑھا [illegible] طرف نگاہ ڈال کر کیفیت ملاحظہ کی۔ پھر جو والی کے پاس آیا تو ایک قصیدہ تیار تھا [illegible] بادل کی تشبیہ اونٹ سے دی گئی اور پورے قصیدے میں اسی کا تلازمہ رہا اسی ذیل میں جو اشعار کہ گھنگھور گھٹا اور موسلا دھار پانی اور بجلی کے چمک میں کہہ گیا ہے وہ عجب بلاغت کا نمونہ ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

مُسْتَضْحِكٌ بِلَوَامِعٍ مُسْتَعْبِرٌ   بِمَدَامِعٍ لَمْ تَمْرِهَا الْاَقْذَاءُ

فَلَهُ بِلَا حُزْنٍ وَلَا بِمَسَرَّةٍ   ضَحِكٌ يُؤَلِّفُ بَيْنَهُ وَبُكَاءُ

(بادل بجلیوں کی چمک کے ساتھ ہنستا ہے اور لگاتار بارش سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا خس و خاشاک میل کچیل سے صاف و شفاف آنکھیں ہیں جو آنسوؤں سے رو رہی ہیں بلا خوشی کے ہنستا ہے اور بلا غم کے روتا ہے اس کی ہنسی رونے سے ملی ہوئی ہے)

ذَابَ السَّحَابُ فَهُوَ بَحْرٌ كُلُّهُ   وَعَلَى الْبُحُورِ مِنَ السَّحَابِ سَمَاءُ

(سارے بادل پگھل کر دریا کے دریا ہو گئے اور دریا پر بادل کا آسمان چھا گیا)

سُحْمٌ فَهُنَّ إِذَا كَظَمْنَ فَوَاحِمٌ   سُودٌ وَهُنَّ إِذَا ضَحِكْنَ وِضَاءُ

(وہ بادل بہت ہی سیاہ ہیں مگر جب پانی بھر لیتے ہیں تو اس وقت کوئلہ ہو جاتے ہیں سیاہ ہیں مگر جب ہنس دیتے ہیں تو روشن ہو جاتے ہیں)

لَوْ كَانَ مِنْ لُجَجِ السَّوَاحِلِ مَاؤُهُ   لَمْ يَبْقَ مِنْ لُجَجِ السَّوَاحِلِ مَاءُ

(اگر سواحل کے عمق سے ان دریاؤں میں پانی آیا ہوتا تو سواحل خشک ہو جاتے اور ایک قطرہ بھی پانی کا ان میں باقی نہ رہتا)

وہ اشعار جن میں بارش و باران ابر و سحاب کی تشبیہ اونٹنی اور اُس کے شیر و حمل وغیرہ سے دی گئی ہے، اُن کو پیش کرنا فضول سمجھا۔ ہند کی سرزمین میں اُس کا بیان کیا لطف پیدا کر سکتا ہے۔ یہاں مقصود صرف اسی قدر ہے کہ شاعر جن چیزوں کو دیکھتا ہے اور جو اس جس طرح کے جذبات پیدا کرتے ہیں شاعر اُنھیں کو الفاظ کے قالب میں ڈھال دیتا ہے عربوں کے کلام میں قصائد ہیں اور مراثی ہیں اور یہ دونوں صنفیں نظم کی بدرجۂ کمال پائی جاتی ہیں۔ اور ان دونوں سے مقصود اپنے خصائص و فضائل کو زندہ رکھنا اور آیندہ نسلوں کو رغبت دلانا تھا۔ غزل اُن کے کلام میں اپنی مستقل حیثیت نہیں رکھتی ہے۔ چاہیے تو تشبیب کو غزل کہہ لیجیے۔ اسی طرح مثنوی کے صنف سے بھی اُن کا کلام خالی ہے۔ حالانکہ اس کا مواد جس اکثار و فراوانی کے ساتھ عربوں کے پاس تھا اُس کا اقتضا یہ تھا کہ ایک عظیم الشان کتب خانہ آج ایام جاہلیت کی مثنویوں سے مزین و آراستہ ہوتا بہت سی باتیں عربی شاعری میں اسی وجہ سے نہ آسکیں کہ اُن کا بیان صنفِ مثنوی کا خواہاں تھا ؎

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم چناں کہ حرفِ عصا گفت موسیٰ اندر طُو

فارسی شاعری کی تاریخ اور تدریجی ترقی

اب فارسی شاعری کی تاریخ اور اُس کی تدریجی ترقی اور اُن خصوصیات پر نظر ڈالنے کی حاجت ہے جو اس میں باعتبار مضمون اور انداز بیان کے پائی جاتی ہیں۔ تاکہ اُستاد اور شاگرد کی خصوصیتِ خاصہ اچھی طرح واضح ہو جائے۔

محققینِ السنۂ مشرقیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ فارسی زبان اپنے حسن و دل آویزی یعنی مرتبۂ شاعری تک پہنچنے کے لئے عربوں کی سراپا انتظار تھی۔ عرب اُستادوں نے شعر کی حقیقت اور اس کی

قوت و کیفیت سے اپنے تلامذہ کو آگاہ کیا اور کچھ ایسے خوش آیند لہجے میں دعوت شعر کی نغمہ سرائی
کی کہ ایران کے تمام گوشے لبیک کی صدا سے گونج اُٹھے۔ یہ امر تو مسلّم ہو چکا کہ ایران میں
شاعری کی ابتدا اکتسابی طور سے ہوئی۔ اب غور طلب یہ امر ہے کہ تعلیم یافتہ ایرانیوں نے
پہلے پہل جو شاعری کے لئے زبان کھولی، وہ کلام کس زبان میں تھا۔ اگر امعان نظر سے کام
لیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلی مشق شاعری کی عربی ہی زبان میں کی گئی تاکہ
اُستاد کی اصلاح سے کلام مرصع ہو جائے اور نکاتِ شعریہ کے دقیق مسائل اچھی طرح حل ہو کر
سمجھ میں آ جائیں۔ جب عربی میں شعر کی مشق ہو گئی اور شعر گوئی کا طریقہ اور صحت کی راہ معلوم
ہو گئی تو اپنی ملکی اور مادری زبان کی طرف فوراً متوجہ ہو گئے۔ اس لئے کہ علم ہو یا فن
جب تک اُس پر غیر زبان کا قفل چڑھا ہوا ہے اُس میں کمال بہم پہنچانا اگر محال عقلی نہیں تو
محالِ عادی ضرور ہے۔ اس لئے اہلِ ایران نے اپنی بحور بھی علیحدہ قرار دیں اور انھیں جدید
مقرر کردہ بحروں میں اُنھوں نے شاعری کی داغ بیل ڈال دی۔ لیکن ابتدائی اشعار کی یہ
حالت تھی کہ جس طرح ایک بھولا آدمی سیدھی سیدھی باتیں کرتا جاتا ہے اُسی طرح فارسی
کے وہ اشعار تھے جن میں بہت جلد رنگینی و چستی پیدا ہو گئی۔ اس کو واضح طور پر سمجھنے
کے لئے اس طرح خیال کرنا چاہیئے کہ انسان کو کھانے کے لئے غذا، رہنے کے واسطے
مکان، بدن ڈھانکنے کو ستر، حملۂ اعدا سے محفوظ رہنے کے لئے سپر اور حملہ آوری کے
لئے آلات درکار ہیں۔ اب انسان اپنی ان ضرورتوں کو جن چیزوں سے پورا کرتا ہے
وہ دو قسم کی ہیں؛ ایک تو وہ جو اپنی موجودہ سادی اور خلقی صورت میں انسان کی

خدمت کے لئے زبانِ حال سے لبیک کی صدا بلند کر رہی ہیں جیسے غار و خندق سکونت کے لئے جنگلی برگ و بار غذا کے لئے، درختوں کے لمبے چوڑے پتے ستر پوشی کے لئے، پتھر کے ٹکڑے اور درختوں کی خشک و تر شاخیں اسلحہ بننے کے لئے ہر وقت طیار ہیں اور یہ وہ ادنیٰ مرتبہ انسان کے زندگی بسر کرنے کا ہے جسے خالق نے خود اُس کے لئے مہیا کر دیا ہے دوسری قسم یہ ہے کہ ان کی خلقی حالت پر اکتفا نہ کی جائے بلکہ ان چیزوں سے بہرہ مند ہونے کے لئے اس میں تغیر و تبدل، ترکیب و تحلیل کو عمل میں لائیں اور اس طرح مایحتاج فی الحیات میں ایک نئی شان پیدا کریں۔ جس قدر ناز پروردگی بڑھتی جائیگی اور عیش و تنعم کا سامان بہم پہنچتا جائیگا اور محفوظ رہنے کے وسائل قوی ہوتے جائینگے اُسی قدر تمدن کا پلہ گراں ہوتا جائیگا وہی قوم جو اشیاء کا استعمال ابتدا میں اس طرح کرتی تھی کہ صنعتِ عبد کا اُس میں کوئی حصہ نہ ہوتا تھا انتہا میں اگر اُن کے طریقِ استعمال کو دیکھا جائے تو صنعتِ عبد نے اس کی حقیقت بالکل گم کر دی ہوگی۔ اگر متمدن و غیر متمدن قوم کے ماکل و مشارب، ملابس و مساکن کو دیکھا جائے تو بہت اچھی طرح یہ حقیقت منکشف ہو سکتی ہے۔ بعینہٖ یہی حال ایران کی شاعری کا سمجھنا چاہئے۔

حقیقت یوں ہے کہ پہلے پہل جس زبان میں شاعری کا آغاز ہوتا ہے اُس میں ابتدائی رفتار ہی آہستگی و سادگی سے ہوتی ہے۔ ورنہ نظم کمالِ سخن کی جگہ اہمال و لغویت کا دفتر بے معنی ہو جائے۔ ابتداءً شعرا کلام کو موزوں کرنے کی مشق کرتے ہیں پھر بہ تدریج ترقی کرتے جاتے ہیں، ورنہ اگر آغاز ہی میں بلند پروازی کی جائے تو یہ بجائے ملاء اعلیٰ پر پہنچانے

کے تحت الثریٰ تک لے جانے والی ہو۔

اُردو شاعری کی حالت بطور مثال کے | مثال کے لئے اُردو شاعری کی ابتدا اور پھر مرتبہ کمال تک پہنچنے پر غور کرنا کافی ہے۔ شاعری نے جب ہندوستان کی اُس زبان میں جو اَب یہاں پیدا ہوگئی تھی اپنی جلوہ آرائی کی اُس وقت اُردو میں شعر کہنے والے وہ باکمال حضرات تھے جن کی نگاہوں میں دونوں شاعریاں عرب و عجم کی موجود تھیں۔ لیکن اُردو میں چوں کہ کوئی نمونہ موجود نہ تھا اس لئے سادگی ہی کا جامہ اُس کے لئے مستحسن سمجھا گیا۔

اُردو میں وَلی کا وہی مرتبہ ہے جو رودکی کا فارسی میں ہے۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ ولی نے فارسی و عربی شاعری کا کافی مطالعہ نہیں کیا تھا۔ پھر جو ولی کے کلام میں سادگی ہے اور الفاظ بغیر تراش و خراش کے ادا ہوتے ہیں دور کے استعارات اور تشبیہات بھی نہیں پائی جاتیں وہ بجز اس کے اور کس کا نتیجہ ہے کہ اُردو میں شاعری اپنی طفولیت کا عہد بسر کر رہی ہے گویا بچوں کی طرح گھٹنوں گھٹنوں چل رہی ہے جس طرح کوئی راہ رو اُس راستے کو طے کرے جو قبل سے قدموں کے نیچے نہ آیا ہو یا کوئی اجنبی ایسے مکان میں داخل ہو جس میں پہلے گیا نہ ہو، تو وہ قدم سنبھل سنبھل کر رکھے گا تیز روی و سرعت اس کے لئے بجائے منزل رساں ثابت ہونے کے سنگِ راہ ہو جائیگی۔

اسی وجہ سے ابتدا میں ایران کی شاعری محض موزوں فقرات سے شروع ہو کر بہت جلد اس قابل ہوگئی کہ اُس کو بزم شعرا میں پیش کیا جا سکے۔ فارسی شاعری پر یہ رودکی کا احسان ہے جس کی دایۂ فکر نے اس طفلِ شیرخوار کو اپنی جودتِ طبع اور حدت

ذہن سے پرورش کر کے عالم تمیز تک پہنچایا لیکن ابھی اس کو جوان اور جوانی کے ساتھ سنجیدہ و متین ہونا باقی ہے۔

ساد گی کی تاثیر | طبقۂ اوّل کے وہ شعرا جو دورِ اوّل میں گزرے اُن سب کا کلام ایک ہی انداز رکھتا ہے۔ بندش کی چستی نہیں مضمون کی بلند پروازی نہیں۔ ان کی نظم میں صرف محسوسات اور ان کے اصلی حالات ہیں۔ سادہ الفاظ میں سیدھی باتیں جو آپس میں بولتے ہیں اکثر و بیشتر اُسی کو نظم کر دیتے ہیں۔ استعارہ و تکلفات سے بہت کم کلام کو آراستہ کرتے ہیں۔ مثلاً رودکی جب کہ بڈھا ہو جاتا ہے اور اُس کے دانت ٹوٹ جاتے ہیں، ضعیفی اعضا پر چھا جاتی ہے، اُس وقت جوانی کی یاد میں ایک قصیدہ کہتا ہے۔ عمر کے آخر حصے میں جو کچھ کہتا ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے سیدھی سادی باتیں ہیں جو نہایت سادگی سے وزن و قافیہ کے محاصرہ میں لے آئی گئی ہیں۔ مثال کے لئے تین پہلے شعر اس قصیدے سے حاضر ہیں

مرا بسود فرو ریخت ہر چہ دنداں بود	نبود دنداں ہا بل چراغ تاباں بود
یکے نماند کنوں زاں ہمہ بسود و بریخت	چہ نحس بود ہمانا کہ نحسِ کیواں بود
نہ نحس کیواں بود و نہ روزگارِ دراز	چہ بود منّت بگویم قضائے یزداں بود

وزن و قافیہ کے ساتھ عہد شباب کا مرثیہ ہے اس لئے اسے شعر کہئے۔ مگر جو شعر کی حقیقت ہے اُس کا نام و نشاں تک نہیں۔ اگر آج کوئی اس طرح کا شعر کہے تو ہمارے شعرا اُس کی طرف بھول کر بھی ایک نگاہ غلط انداز نہ ڈالیں۔ مگر چونکہ یہ رودکی کا کلام ہے جس نے شاعری کو بزم شعرا تک آنے کے قابل بنایا ہے، اس لئے یہ اشعار کتابوں میں اربابِ ذوق کی زبانوں

پر جاری و مکتوب ہیں۔ رودکی کے کلام میں سب سے مشہور اور بہترین نمونہ وہ اشعار ہیں جو شاہ بخارا کو ہرات سے مضطربانہ بخارا لے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن اشعار میں لذت ہے اور لطف و ذوق سے بھی خالی نہیں لیکن شبنم سے ایک پیاسے کی کیا تسکین ہو سکتی ہے۔ واقعہ اُن اشعار کا یوں ہے کہ شاہِ بخارا ہرات پہنچتا ہے اُن اطراف کی نزہت فزا آب و ہوا اُس کے دامن گیر ہو جاتی ہے۔ ایک خوش گوار و روح پرور موسم جب گزر جاتا ہے تو دوسرے موسم کا اشتیاق پاؤں کا زنجیر ہو جاتا ہے۔ ہرات کے سرسبز و شاداب خطّے اور سیستان و مازندران کے لذیذ و خوش بو میوے چار برس تک بادشاہ کی مہماں نوازی کرتے رہے۔ اس مدت دراز میں اعیانِ دولت و وابستگانِ سلطنت وطن کی دوری اور سفر کی زندگی سے چیخ اُٹھے رعبِ شاہی سے کسی کو لب ہلانے کی طاقت بھی نہ تھی۔ رودکی دربارِ شاہی کا شاعر تھا اور گانے میں بھی بدرجۂ کمال ماہر تھا۔ سبھوں نے مل کر پانچ ہزار اشرفیوں کا وعدہ رودکی سے اس شرط پر کیا کہ وہ اپنی نظمِ دل گداز اور نغمۂ داؤدی سے بادشاہ کو وطن کی یاد دلائے۔

رودکی بادشاہ کی مجلس میں اُس وقت جب کہ وہ جام و صراحی سے داد انبساط دے رہا تھا حاضر ہوا اور اپنے درد بھرے لحن میں اپنا برجستہ کلام یادِ وطن میں گانا شروع کیا۔ یہ سحرِ حلال بادشاہ پر چل گیا۔ اُس کی بے چینی بڑھی اور ایسا مضطربانہ گھوڑے پر سوار ہوا کہ موزہ بھی پہن نہ سکا۔ رہوار تیز رفتار کو خیز کیا اور جب تک ایک منزل طے نہ ہوئی گھوڑے کی باگ نہ روکی۔ وہ اشعار بہت تھے لیکن افسوس کہ اب بجز چند اشعار کے جو تذکروں میں منقول ہیں، یاد نہیں ملتے ۔

بوے جوے مولیاں آید ہمی | یاد یارِ مہرباں آید ہمے
ریگِ آموں با درشتی ہاے او | زیرِ پایم پرنیاں آید ہمے
آبِ جیجوں باہمہ پہناوری | خنگِ ما را تامیاں آید ہمے
اے بخارا شاد باش شاد زی | شاہ سویت میہماں آید ہمے
شاہ سروست و بخارا بوستاں | سرو سوئے بوستاں آید ہمے
شاہ ماہ ہست و بخارا آسماں | ماہ سوے آسماں آید ہمے

یہ دلکش قصیدہ ایک مدت تک مقناطیس کی طرح لوگوں کے قلوب کو اپنی جانب کھینچتا رہا۔ بعض شعرا نے اس پر طبع آزمائی بھی کرنی چاہی لیکن اس کے مقابل میں نہ آسکے۔ وجہ اس کی صاف ہے۔ شاعر خود چار برس تک وطن سے دُور رہا، یادِ وطن جس جس طرح دل میں چٹکیاں لیتی ہوگی اس درد کی لذت کسی غریب الوطن سے پوچھنی چاہیئے۔ اُس پر پانچہزار اشرفیوں کا وعدہ۔

طمع زر کا اثر جذبات پر | حطیہ جو عرب کا مشہور شاعر ہے اُس سے کسی نے سوال کیا کہ سب میں بڑا شاعر کون ہوتا ہے، تو اُس نے اپنی زبان باریک مثل سانپ کے نکال کر کہا کہ یہ جس وقت طمع سے لذت آشنا ہو جائے۔ اسی طرح احمد بن یوسف نے ابو یعقوب شاعر سے کہا کہ کاتب برامکہ محمد بن منصور بن زیاد کی شان میں تیرے مدائح بھی ہیں اور مراثی بھی۔ لیکن جو جودت اور شاعرانہ تخیل کہ مدح میں ہے مراثی اُس سے بالکل خالی ہیں۔ ابو یعقوب نے کہا کنا یومئذ نعمل علی الرجاء ونحن الیوم نعمل علی الوفاء وبینھما بون بعید [یعنی اُس وقت جو ہم مدح کہتے تھے تو اُمیدیں وابستہ تھیں اور اب جو مرثیہ کہتے ہیں یہ تو محض وفاداری ہے اور ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے]

پھر پانچ ہزار اشرفیوں کی جھنکار نے اگر رودکی کے شاعرانہ جذبات و احساسات کو تیز کر دیا ہو تو کیا تعجب ہے۔ وطن کی یاد پردیس کی تکلیف اور اشرفیوں کی اُمید نے تڑپ تڑپ کر ان اشعار کی صورت اختیار کی۔ اِس لئے ان میں اُس وقت بھی لذت و لطافت تھی اور آج بھی ذوق سے خالی نہیں ۔ ہرچہ از دل خیزد بر دل ریزد۔

لیکن اگر تامل صادق سے کام لیا جائے تو دورِ اوّل کے پہلے شاعر کی خصوصیت یہاں بھی نمایاں ہے۔ رودکی نابینا ہے وہ پانی کی لہروں اور موج کے تلاطم کو دیکھ نہیں سکتا اُس کی حس باصرہ لبِ دریا کے سبزہ زار اور وہاں کی شادابی سے خنک نہیں ہوتی پس اُس کا دماغ اُس تخیل سے بالکل صاف ہے۔ قوت شامہ موجود ہے وہ اپنا کام کرتی ہے پانی کی مہک سونگھتا ہے لیکن اُس کی روانی و سیلاب کا پتہ بھی نہیں دریا کے ریگ پر گزرتا ہے لیکن یہاں بھی آنکھ کا کام وہ اپنے قدم سے لیتا ہے۔ موٹے موٹے ریت کے دانے نہ سخت معلوم ہوتے ہیں نہ پاؤں جلاتے ہیں نہ تلووں میں چبھتے ہیں بلکہ نرم ہو کر قدموں کے نیچے پرنیاں کے فرش ہو جاتے ہیں۔ یہ نتیجہ حبِ وطن کا ہے۔ دیگر اشعار کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیئے لیکن کیا اگر طبقۂ ثانی کے شعرا ہوتے تو اپنے وطن کا راگ اسی سادے لحن میں گاتے؟ نہیں کبھی نہیں۔ وہ کم از کم ریگ کے ایک ایک ذرہ کو آفتاب اور ہر ایک سبزہ کو گلستانِ ارم و باغ جناں بنا دیتے۔ موج و حباب کو جب بیان کرتے تو ایک دریا بہا دیتے رودکی بڑا پرگو شاعر گزرا ہے۔ اُس پر بادشاہوں کی قدردانی و عزت افزائی درہم و دینار کی بارش نے کبھی اُس کو خاموش بیٹھنے نہ دیا۔ ایک لاکھ تک اُس کے اشعار کا شمار بعضوں

نے کیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جب اشعار کی تعداد اس قدر ہو تو پھر اُس میں سب طرح کے مضامین ہونگے۔ تذکروں میں جو رودکی کا کلام منقول ہے اُس میں ہر جنس موجود ہے۔ جا بجا مضمون آفرینی بھی ہے۔ کہیں کہیں تشبیہ و استعارے کا بھی لطف ہے۔ اخلاق و موعظت کے پاک و بشریں مضامین بھی موجود ہیں۔ کہنہ مشق دیرینہ سال شاعر کا جب جی چاہتا ہے تو عشق و حسن کے ناز و نیاز بھی کر لیتا ہے۔ قصیدے کی تشبیب میں غزل کا لطف آجاتا ہے۔ اور گریز میں بھی اس کی قوت و قابلیت نمایاں ہے۔ لیکن با ایں ہمہ شاعری کو ابھی بہت کچھ ہونا ہے اس لئے وہ اپنا قدم نہایت سرعت و تیزی سے آگے بڑھائے جاتی ہے۔

فردوسی اور اسدی طوسی اس دور کا آخر شاعر فردوسی ہے۔ اُس نے شاہنامہ کیا لکھا اپنی اُس قوتِ دماغی اور جودت ذہن کا جو بشر میں ایک عطیۂ الٰہی ہے کامل ثبوت دیا ہے۔ اس نے یہ یہ مثنوی لکھکر ثابت کر دیا کہ انسان کی دماغی قوت اعلیٰ نمونہ صانع بیچوں کے صنعت کا ہے۔ میدانِ جنگ کی تصویر تو ایسی کھینچتا ہے کہ ہو بہو فوٹو ہوتا ہے۔ اس کا کلام و کمال کسی کی تحسین اور روشناسی کا محتاج نہیں۔ ع

حاجتِ مشاطہ نیست روے دل آرام را

یہ کہنا ایک امر واقعی کا بیان کرنا ہوگا کہ فردوسی ہی کی بدولت معانی کی کمی انتہاے کمال پر پہنچکر اپنی شان کا جلوہ دکھانے لگی۔ لیکن الفاظ اپنے بناؤ سنوار کے لئے ہنوز مضطر ہیں۔ گو بہت سے الفاظ متروک ہو چکے محاورات بھی بدل گئے لیکن پھر بھی شعر کی نزاکت و لطافت ان ثقیل الفاظ کے بوجھ سے دبی جاتی ہے۔ مثلاً فردوسی کہتا ہے ؎

برستم دہم تخت و گنج و کلاہ   نشائمش بر جاے کاؤس شاہ

یہاں متحرک کا ساکن ہونا فصاحت پر کس قدر ناگوار ہے۔

سیامک برآمد برہنہ تنا   ولہ   بیاوےخت باپورا ہرمنا

الف کی زیادتی قافیہ میں کیسی بدنما ہے۔

ایک موقع پر چاند سے خطاب کرکے بہت سے شعر لکھے ہیں اُن میں کا ایک شعر یہ ہے

بہ سی روز گیتی بہ پیمایدا   ولہ   دو روز و دو شب روے ننمایدا

یہاں فعل میں الف کی زیادتی اُسی طرح بھدّی ہے۔

کہ درمان این کار یزداں کند   ولہ   مگر کین غماں بر تو آساں کند

اگر عمر باشد مرا سالیاں   بہ خدمت بہ بندم کمر بر میاں

جمع کا الف جہاں چاہتا ہے لگا دیتا ہے چاہے فصاحت اس زیادتی کو برداشت کرے یا نہ کرے

اگرچہ ضرورتِ شعری ایک ایسی ضرورت ہے جس کے لئے ہر ناروا روا ہے لیکن الفاظ کا یہی

بھدا پن آخر دور میں قطعًا ناجائز قرار دیا گیا۔ اسی دورِ اوّل کا شاعر اسدی طوسی ہے جس کے

کمال نے یہ بے بنیاد روایت وضع کرائی کہ یہ فردوسی کا اُستاد ہے اور شاہنامہ کی تکمیل

اسی کے زبردست قلم کا نتیجہ ہے۔ اسدی طوسی فردوسی کا اُستاد تھا یا نہ تھا اس وقت اسے

جانے دیجئے لیکن یہ تو محقق ہے کہ شاہنامہ اُس کے زورِ قلم کا مرہون نہیں بہرحال دو چار شعر

اُس کے بھی ملاحظہ ہوں۔ اسدی طوسی ؎

چو خورشید آں چادرِ قیر گوں   بدرید و از پردہ آمد بروں

ہوا ابر گشت از بخور عبیر — بخندید بمّ و بنالید زیر

الفاظِ فارسیہ میں تشدید زبان پر کس طرح اجنبی معلوم ہوتی ہے۔ اسدی طوسی سببِ تالیف کتاب میں کہتا ہے ؎

بسازم یکے بوستاں چوں بہشت — کہ خندد ز خوشی برا روے بہشت

یہاں بھی وہی تشدید کی ثقالت فصاحت کو دبائے دیتی ہے۔

پہلا دور ختم ہوا۔ رودکی۔ اسدی طوسی۔ عنصری۔ فرخی۔ فردوسی اس دور کے باکمال شعرا تھے جن میں رودکی کو اوّلیت کی فضیلت حاصل ہے اور فردوسی کو خاتمیت کا فخر ہے۔

دوسرا دور | اب شاعری کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس طبقے میں خاقانی، انوری، نظامی، حکیم سنائی۔ مولانا روم و عمر خیام وغیرہ گزرے۔ دونوں دور کے شعرا میں یہ فرق ہے کہ پہلے طبقے کے شعرا قدرتی طبیعت سے شعر کہتے تھے پاس کی چیزوں سے تشبیہ لاتے اور پیش نظر اشیا سے استعارہ لیتے۔ لیکن دورِ ثانی میں جنھوں نے زیادہ غور پیدا کیا۔ عرب کے علوم ملک میں عام ہو گئے تھے۔ بلاغت کی کتابیں فارسی میں لکھی جا چکی تھیں اس لئے عربی الفاظ کا قبضہ زیادہ ہوا پھر الفاظ و معانی کو صنائع و بدائع نے علمی رنگ دیا۔ دورِ اوّل میں سادگی سنگینی و استواری تھی اب رنگینی لطافت اور ملائمت پیدا ہو گئی۔

خاقانی۔ خاقانی ابتدائی کیفیت اور خاتمۂ مطالب کو نہایت خوبی کے ساتھ نظم کرتا ہے قصائد اس کے لاجواب ہیں حسّان العجم کا اس کو لقب حاصل تھا۔

نظامی۔ نظامی مثنوی کے بادشاہ ہیں ان کے کمال کی شاہد ان کی پانچ مثنویاں ہیں جو خمسۂ نظامی کے نام سے مشہور ہیں اُنھوں نے نظم نگاری میں نیا رنگ پیدا کیا تشبیہہ و استعارے کو رنگینی و قوت کے ساتھ برتا۔ ان کے پیچ میں بھی بانکپن ہے ان کا کلام تمام لطافت و نزاکت سے لبریز ہے۔ فردوسی کے بعد رزمیہ مضمون کوئی دوسرا ان سے بہتر تو کیا برابر بھی نہ لکھ سکا۔

انوری۔ انوری نے کلام میں مضمون آفرینی پیدا کی استعارہ کو لیا اور خوش ادائی سے برتا۔ قصیدہ کہنے میں اُستاد ہے۔

حکیم سنائی۔ حکیم سنائی پہلے شخص ہیں جنہوں نے تصوّف کو مستقل طور پر نظم میں لکھا ہے۔ حدیقہ ان کی مشہور کتاب ہے۔ پختگی برجستگی اور صفائی میں ان کا کلام تمام معاصرین سے ممتاز ہے۔

مولنا رومی۔ مولنا رومی تصوف کے بادشاہ ہیں علم کلام و تصوف کے اہم ترین مسائل دل گیر و دل پذیر طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ مثنوی آپ کی چھ جلدوں میں شش جہات عالم میں فیض رساں ہے۔ عربی فارسی میں متعدد شرحیں لکھی گئیں ارباب سلوک آج تک اس کا درس دیتے ہیں۔ اور حق تو یوں ہے کہ مرد راہِ رفتہ کے سوا کوئی دوسرا اُسے سمجھ بھی نہیں سکتا۔

عمر خیام۔ عمر خیام علوم عقلیہ میں کمال رکھتا تھا اقسام شعر میں اس کی رباعیاں ہیں جنہوں نے اس کو زندہ رکھا ہی مسلمانوں سے بڑھکر اہل یورپ نے اس کے ساتھ اعتنا کیا

تیسرا دور دوسرا دور بھی ختم ہوتا ہی۔ معانی والفاظ دونوں ترقی پاکر اس دور میں کامل ہو چکے ہیں اب تیسرا دور شاعری کا شروع ہوتا ہی۔ اس طبقے کے بہترین نمونہ سعدی۔ امیر خسرو اور حافظ ہیں۔ اس عہد میں غزل خوانی کی بڑی دھوم مچی سلاطین و امرا کی خوشامدوں میں خوب خوب قصیدے لکھے جانے لگے عاشقانہ مثنویوں کا رنگ گہرا ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہی کہ چنگیز خاں کے مشہور حملہ نے جو ۶۱۷ھ میں واقع ہوا دلوں کو ایسا سرد کر دیا تھا کہ بہادری وشجاعت کا خیال سروں سے جاتا رہا۔ شعرا غزل و قصائد سے دلوں کو خوش کرنے لگے۔ مردانہ خیالات اس وقت سے جو مٹنے لگے تو آخر نیست ہو کر ہی رہے۔

پانچویں صدی کی شاعری پانچویں صدی میں حسینوں کی بزم ہر طرح کے سامان اسلحہ سے آراستہ پائی جاتی تھی۔ ابرو کمان تھے جن سے تیر مژگاں چل کر دلوں میں ترازو ہو جاتے تیوری بدلی اور ابرو خنجر ہو گئے۔ مژگاں نیزے بن گئے غرض معشوقوں کی بزم میں عشاق کے پہنچنے کی دیر تھی۔ یہ پہنچے اور رستم اور اسفندیار کے میدانِ جنگ گرد برد لیکن چھٹی صدی میں رنگینی و نزاکت بڑھی، مزاجوں میں تغیر پیدا ہوا طبیعت میں چستی وشجاعت نہ رہی راحت پسندی غالب آئی۔ آخر اس کا اثر کلام پر بھی پڑا رفتہ رفتہ ایک وہ وقت پہنچا کہ رزمیہ کلام میں بھی ساغر و مینا کے دور چلنے لگے تشبیہیں بدل گئیں۔ اب سپاہی میدان کارزار میں بھی جو پہنچتا ہی تو عشق کے نشہ میں چور جاتا ہی۔ قدسی، ہاشم، کلیم، علی قلی

تسلیم کی رزمیہ مثنویاں اس پر گواہ ہیں۔ بہرکیف یہ دور بھی ترقی سے خالی نہ رہا۔ زبان زیادہ صاف ہوگئی اور مضمون آفرینی نے بہت ترقی کی۔ خاقانی و انوری وغیرہ جو علمی اصطلاحات سے زبان کو زیربار کرتے تھے یہ بات جاتی رہی۔

سعدی۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ اس طبقے کے نہایت شیریں کلام شاعر ہیں ان کا مضمون آج تک پھیکا نہ ہوا نظم ہو یا نثر اصنافِ سخن پر قدرت رکھتے ہیں ان کے کلام میں استعارے بھی ہیں لیکن پیچیدہ نہیں۔ صفائی دکھاتے ہیں اور لطف بڑھاتے ہیں مبالغہ و استغراق سے کام نہیں لیتے۔ ان کا کلام دین و دنیا کی سودمند نصائح سے پُر ہے۔ اخلاقی مضامین کو ان کے مثل کسی نے نہیں ادا کیا۔ مخلوق کی دردمندی ان کے ہر رگ و پے میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ تجربہ کامل تھا اور سیاحت وسیع اس لئے جو ان کی زبان سے نکلتا ہے وہ دل میں جا بیٹھتا ہے۔ گلستان بوستاں دوادین و قصائد ان کی مشہور تصانیف ہیں لیکن غزل کا رنگ بدلنے والے، اور سوز و گداز کے ساتھ دقوعہ گوئی کی بنیاد ڈالنے والے بھی شیخ سعدی ہی ہیں اس لئے من حیث شاعر انھیں غزل کا استاد تسلیم کیا گیا ہے۔

امیر خسرو۔ امیر خسرو کے والد امیر سیف الدین ترکستان سے آئے تھے۔ امیر خسرو نے گو ہندوستان میں ولادت اور تربیت پائی تھی، مگر دماغ یدِ قدرت سے وہ ودیعت ہوا تھا کہ ایجادِ مضامین کا طلسم خانہ تھا۔ انھوں نے صنائع لفظی و معنوی کا عجائب خانہ کھول دیا۔ تصانیف کی یہ کثرت ہے کہ ہمیشہ اُن کا سمیٹنا دشوار رہا اور آج دشوار تر ہے۔

حافظ۔ خواجہ حافظ کا دیوان مشہور ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ چند قصیدے

بڑے نام ہیں مگر غزل ایسی لکھ گئے کہ آج تک ان کا جواب نہیں۔ نہ تصنع ہے نہ تکلف جیسی گزری ہے ویسا لکھا ہے۔ عرفان وحقائق کا ایک بے بہا گنجینہ ہے جس پر نقوش و حروف کے قفل چڑھے ہوئے ہیں! رباب بصیرت عینک کی طرح اپنی نگاہوں پر لگائے پھرتے ہیں۔

جامی۔ جامی علیہ الرحمہ کا زمانہ سنہ ۹۰۰ھ ہجری ہے۔ ناظم ہروی نے امیر خسرو کے بعد شاعری کو ان پر ختم کردیا ہے جیسا کہ اس کے ایک شعر سے ظاہر ہے ؎

زخسرو چو نوبت بجامی رسید   زجامی سخن را تمامی رسید

علاوہ عام شاعری کے صوفیانہ طرز میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ نقشبندیہ طریق کی تعلیم و مراقبات کی طرف عجب لطف سے اپنے کلام میں اشارہ کرتے ہیں۔

چوتھا دور | اب تیسرا دور بھی ختم ہوا اور شاعری کے لئے گرانمایہ متاع چھوڑ گیا۔ سنہ ۹۰۰ھ کے بعد چوتھا دور شروع ہوتا ہے۔ فیضی، عرفی، نظیری، طالب آملی، ابوطالب کلیم، مرزا صائب اس دور کے ممتاز ارکین ہیں۔ اگرچہ اس دور میں قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی ان تمام اصناف کا بڑا ذخیرہ پیدا ہوگیا، لیکن فی الحقیقت یہ عہد ترقیِ غزل کا انتہائی اور آخری زینہ تھا اس دور کی یہ خصوصیت ہے کہ جو بات کہتے ہیں وہ پیچ دیکر کہتے ہیں۔ دُور کی راہ سے سامعین کی فہم کو مطالب تک لاتے ہیں اور داد لیتے ہیں۔ استعارہ کو استعارہ در استعارہ اور مجاز کو مجاز اندر مجاز کر کے معنوں میں نزاکت اور باریکی پیدا کرتے ہیں اس لئے بہت سے اشعار کی باریکی معشوقوں کی کمر کو بھی بار نزاکت سے خم کردیتی ہے۔ اور کبھی گم بھی ہو جاتی ہے مثال کے لئے کسی شاعر کا ایک شعر کفایت کرتا ہے ؎

تاکہ از عکسِ تو آئینہ گلستاں گردد   سوئے عاشق نگہے تا ہمہ تن جاں گردد

اس شعر کے سمجھنے کے لئے پہلے ان باتوں کو ذہن میں مجتمع کر لیجئے معشوق کا قد سرو شمشاد ہی، آنکھیں نرگس کے پھول ہیں، رخسار گلابِ شگفتہ ہی، زنخداں سیب ہی، خط سبزہ ہی، زلف تختۂ سنبل ہی وغیرہ وغیرہ۔ اب جو معشوق آئینہ دیکھتا ہی اور اُس کا عکس شیشے پر آتا ہی تو گویا آئینہ گلستان ہو جاتا ہی یہ تو پہلے مصرع کا حال ہوا۔ دوسرا تو اس سے بھی زیادہ دشوار ہی۔

اسی طرح اس دور میں مضامین کی بنیاد محالات اور دور از قیاس ایہام پر ہی۔ الفاظ کی نئی تراشیں اور نئی ترکیبیں کثرت سے پیدا ہو رہی ہیں حقیقت و واقعیت سے بیگانگی اور بے بنیاد خیالات سے رشتہ جوڑا جا رہا ہی۔ مثلاً پہلے مے کدہ و آتش کدہ وغیرہ مستعمل تھے اب نشتر کدہ و مرہم کدہ وغیرہ ترکیبیں پیدا ہوئیں۔ پہلے "یک گلشنِ گل" کہتے تھے اب "یک آغوشِ گل" کہنے لگے۔ اس طرح کی ترکیبیں فیضی اور عرفی نے کثرت سے پیدا کیں مثلاً

مصرع   شکن بروے شکن خم بروے خم چیند

مصرع   موج بر موج شکستم چو بہ عماں رفتم

مصرع   رے برفے حسن کن دست بدستِ نازدہ

اس دور میں عرفی کی قصیدہ خوانی ایک خاص خصوصیت رکھتی ہی۔ غزلیں بھی اس کی باسوز و گداز ہیں لیکن صائب کا کلام پھیکا اور سیٹھا ہی۔ اس نے شاعری کیا کی ہی خشک علمی مباحث ردیف و قافیہ میں بیان کئے ہیں۔ یہ دور بھی ختم ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایران میں شاعر

بھی ختم ہوئی۔ اب ہند کی سرزمین میں حافظ و سعدی کا انداز آگیا تھا۔ لیکن الفاظ ایک ہی طرح میں گردش کرتے کرتے اپاہج ہوگئے تھے۔ کسی طرح کی کوئی ترقی نہ ہو سکی۔ ہندیوں نے ایرانی انداز کو زندہ رکھا مگر زندگی کے آثار اس میں نہ پیدا کر سکے۔ پھر بھی فارسی شاعری اہل ہند کی ایرانیوں سے زیادہ مرہونِ منت رہی۔ دہلی، بلگرام، پٹنہ وغیرہ میں ایسے باکمال شعرا اُٹھے جن کا کلام اپنے اپنے وقت میں سکۂ رائج الوقت سمجھا گیا۔ مرزا عبدالقادر بیدل، میر غلام علی آزاد بلگرامی اور یادش بخیر خاتم الشعرا غالب دہلوی۔ کیا کچھ احسان فارسی زبان پر نہ کر گئے۔ مدتوں بعد ایران میں قاآنی پیدا ہوا۔ اور اُس نے شاعری کی کایا پلٹ کرنی چاہی لیکن اُس کی شاعری کوئی نئی شاعری نہ تھی۔ وہی چبائے ہوئے نوالے تھے جو پھر منہ میں پھیرے جاتے تھے۔ اس نے قصیدے خوب خوب کہے۔ شوکت الفاظ کا بادشاہ ہے۔ بہاریہ مضمون خوب ہی کہتا ہے۔ بہرحال ؎

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند   تہی خم خانہا کردند و رفتند

فارسی شاعری کی لفظی و معنوی خصوصیات

اس کے بعد کہ نظم فارسی کی آفرینش اور عہد بعہد ترقی و کمال اور پھر اس کے زوال کی تاریخ معلوم ہو چکی اب ایک اجمالی نظر اُن خصوصیات پر ڈالنی چاہیئے جو فارسی شاعری میں باعتبار معانی و الفاظ پائی جاتی ہیں۔ ایران میں شاعری نے جب آنکھیں کھولیں تو اس وقت عرب کی شاعری بالکل متبدل و متغیر ہو چکی تھی اس کی یہ وجہ تھی کہ مقدس اسلام جب سرزمین عرب پر بارانِ رحمت ہو کر برسا تو کلام مجید کی فصاحت و بلاغت شیرینی و لطافت دل آویزی و روح پروری کے سیلاب نے شاعری کو

خس و خاشاک کی طرح بہا دیا۔ چنانچہ زمانۂ جاہلیت کا مشہور شاعر لبیدبن ربیعۃ العامری جو سبعہ سیّارگان معلقات میں مثل آفتاب کے درخشاں ہے مشرف باسلام ہو کر نظم قرانی کا ایسا والہ و شیفتہ ہوا کہ فاروق اعظمؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں جب کہ اُس شاعر غرا کے پاس یہ پیام بھیجا کہ کچھ تازہ کلام اپنا بھیجو تو اُس نے جواب دیا کہ جاہلیت کے رزمیہ و بزمیہ ہر طرح کے کلام موجود ہیں جس قدر آپ فرمائیں بھیجدوں۔ لیکن اب کہ قران میرے سامنے ہے اس کے آگے تمام شاعری عرب کی بے مزہ اور پھیکی ہے۔ اُس کی تلاوت میں وہ حلاوت ہے کہ شعر گوئی سے طبیعت سیر ہے۔ اس واقعہ سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ اسلام کی برکتوں نے حکمت نظریہ و عملیہ کی طرف عربوں کو ایسا مصروف کرلیا کہ شاعری کے بازار سرد ہو گئے لیکن بوقت ضرورت جب کوئی کچھ کہتا تو اُس میں وہی عربی شان ہوتی۔ بنو اُمیّہ کے عہد میں خلافت نے صورت سلطنت کی اختیار کی۔ اس کا بہت ہی بُرا اثر ملک اور اہل ملک کے جذبات پر پڑا۔ لیکن پھر بھی سلف کا ایک دھندلا سا نشان ہنوز باقی تھا۔ مگر جب کہ خلفاے عباسیہ کا دورہ آیا اور ان کے عہد میں عجمی معاشرت اور اہل عجم کی ہمہ گیری تمام دربار پر چھاگئی مسلمانوں کا امیر عجمی سلاطین کے نقش قدم پر گام فرسا ہونے لگا تو پھر اُس وقت شاعر شاعر نہ رہا۔ بلکہ بھانٹ بن گیا۔ اور یہی وہ عرب تھے جو اہل ایران کو شاعری کا سبق دیتے تھے۔

جوہر ذاتی کا فقدان | فارسی شاعری جب اپنے قدموں پر کھڑے ہونیکے قابل ہوئی تو اُس نے نظر اُٹھا کر جو دیکھا تو اپنے ہی عجمی اخلاق و سیرت کو عربی لباس پہنے ہوئے نظموں میں

چلتے پھرتے پایا۔ اساتذہ کو اُنھوں نے دولت وسلطنت قوّت و طاقت کے آگے شرافت انسانی و کرامتِ ذاتی کو نہایت فیاضی سے نثار کرتے ہوئے پایا۔ پھر اہل ایران تو صدیوں سے محکوم رہکر فضائلِ انسانی کو نہایت بے جگری سے تصدّق کرنے کے عادی ہی ہو رہے تھے اور اس میں ان کی مشق پشتہا پشت سے چڑھی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے سلاطین و اُمرا کی شان میں قصیدے کہے اور بے ضغطۂ زبان جو چاہا وہ کہہ گزرے اور جس حد تک قوّتِ بشری نے اُن کی یاوری کی قصائد میں اپنی پستی و تذلل کا اظہار کیا۔ اس لئے فارسی شاعری میں جوہر ذاتی کا بیان آپ کو خال خال بھی نہ ملے گا۔ کوئی نظم ایسی نہ ہوگی جس نے ملک کے حق میں یا قوم کے حق میں شریف و باوقار انقلاب پیدا کیا ہو۔ کسی شاعر کا کلام باوجود جستجو کے بھی ایسا نظر سے نہیں گزرے گا جس سے خودداری غیرت حمیت اباءِ نفس زندگی کے صحیح آثار پائے جائیں۔ غرض کہ عربی شاعری کی وہ خصوصیات معنوی جو اوپر گزر چکیں اُس کا نام و نشان بھی ایران کی شاعری میں نہیں۔ اور حق تو یوں ہے کہ ہو بھی کیوں کر سکتے تھے۔ اس لئے کہ محکوم و مفتوح قوم اپنے لئے نہیں پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ اُس کے وجود اور کمال کا صرف یہ مقصد رہ جاتا ہے کہ وہ سلطنت اور اُس کے ارکان و اعیان کی گردشِ چشم و ابرو کو دیکھا کرے۔ اُس کو اپنی ذات سے نہ کسی سے جنگ ہے نہ صلح اُس کے کمالاتِ اکتسابیہ نہ ملک کے لئے ہیں نہ قوم کے لئے بادشاہ کا حکم اُس کو میدانِ قتال میں پہنچاتا ہے اور اُس کا قہر و غضب اُسے شجاع و بہادر بناتا ہے۔ پھر اُسی کا حکم اُس کو صلح پر آمادہ کرتا ہے۔ اسی طرح اُس کے کمال کا تعدیہ اور نفع اُسی جگہ اور اُسی مقدار میں پہنچتا ہے جس قدر

اور جس جگہ منشا سلطانی ہو۔ پس ایران کی شاعری اگر ایسے مضامین عالیہ سے خالی و عاری رہی تو یہ کون سے تعجب کا مقام ہے۔ صدیوں کی مسلسل محکومیت اسی کی مقتضی تھی کہ اُن کی زبانیں ثنائے ملوک و اہل دول و ارباب سطوت کے لئے وقف ہوں حکومت کے مقابلہ میں ہمیشہ وہ اپنے نفس کو ذلت و پستی میں دیکھکر خوش ہوں۔

(۱) پند و موعظت

ایرانی شاعری کی خصوصیات ایجابی

ہاں بعض مضامین فارسی میں ایسے بھی ہیں جن سے نظمِ عربی کا سلک خالی ہے، اور یہی فارسی نظم کی ایجابی خصوصیت ہے اور بہت بڑی خصوصیت ہے۔ اور وہ تاریخ موعظت و اخلاق اور صوفیانہ کلام ہے۔ فارسی شعرا میں کثرت سے ایسے باکمال آپ کو ملیں گے جنہوں نے اپنی شاعری کی قوّت انھیں مواعظ حسنہ پر خرچ کی۔ اور ان پاکیزہ مضامین کو کچھ ایسے اخلاص اور درد بھری آواز سے کہہ گئے ہیں کہ نفوسِ قدسیہ اُس کو پڑھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔ نظم میں تاریخیں لکھ گئے جن سے واقعات اور اُس کے ساتھ بہت سے جزئیات معاشرت تمدن وطرز جنگ کے متعلق حیاتِ جاوید پا گئے۔ ایسے مضامین کا بیان مثنوی کا مقتضے تھا۔ اور یہ صنف عرب کی شاعری میں نہ تھی اس لئے عربی شاعری ایسے مضامین سے محروم رہی۔ حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ کے کلام پاک کے مجموعے یا ابن الفارض و محی الدین عربی و ابن الوردی کے کلام سے ہم ناآشنا نہیں لیکن فیما نحن فیہ سے اُس کا کیا علاقہ۔

قصائد عربیہ بہت کچھ وضع لباس معاشرت ملکی جغرافیہ صلح و جنگ پر روشنی ڈالتے

ہیں مگر تاریخ کا منصب انھیں کسی طرح نہیں دیا جا سکتا۔ اس کی وجہ جو کچھ بھی ہو۔ لیکن یہ کہنا کہ مثنوی کی ایجاد اہل ایران کی خصوصیات میں سے ہے ایک امر واقعی کا اظہار ہوگا۔

(۲) غزل

دوسری خصوصیت نظم فارسی کی غزل سرائی ہے۔ اس کے ایجاد و ایزاد کا سہرہ بھی اہل فارس ہی کے سر بندھا۔ عربی زبان میں غزل تو اس راز و نیاز کی گفتگو کو کہتے ہیں جو خود عورتوں سے کی جائے یا ان کے متعلق کی جائے لیکن فارسی میں نظم کی ایک صنف مستقل کا نام ہے جس میں واقعات و کیفیات و جذبات عشق و عاشقی کو سوز و گداز سے بیان کرتے ہیں۔ عربی میں قصائد کی تشبیب و نسیب کو چاہے غزل کہدیا جائے لیکن حق تو یوں ہے کہ وہ غزل نہیں ہے۔ یہ اہل ایران کی ایجاد ہے۔ اور وہی اس کو کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ بوالہوس اپنی ہوسناکیوں کو غزل میں الاپتے ہیں اور اہل دل صوفی اپنی واردات قلبیہ کو اسی عشق و حسن وصل و فراق کے استعارے میں کہہ گزرتا ہے۔ عارف کو ان اشعار سے راہ ملجاتی ہے اور ناآشنا خط و خال میں الجھ کر اس سے بے خبر رہ جاتا ہے۔ سچ فرمایا مولٰنا روم علیہ الرحمہ نے ؎

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر　　گرچہ ماند در نبشتن شیر و شیر

مدارج محل محبت مختلف ممالک میں

یوں تو عشق کی عالمگیری و ہمہ گیری ظاہر ہی ہے۔ لیکن اس نے جو وسعت کہ ایران میں آکر پائی وہ اسے کسی دیار میں نصیب نہوئی۔ ہند کی سرزمین میں عورت مرد پر عاشق ہے۔ اور اکثر وہ مرد اس کا شوہر ہی ہوتا ہے۔ اس سرزمین کا خاصہ

ہے کہ عورت میں وفاداری واطاعت شعاری بے انتہا ہو جب تک شوہر زندہ ہے اُس کی راحت و
خدمت میں وقف ہے۔ جب وہ مرا تو اُس کے ساتھ جل کر اپنی وفا و عشق کا ثبوت دیا پس
یہاں کی شاعری میں قبل اسلام جو عورت مرد پر عاشق ہوتی ہے وہ یہاں کی عورت و
مرد کے تعلقات اور اس کے لوازم کی روشن برہان ہے۔

عرب میں مرد عورت پر عاشق ہے جو بالکل فطرتی و خلقی ہے لیکن ایران کا عشق فطرت پر
کب قناعت کرنے والا تھا یہاں اُس نے یہ سب مراحل و منازل طے کرتے ہوئے مرد کو مرد پر
عاشق کیا اور اس طرح عشق و لوازمات عشق کے لئے گوناگوں رنگینیاں پیدا ہوئیں
جن کا قبل میں نام و نشان بھی نہ تھا۔ پھر کیا تھا ؎

یہ عشق کی بیباکی سب تجھکو سکھا دیگی   اے حسن حیا پرور شوخی بھی شرارت بھی

کمالِ عشق تو یہ ہے کہ لڑکا ابھی مکتب میں ہے حرف شناسی بھی اُسے نہیں آتی لیکن
عشاق ہیں کہ پروانوں کی طرح گرے پڑتے ہیں شعر ملاحظہ ہو ؎

تعلیم جفا کردہ وفا ہیچ نیاموخت   زیں درسِ غلط بحث بر اوستادِ تو دارم

دوسرا شعر ؎

بمکتب میرود طفلِ پری زاد   مبارک باد مرگِ نو باُستاد

اب معشوق کے عہد طفلی سے متعلق انواع و اقسام کے مضامین پیدا ہو گئے۔
خدا خدا کر کے وہ لڑکا جسے شعور سے پہلے معشوق بننا پڑا تھا اور علم شروع کرنے سے بہت
قبل اُسے سند معشوقیت بارگاہِ عشاق سے دی گئی تھی جوان ہوتا ہے۔ مسیں بھیگتی ہیں

خط نمودار ہوتا ہی اُس وقت عشاق آتے ہیں اور دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر کہتے ہیں[۵]

گفتم زغمت وارہم از سبزہ و میدان — دردا کہ زخط حسن رخت گشت دوبالا

دیگر

حسن سبز نجط سبز مرا کرد اسیر — دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

خط و سبزہ کے مضامین

اسی خط اور سبزہ سے شعرا نے گوناگوں مضامین پیدا کئے۔عرب غریب ان باتوں کو کیا جانیں یہ تو خصوصیات ایران ہیں۔اب اس سے اس نتیجہ پر پہنچیے کہ جو بچہ بدر شعور سے پہلے معشوق بنا ہوا اور جوانی تک معشوق رہا ہو وہ جب عاشق بن کر شعر و سخن کے میدان میں اُترے گا تو بالیقین اُس کے کلام میں نزاکت و لطافت اور ایک طرح کی لچک و شیرینی ہوگی۔اور یہی وہ چیزیں ہیں جن سے ایک غزل کی آرایش ہوتی ہی یہ ظاہر ہی کہ ایسے شاعر کے منہ سے جو بات نکلے گی وہ نازک و لطیف ہی بن کر نکلے گی عشق اور اُس کے معاملات و واقعات کو اس سے بہتر کون جان سکتا ہی مصرع

باشیر اندروں شد باجاں بدر برآید

اثمہا اکبر من نفعہا

یوں تو عاشق و معشوق کے ناز و نیاز کو ہر دل جانتا ہی۔مگر اس جاننے اور اُس جاننے میں آسمان و زمین کا فرق ہی۔یہاں خود حدیثے نقد حال ماست آں کا قصہ ہی وہاں دوسروں کی سنی سنائی باتوں پر اکتفا ہی۔اس میں شک نہیں کہ غزل کی ایجاد اور وقوعہ گوئی کی ایزاد نے فارسی شاعری میں چار چاند لگا دئے زبان سے الفاظ کیا نکلتے ہیں فصاحت شیراز کا شیرہ بہتا ہی۔شہد و شیر کی نہروں کی روانی کا مزہ آجاتا ہی۔لطیف سے لطیف تر محاورات پیدا ہوتے جاتے ہیں لیکن دوستو انصاف شرط ہی۔اسی شاعری و

عشقبازی نے اخلاق کا آخریں خاتمہ کر دیا۔ بوالہوسوں کی آتش ہوس اس سے بھڑک اُٹھی
تمام دفاتر اخلاق و موعظت کی کتابوں میں یادرس میں رہ گئے۔ رفتہ رفتہ عملی زندگی
پر تو اُسی شاعری کا قبضہ ہوتا گیا۔ اس کا نتیجہ ملک کی بے رونقی علم کا فقدان تمدن کا فنا
ہونا لازمی تھا۔ وہ ایران کے لئے نوشتۂ تقدیر ہوکر اسی شاعری کی بدولت سامنے آیا۔
خیر یہ ایک اور ہی بحث ہے جس کا یہ محل نہیں۔

رقیب و رقابت کے مضامین

یہاں تو یہ بیان کرنا ہے کہ عشق کے لئے سرزمین ایران کی آب و ہوا بہت
ہی موافق آئی اگر مرد مرد پر عاشق نہ ہوتے تو یہ مضامین کہاں سے شعر
کی صورت میں آج دکھائی دیتے۔ شعرا کو مردوں کے معشوق ہونے سے ایک رقیب ملا۔
عربی میں رقیب کے معنی نگہبان کے ہیں۔ خیام و اہل خیام کی محافظت پر جو مقرر ہوتے انھیں
رقیب کہتے تھے۔ لیکن فارسی میں اس کا استعمال جن معنوں میں ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اس تبدیل
معنی نے آفرینش مضامین کے لئے ایک نیا دروازہ کھول دیا۔ رقیب و رقابت سے
ایسے ایسے تخیل پیدا ہوئے کہ اُن کی داد نہیں دی جا سکتی۔ فارسی اشعار کے مطالعہ
کرنے والوں سے اُس کا لطف مخفی نہیں۔ عرب جاہلیت کی شاعری اس وسیع مضمون
سے بھی خالی ہے۔ خلیفہ مامون الرشید کے وہ چند اشعار خصوصیت کے ساتھ شہرت رکھتے ہیں
جو اُس نے قاصد کو مخاطب بنا کر کہے ہیں لیکن اہل ایران کے اشعار سے اُن اشعار کو کیا نسبت
مرد معشوق ہے بازاروں میں نکلے گا۔ محفل و مجلس میں پہنچے گا مجامع میں اُس کا گزر ہوگا
پھر رقیبوں کی کثرت ہوگی اور رقابت میں تنوعات ہونگے۔ وہاں یعنی عرب میں باوجود

آمیزش ایران بہت جدت کی تو قاصد کی قسمت پر رشک آگیا۔ مامون الرشید کے وہ اشعار یہ ہیں ؎

بَعَثْتُكَ مُشْتَاقاً فَفُزْتَ بِنَظْرَةٍ　　وَاَغْفَلْتَنِي حَتّٰى اَسَأْتُ بِكَ الظَّنَّا

(میں نے تجھے کس اشتیاق سے قاصد بنا کر بھیجا پس تیری نظریں تو اُس کے دیدار سے بہرہ اندوز ہوگئیں اور میری جانب سے تو ایسا غافل ہوگیا کہ اپنے بارے میں تو نے میرا خیال بُرا کر دیا)

وَنَاجَيْتَ مَنْ اَهْوٰى وَكُنْتَ مُقَرَّبًا　　فَيَا لَيْتَ شِعْرِي عَنْ دُنُوِّكَ مَا اَغْنٰى

(تو نے اُس سے سرگوشیاں کیں جسے دل چاہتا ہے اور اُس سے نزدیکی حاصل کی ۔ اے کاش تیری اس نزدیکی کی مجھے خبر ہوتی اور میں اس سے بے پروا نہوتا)

وَرَدَّدْتَ طَرْفاً فِي مَحَاسِنِ وَجْهِهَا　　وَمَتَّعْتَ بِاسْتِمَاعِ نَغْمَتِهَا اُذْنَا

(تو نے بار بار اپنی نگاہ اُس کے چہرے کی خوبصورتیوں کی طرف ڈالی اور تو نے اپنے کان کو اُس کے خوش آیند نغمات سے لذت گیر بنایا)

اَرٰى اَثَرًا مِنْهَا بِعَيْنَيْكَ لَمْ تَكُنْ　　لَقَدْ سَرَقَتْ عَيْنَاكَ مِنْ وَجْهِهَا حُسْنَا

(تیری آنکھوں میں ایسی علامت میں دیکھتا ہوں جو پیشتر نہ تھی البتہ تیری آنکھوں نے اُس کے زیبا چہرے سے حسن چُرایا ہی)

خلاصہ یہ کہ عرب کی شاعری جب مٹ گئی اور عجم کی تقلید اُس میں آگئی اُس وقت بھی عشق کو وہ رتبہ نہ ملا جو اُسے ایران میں حاصل تھا۔ یہ ایرانی ہی شاعر میں کمال ہی کہ وہ ادائے معشوقانہ کو بیان کرتا ہی بیان کرتا ہے جب تھک جاتا ہی توضیق بیان کو اس طرز میں کہہ جاتا

ہے کہ ہزاروں وسعتِ بیان اُس پر قربان ہیں مثلاً ؎

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست　　بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

اب ہم بھی اس بیان سے تھک گئے ؎

قلم بشکن سیاہی ریز کاغذ سوز و دم درکش　　حسنؔ ایں قصۂ عشق ست در دفتر نمی گنجد

(۳) باغ و راغ

اب مضمون کی دوسری قسم لیجئے جسے خصوصیت ملکی نے اہل ایران کے ساتھ مخصوص کر دیا ہے وہ باغ و بہار کا مضمون ہے۔ ایران کا خطہ ہرا بھرا لہکتا مہکتا چمن ہے۔ بہار کا موسم وہاں عجب مستی و حسن و جمال کے ساتھ آتا ہے۔ اُس وقت وہاں کا ایک ایک چپہ سو سو چمن بر خندہ زن ہوتا ہے۔ دلوں پر موسم کی کیفیت سے سرور و مستی چھا جاتی ہے۔ خوشنوا چڑیوں کا چہچہانا، بلبل کا چہکنا درختوں کا سرسبز و شاداب ہونا اور پھولوں کی شگفتگی پھر اُن کی شامہ نواز لپٹ صلِّ و جلّ اُس وقت اُن کی تازگی و رنگا رنگی سے دلوں میں سرور و باغ میں راحت آنکھوں میں ٹھنڈک پیدا ہوتی ہے۔ ایرانی شاعر اپنے گرد و پیش باغ جناں کا نقشہ دیکھتا ہے۔ اپنے ملک اپنے وطن کو جب ایک عروس زیبا کی طرح بنا سنورا پاتا ہے تو بے اختیار مست و سرشار ہو جاتا ہے۔ پھر اُسی کیف میں جو اُن چیزوں کا بیان شروع کرتا ہے تو اس قوت و قدرت سے الفاظ میں تصویر کشی کرتا ہے کہ سننے والا بھی تھوڑی دیر کے لئے مدہوش و بے ہوش ہو جاتا ہے۔

عرب ریگستانی و کوہستانی ملک کے رہنے والے باغ و بہار کا نام و نشان تک نہیں جانتے۔ اس لئے وہاں آپ نہ تو سنبل سونگھیں گے، نہ نرگس کی مستی دیکھیں گے نہ لالہ کا ساغر آپ کو ملے گا۔ چوں کہ اُن کا جزیرہ نما ملک ان چیزوں کے پیش کرنے سے قاصر ہے اس لئے عربی شاعری میں نہ تو ان چیزوں کا بیان ہے نہ ان سے تشبیہ اور استعارے کا نشان۔ بہاریہ مضمون ایران کا حصّہ ہے۔

بہار کا نمونہ خزاں میں | اس دَور آخر میں جب کہ ایران ایران نہ رہا، نہ ملک کی طرف توجہ رہی نہ اُس کی آبادی و شادابی کا خیال رہا سلطنت غافل، اہل ملک کاہل۔ اُس پر بھی قاآنی نے جو بہاریہ قصائد لکھے ہیں اُس سے سمجھنا چاہیئے کہ ایران جب زندہ ہوگا تو شعرا کیسے کیسے مضامین کا چمن کھلاتے ہونگے۔ ہم چند شعر قاآنی کے محض لطفِ ناظرین کی غرض سے پیش کرتے ہیں ؎

بہار آمد کہ از گلبن ہمی بانگِ ہزار آید
بہر ساعت خروشِ مرغِ زار از مرغزار آید

تو گوئی ارغنوں بستند بر ہر شاخ و ہر برگے
زبس بانگِ تدرو و صلصل و درّاج سار آید

بجوشد مغزِ جاں چوں بوئے گل از گلستاں خیزد
بپرّد مرغِ دل چوں بانگِ مرغ از شاخسار آید

یکے گیرد بکف لالہ کہ ترکیبِ قدح دارد
یکے بر گل کند تحسیں کز و بوئے نگار آید

یکے با دلبرِ سادہ بطرفِ بوستاں گردد
یکے با ساغرِ بادہ بطرفِ جوئبار آید

یکے بر لالہ ہا کو بد کہ ہم ہم رنگ مَی دارد
یکے از گل بوجد آید کہ وہ وہ بوئے یار آید

یکے اینجا گسارد مَی یکے آنجا نوازد نَے | صدائے ہائے و ہوئے ہی زہر سوئے ہمزا آید
زہر سوئے صدائے ارغنون و چنگ و نَے خیزد | زہر سوئے صدائے بربط و طنبور و تار آید
یکے برلالہ می غلطد، یکے در سبزہ می رقصد | یکے گاہے رود از ہوش یک گہ ہوشیار آید
الا یا ساقیا مَے دہ بجانِ من بیا پے دہ | دما دم ہی خور و ہی دہ کہ می ترسم خمار آید

یہ ہیں خصوصیات فارسی شاعری کی جنھیں نہایت اختصار کے ساتھ میں نے اس مختصر تحریر میں بیان کیا اب دو ایک باتیں الفاظ کے متعلق بھی گزارش کر دوں تو یہ تمہید ختم ہو اور آغازِ مقصد ہو جائے۔

فارسی الفاظ | فارسی زبان میں الفاظ کم ہیں اور مصادر بہت ہی کم۔ اس لیے انھوں نے اپنے الفاظ کی کمی مرکبات سے پوری کی ہی۔ ایک ہی اسم کو مختلف مصادر سے ترکیب دے کر طرح طرح کے دل فریب مطالب یا ایک اسم کو دوسرے سے ملا کر معانی مختلفہ پیدا کیے ہیں۔ مثلاً اُن کا ملک رنگین ہے۔ طبیعتیں بھی رنگین پائی ہیں اس پر تعلیم و تمدن نے اور بھی رنگ گہرا کر دیا ہی۔ اب جو بات مُنہ سے نکلتی ہی رنگین ہو کر نکلتی ہی۔ رنگ انھیں بہت مرغوب و محبوب ہی۔ اس لفظ کو مختلف مصادر سے ترکیب دیتے گئے اور رنگا رنگ معنی پیدا کرتے جائیں گے۔ مثلاً رنگ ریختن، رنگ بُردن رنگ برخاستن وغیرہ۔ اسی طرح ان کا ملک سرد ہی۔ گرمی اور آگ انھیں محبوب اور راحت رساں ہیں۔ دو مہینے سرما کے ایسے بسر ہوتے ہیں کہ انسان تو انسان چرند و پرند کا کہیں نشان تک نہیں ملتا ہی۔ کاروبار بند آمد و رفت مسدود۔ اہل صنعت و حرفت کے پیشے

اُن کے ہاتھوں سے سوا ٹھنڈے۔ اُس وقت یہی آگ اُنھیں راحت پُہنچاتی ہی۔ اور حیات کو
خوشگوار رکھتی ہی۔ اب لفظ آتش کو وہ مختلف اسما سے ترکیب دینگے اور ایسے معانی پیدا
کرینگے جن سے چستی رونق و قدر وغیرہ کے مفہوم سمجھے جائیں مثلاً آتش بیان آتش لبا
آتشِ بے دود وغیرہ۔ اس گرمی کی ضد سردی ہی۔ وہ اُنھیں نامرغوب ہی۔ تو اس سے جس قدر
مرکب بنائیں گے اُن میں بے رونقی و سُستی و کاہلی کا مفہوم ہوگا۔ مثلاً سرد مہر۔ سرد نفس
سرد رو وغیرہ۔ یہ الفاظ کی ترکیب اہل فارس سے مخصوص ہی۔ عربوں کو اس طرح ترکیب دے کر
الفاظ میں وسعت پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اوّلاً اُن کے پاس اس قدر اکثار الفاظ ہی
جو اُنھیں ایسی ضرورتوں سے محفوظ رکھتا ہی پھر اُن کی زبان ایک بولتی زبان ہی۔ لفظ
اپنا مفہوم اور فلسفہ اس طرح بیان کرتا ہی کہ آج حیرت ہوتی ہی کہ خداوندا وہ بھی آخر بشر ہی تھے
جنھوں نے ایسی زبان وضع کی۔ ثانیاً ایک ہی مادّے کو مختلف ابواب میں لے جاکر عجیب
معانی پیدا کرتے ہیں۔ ثالثاً اسم ظرف و اسم آلہ وغیرہ مشتقات اپنا وسیع دامن رکھتے
ہیں۔ اِنھیں وجوہ سے عربوں نے دیگر السنہ کو عجم کہا اور سچ کہا۔ عربی الفاظ کی بحث بہت ہی
نادر و لطیف بحث ہی لیکن یہاں جس قدر بیان کرنا ضروری سمجھا گیا اُس قدر عرض کر دیا۔
تفصیل کے لئے دوسری ملاقات چاہیئے ؎

مل رہینگے ترے کوچے میں کبھی دل ادہم یار باقی ہی تو صحبت ہی دل آرا باقی

حضرت امیر خسرو کی شاعری

فارسی شاعری اور اُس کے عروج و نزول کی تاریخی بحث اور اُس کے ہر دَور کی خصوصیات وغیرہ ایک مختصر طریقے پر جب کہ معلوم ہو چکیں تو اب اصل مدعا یعنی امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی شاعری پر ایک تنقیدی نظر ڈالنی چاہیئے۔

خسرو اور انواع کمال

خسرو علیہ الرحمۃ کو جو جامعیت کہ مبدء فیاض سے عطا ہوئی ہی اس طرح کی بخششیں صفحات تاریخ میں بہت ہی کم یاب و نادر ہیں۔ خصوصاً سرزمین ہند کے لئے تو ان کی ذات ایک بے مثل مایۂ ناز و فخر ہی مختلف پہلوؤں سے ان کی ذات باکمالوں کی صف میں صدر نشین پائی جاتی ہی۔

اگر صوفی کی حیثیت سے دیکھو تو فانی فے اللہ۔ ندیم کی حیثیت سے دیکھو تو ارسطوئے زمانہ۔ عالم کی حیثیت سے دیکھو تو متبحر علامہ۔ موسیقی کی حیثیت سے دیکھو تو امام المجتہد۔ مورّخ کی حیثیت سے دیکھو تو بے نظیر محقق۔ شاعر کی حیثیت سے دیکھو تو ملک الشعرا۔ ان کے ہر کمال کا دامن نہایت وسیع ہی اور اپنے بیان میں نہایت طوالت پذیر۔ سچ ہی ؎

لیس علی اللہ بمستنکر　　ان یجمع العالم فی واحد

(قدرت خداوندی سے کیا بعید ہی اگر وہ ایک عالم ایک ہی شخص میں جمع کر دے)

اب ہر حیثیت اور کمال کے ہر پہلو سے بحث تو ان کے سوانح نگار کا فرض ہو گا۔ مجھے تو صرف ان کے ایک کمال یعنی شاعری کا ایک ایسا نمونہ پیش کر دینا ہی جس سے خسرو علیہ الرحمۃ

کی خسروی تمام اصنافِ نظم پر من وجہ ظاہر ہو جائے۔

اربابِ فن نے کلام منظوم کی جو قسمیں کی ہیں اُن میں پانچ قسمیں اصل ہیں۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی اور قطعہ پھر ان میں بھی باعتبار مضامین تنوعات گوناگوں پائے جاتے ہیں۔ جن کا بیان اپنے موقع پر آیندہ آئے گا۔ لیکن ناصحانہ، حکیمانہ، عشقیہ، رزمیہ اخلاقی جذبات کی مصوّری اور مناظر کی نقاشی یہ وہ اقسام ہیں جہاں شاعر کی طبیعت کا اصل جوہر کھلتا ہی۔

کلام خسرو اور ہر دَور کے محاسن

خسرو علیہ الرحمۃ میں یہ کمال ہی کہ نظم کی کوئی قسم ایسی نہیں ہی جس میں ان کے قلم کی روانی دریا کی موجوں کی طرح لہریں نہ مارتی ہو۔ اگرچہ ان کا وجود دَورِ ثالث کے شعرا میں پایا جاتا ہی لیکن ان کے کلام کی یہ خصوصیت ہی کہ ہر دَور کے محاسن ان کے کلام میں موجود ہیں۔ سادگی سنگینی و استواری جو دَورِ اوّل کی ممتاز خصوصیت ہی ان کے کلام میں بکثرت اس کے نمونے پاؤگے رنگینی لطافت اور ملائمت جو دَورِ ثانی کا کمالِ ہنر ہی اس آرائش سے بھی کلام خسرو بہ تمام و کمال مزین و مرصع ہے۔ ہر طرح کے اساس مضامین فراوانی و اکثار کے ساتھ خزانۂ خسروی میں پائے جاتے ہیں۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ خسرو کا دَور ایسے زمانے میں آتا ہی جب کہ نظم پوری آرائش سے آراستہ و پیراستہ ہو چکی ہی۔ اسلاف نے ہر طرح کے مضامین کا احاطہ کر لیا ہی زبان بھی

صنائع و بدائع سے مرصع ہو چکی ہی شاعری کی بحث میں ابھی تم پڑھ چکے ہو کہ معانی کی کمی فردوسی نے پوری کر دی. الفاظ میں تراش و خراش اور رنگینی دورِ ثانی کے شعرا کر چکے اب اس تیسرے دور کے لئے کیا رہ جاتا ہی۔ بقول خود امیر خسرو ؎

درمحفلِ وصالت دریا کشند مستاں ۔ چوں دورِ خسرو آمد مے در سبو نماند

باوجود اس تنگی و کشاکش کے یہ صرف خسرو ہی کا کمال ہی کہ نہایت قادر الکلامی سے ایسا سدا بہار چمن کھلا گئے جس کے پھول آج تک نہ کمھلائے اور اُس کی شامہ نواز لپٹ عطر مجموعے کی طرح گوناگوں خوشبو سے اربابِ ذوق کے دماغ کو معطّر کرتی رہی۔

خسرو شاعر گر تھے | اگر خسرو علیہ الرحمہ کی صرف شاعرانہ حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے بحث و نقد کا سلسلہ چھیڑا جائے تو اچھّی ضخیم اور پُر مغز و مفید کتاب طیار ہو سکتی ہی اس لئے کہ کل انواع شاعری پر صرف انھیں کا قلم ہی جس نے حسن و لطافت زور و قوت کے ساتھ سیر کی ہی۔ ان کی اسی ہمہ گیری کو دیکھتے ہوئے ایک سخن شناس جب ان کے مجموعۂ کلام کا امعان نظر سے مطالعہ کرتا ہی تو وہ اس نتیجے پر پُہنچتا ہی کہ خسرو صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ شاعر گر۔ گو یہ اپنی تصانیف کے ہر پڑھنے والے کو شاعر نہ بناتے ہوں تاہم اس میں کوئی کلام نہیں کہ جو شخص فطرتاً شاعری کا مادّہ رکھتا ہی اُس کے اُس مادّے میں یہ ایک تحریک سی ضرور پیدا کر دیتے ہیں۔ چوں کہ نظم کی ہر صنف ان کے کلام میں موجود ہی اور طرح طرح

کے اسلوب سے بیان ہوئی ہی اس لئے جس کی طبیعت جس سے مناسبت رکھتی ہوگی اُس میں ایک جنبش کا پیدا ہوجانا ایک لازمی امر ہی اس حساب سے ان کو شاعر گر کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا ؎

فیض پُہنچاتا ہی ہر اقلیم کو اُس کا قلم　　نفع بخشِ خلق ہی جو کچھ کیا اُس نے رقم

اب ہم بعض نمونے کلام خسروی کے نمونتہً پیش کرتے ہیں تاکہ اس اجمال کی تفصیل ہوجائے اگرچہ ان کا سارا کلام بجائے خود نمونہ ہی جہاں سے چاہو اُٹھا کر دیکھ لو، کچھ انتخاب کرنے کی حاجت نہیں۔ لیکن چوں کہ اس کتاب کے پڑھنے والے کی سہولت اور خسرو کی شاعری سے اُس کی ایک عام واقفیت مقصود ہی۔ اس لئے جا بجا سے مختلف نمونے لے کر یکجا جمع کر دیے جاتے ہیں۔

کلام خسرو کا ناصحانہ پہلو

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہی کہ نصیحت گری بادی النظر میں جس قدر سہل و آسان معلوم ہوتی ہی فی الحقیقت اُسی قدر اہم و معرکتہ الآرا ہی۔ ناصح اگر اُن نکات سے آگاہ نہیں ہی جس سے نصیحت کی تلخی و ناگواری دُور ہو کر گوارا بلکہ خوش گوار ہوجاتی ہی تو ہمیشہ اُس کی نصیحت مقبولیت سے محروم رہیگی بلکہ بعض اوقات اُس کا سننا بھی گراں گزرے گا۔

خسرو علیہ الرحمۃ کے ناصحانہ اشعار میں قطع نظر شاعرانہ صنائع بدائع کے یہ بھی بڑا کمال ہی کہ ہر نصیحت ایسی دل گیر و دل پذیر طرز میں پیش کرتے ہیں کہ بے اختیار دل لبیک کہہ اُٹھتا

ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حکیمانہ آنکھ سے ہر جزوِ عالم پر نظر رکھتے ہیں اور ہر دلچسپ نکتے کا تُلا اثر لیتے ہیں ان کی طبع رسا عجائب عجائب باتیں گھڑتی رہتی ہے۔ یہ ادنیٰ ادنیٰ سی باتوں سے بھی اخلاقی سبق لیتے ہیں اور پھر ان کو نہایت قبول صورت میں اپنے ناظرین کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ تعلیم اخلاق کا دامن ان کے ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹتا اور پند و نصائح کا دروازہ اُن کے ہاں برابر کھُلا رہتا ہے۔ قدم قدم پر پند و نصائح کے موتی رولتے جاتے اور سلکِ نظم میں اُسے پروتے جاتے ہیں۔

مثال اول تواضع و خاکساری

مثلاً انھیں یہ کہنا ہے کہ انسان کو فرائضِ انسانیت سے غفلت نہ چاہیئے باوجود بے شمار دولت کے بھی متواضع و خاکسار ہی رہنا زیور انسانیت ہے کام وہی کرنا چاہیئے جس میں صلاح و فلاح ہو۔ ان مضامین کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

سرمایۂ مردمی مکن گم | کز مردمی ست نورِ مردم
گرچہ زرت از عدد بود بیش | درویش نواز باش و درویش
در ہرچہ ترا شمار باشد | آں کن کہ صلاحِ کار باشد
بینائیِ عقل پیش می دار | بینا شو و پاسِ خویش میدار

مثال دوم ہنر کی رغبت اور کاہلی کی برائی

یا مثلاً انھیں ہنر کی طرف مائل کرنا ہے تو اپنے عملہ کو بے کار و معطل رکھنے سے منع کرنا ہے تو اُس کو اس طرح کہتے ہیں ؎

آں کو بہ ہنر نہ شد طلب گار | چوں بے ہنراں بود قفا خوار
آں خواجہ کہ کاہلی ست خویش | کاہل ترا ز دست آرزو یش

جاں کُن کہ غرض بہ چنگ یابی　　　کاں کُن کہ گہر بہ سنگ یابی

زاندیشہ دقیقۂ نغز خیزد　　　وز بجستن آرد مغز ریزد

یک شاخ کہ میوۂ دہد تر　　　بہتر ز ہزار باغِ بے بر

مثال سوم۔ بلندی ہمت و پستی حرص

یا مثلاً اُنھیں ہمت کی بلندی اور حرص و پست ہمتی کی مذمت مقصود ہی تو اُسے اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

ہیچ کسے رہ سوئے بالا نیافت　　　تا قدم از ہمتِ والا نیافت

پرّیِ دل سوئے بلندی کشد　　　پستیِ ہمت بہ نژندی کشد

تشنگی آبِ رود ز آب جو　　　تشنگیِ چشم برد آبرو

دیکھو یہ پیش پا اُفتادہ مضامین ہیں۔ شعرائے سلف انھیں طرح طرح سے بیان بھی کر چکے ہیں پھر اب اس انداز سے بیان کرنا کہ طبائع متوجہ ہو جائیں اور سامع اُسے فرسودہ سمجھ کر غفلت نہ کرنے پائے بیان کا کمال نہیں ہی تو کیا ہی؟ ہر شخص جانتا ہی کہ کاہلی اچھی چیز نہیں مگر خسروؔ نے جس شان سے اس کی بُرائی دکھائی ہی وہ ایک بے نظیر فلسفہ ہی ؎

آں خواجہ کہ کاہلی ست خویش　　　کاہل تر از دست آرزویش

یعنی قوائے عملیہ کے تعطل کا اثر جذبات پر پڑتا ہی انسان جب سُست و کاہل ہو جاتا ہی تو یہی نہیں کہ کام نہیں کرتا ہی بلکہ آرزو و تمنا حوصلے و ولولے یہ سب فنا ہو جاتے ہیں نہ دل میں اُمنگ باقی رہتی ہی نہ حوصلہ۔ جس قدر اس شعر پر زیادہ غور کیا جائے

اُسی قدر اُس کا لطف زیادہ آئے گا۔ دیگر مضامین کا بھی یہی حال ہے کہ باتیں وہی معمولی ہیں جنھیں ہر شخص جانتا ہے۔ مگر اُن سے جو نتائج نکالے ہیں یا جو اُن کی مثالیں دی ہیں یا جس انداز سے الفاظ باہم ترکیب و ترتیب دئیے ہیں اور بیان کا جو اعجوبہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے ان باتوں نے قدیم خیالات کو ایک نیا جامہ پہنا دیا ہے۔ اور یہی شاعر کا اصل کمال ہے۔

مثال چہارم شرافت انسانی اور ایک جاں نواز نصیحت

دیکھو ایک جگہ اسی بات کو کہ انسان کو منہیات شرعیہ سے بچنا چاہئیے اس کے عبادات و معاملات میں فتور نہ آنا چاہئیے کس دردمندی سے سمجھاتے ہیں۔ پہلے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کو جتاتے ہیں عالم علوی سے عالم سفلی تک کی اشیاء کو اُس کا خدمت گزار و مطیع ثابت کرتے ہیں پھر اُس دولت کی جو بارگاہ خداوندی سے خاص اُس کے لئے مخصوص ہوئی ہے یاد دلاتے ہیں۔ اس قدر کہہ لینے کے بعد اب نصیحت کرتے ہیں اور صرف ایک مصرعہ میں ایک دفتر کا دفتر کہہ جاتے ہیں۔ اس مضمون کے اشعار التقاط کرکے یہاں درج کئے جاتے ہیں ؎

اے ز ازل گوہر پاک آمدہ	گوہرِ تو زیورِ خاک آمدہ
چنبرِ نہ چرخ بسے بجنت خاک	تا تو بروں آمدی اے دُرِّ پاک
آں خلفے تو کہ زروزِ نخست	کون بہ مہمانیِ شش روزہ تست
خود ز پدر گرچہ کنوں آمدی	با پدر از جملہ بروں آمدی
دفترِ معنی نہ زبر خواندۂ	تختۂ اسماء ز پدر خواندۂ

عرصۂ عالم بہ مسافت ترا است — دولتِ عالم بہ خلافت ترا است
حبلِ وریدِ تو فگندہ بلند — در شرفِ کنگرۂ اللہ کمند
نورِ تو ہنگامۂ انجم شکست — دستِ تو تسبیحِ ملائک گسست
جانِ جہانِ ہمہ عالم توئی — وانچہ نگنجد بجہاں ہم توئی
تو شہے اقلیم تو ہر دو سرائے — تو ملکے تختِ تو شد چار پائے
گنجِ خدا را تو کلید آمدی — نہ از پےِ بازیچہ پدید آمدی
چرخ کہ از گوہر احسانت ساخت — آئینۂ صورتِ رحمانت ساخت
آئینہ زیں گونہ کہ داری بہ چنگ — آہ ہزار آہ کہ داری بہ زنگ

اشعار مذکورۂ بالا میں جو صنائع عجیبہ و تلمیحات لطیفہ ہیں اُس کے بیان کا کہاں موقع۔ شعر و سخن سے اگر کچھ بھی مذاق آشنا ہی تو خود ہی سمجھ لو۔ کرامتِ انسانی کا جو فلسفہ بیان کیا ہی وہ شاعر کے غواص سخن و شناور فن ہونے کی دلیل ہی۔ اس حکیمانہ انداز سے اس بیان کی ابتدا و نہایت کی گئی ہی کہ جس کی داد دی نہیں جاسکتی۔ صرف اسی ایک پہلو کو لو کہ جس طرز سے اس نصیحت میں مرصع کاری کی گئی ہی اس سے فلسفۂ نفسیات پر خسرو کا کیسا ملکہ ظاہر ہوتا ہی۔ عالم فلسفۂ نفسیات سے یہ امر مخفی نہیں کہ جب کسی کے ساتھ محقرانہ برتاؤ و رسوا کن انداز سے گفتگو کی جاتی ہی تو اُس سے مخاطب میں قطع نظر نفرت کے ایک طرح کی پست ہمتی او پست ہمتی سے شریف جذبات کا فنا اور اُس کے فنا سے کمینہ عادتوں کا نشو و نما شروع ہو جاتا ہی۔

برخلاف اس کے اگر کسی کی عادات رذیل بھی ہوں لیکن جماعت اور اُس کے احباب اگر اُس سے اس طرح ملنا شروع کریں کہ کسی کے انداز میں یہ نہ پایا جائے کہ وہ اُسے رذائل سے آلودہ جانتا ہے اور اخلاقی حیثیت سے اُسے حقیر سمجھتا ہے تو یہ طریقہ اُسے شریف عادات کی طرف مائل کر دے گا۔

تاریخ کی کتابوں میں ایسے واقعات بہت ملیں گے جن سے فلسفۂ نفس کے اس اہم مسئلہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس مقام پر خسرو علیہ الرحمہ کی اس طرز خاص سے نصیحت گری بھی اسی نکتہ کو مشعر ہے۔

پہلے فرزند آدم کی کرامتوں کا ایسا پُر جلال و جمال مرقع کھینچا ہے کہ بے ساختہ دل اُسے دیکھ کر کھنچ جاتا ہے۔ پھر آخر کے دو شعر عجب کمال کے نمونے ہیں ؎

چرخ کہ از گوہر احسانت ساخت ۔۔۔ آئینۂ صورتِ رحمانت ساخت

آئینہ زیں گونہ کہ داری بہ چنگ ۔۔۔ آہ ہزار آہ کہ داری بہ زنگ

پہلے شعر کا مدعا یہ ہے کہ حقیقتاً انسان تو وہی ہے جس کے دیکھنے سے غافل کو بھی خدا یاد آجائے انسان کا مجسمہ ایک آئینہ ہے جس میں رحمان کی صورت دکھائی دیتی ہو۔ اب اگر ایسا آئینہ کسی کے پاس ہو اور اُس کی غفلتوں سے وہ زنگ آلود ہو جائے تو یہ کیسی مصیبت عظمیٰ ہے

ع آہ ہزار آہ کہ داری بزنگ

صرف اس ایک مصرع کے زورِ بیان اور اسلوب ادا کو دیکھو بلاغت و جوش کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

مثال پنجم - جوہر ذاتی چاہیئے نہ آبائی

ایسے ایسے مضامین کو کہ صرف تمنا پستی سے بلندی تک نہیں پہنچا سکتی دوسرے کے بھروسے کام نہیں چلتا استخوان فروشی دوں ہمتی ہی کچھ ایسے دل میں گھر کر جانے والی ادا اور روانی سے بیان کر جاتے ہیں کہ بے خواستہ واہ واہ نکل آتی ہی ؎

پست نہ گردد بہ تمنا بلند　　گرچہ بہ انگشت کند پا بلند
تکیہ چہ آری بعصاے کساں　　زندہ نشد کس بہ بقاے کساں
چند زبادِ پدر و جد پری　　باد بود ہرچہ نہ از خود بری

خسرو کا تصوف

تصوف کے اہم و معرکۃ الآرا مسائل کو جس صفائی و روانی سے اُنھوں نے نظم میں بیان کیا ہی اُس سے قطع نظر کمال شاعری زور کلام اور حسن ادا کے یہ بھی معلوم ہوتا ہی کہ اس راہ کا منزل شناس کہہ رہا ہی۔

اکثر و بیشتر شعرا نے یہ سمجھا کہ مثل گل و بلبل اور معاملات ناز و نیاز کے مسائل تصوف بھی صرف زبان و بیان چاہتے ہیں حالانکہ بقول سعدی شیرازی ؎

قدم باید اندر طریقت نہ دم　　کہ اصلے ندارد دمِ بے قدم

ایسے شعرا جو خود مقامات تصوف کے طے کرنے والے نہیں ہیں صرف الفاظ و مصطلحات صوفیہ لیکر اشعار میں نظم کر دیا کرتے ہیں۔ اہل دل گروہ اُسے خوب پہچانتا ہی کہ یہ قال ہی حال نہیں۔ مولنا رومی علیہ الرحمہ ایسے ہی شعرا کے متعلق مثنوی شریف میں فرماتے ہیں ؎

لفظِ درویشاں بدزدد مردِ دوں　　تا بخواند بر سلیمے ایں فسوں

خسرو علیہ الرحمہ جہاں کہیں مسائل تصوف بیان کرتے ہیں وہ اُن کی حالت کا آئینہ ہوتا ہے
اُس پر بیان کا ایک خاص زور وضاحت کلام کا ایک لطیف انداز ایسا ہوتا ہے کہ حسن بیان
پر بلاغت، بلاغت پر فصاحت اور فصاحت پر ہزار شیرینی قربان ہے۔

تصوف کا پہلا شعبہ یعنی الٰہیات

مسائل تصوف میں الٰہیات کا حصہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ خواجہ فریدالدین عطارؒ
حکیم سنائی، مولانا رومی، نظامی گنجوی ان سے قبل اور سعدی ان کی
حیات میں اس طرح ان مسائل کو بیان کر چکے تھے کہ عقل حیران تھی کہ اب ان مسائل
کے بیان کا کون سا جدید عنوان ہوگا۔ لیکن خسرو علیہ الرحمہ نے جب انھیں مسائل کو بیان
کیا ہے تو معلوم ہوا کہ بیان کا یہ پہلو خسرو کا منتظر تھا۔ مثلاً یہ مسئلہ کہ انسان جو عالم امکان
میں سب سے افضل ہے اور اس کی ترقی کی کوئی انتہا نہیں یہ اگر اس کی کوشش کرے کہ
حقیقتِ الٰہ سے آگاہ ہو جائے تو یہ ناممکن و محال ہے۔ علمِ ممکن حقیقت واجبہ کا احاطہ تو
کہاں کر سکتا ہے وہاں تک اس کی رسائی بھی محال ہے۔ اسی مضمون کو سعدی نے کہا ہے

توان در بلاغت بسحباں رسید — نہ در کنہِ بیچونِ سبحاں رسید

لیکن اب خسرو کو دیکھو کہ کس نئے انداز سے بیان کرتے ہیں ؎

ہر چہ از تو گماں برم بہ چونی — آں من بوم و تو زاں برونی

انسان کی عقل جد و جہد کرتی ہے مقدمات ترتیب دیتی ہے۔ حقائق اشیاء سے بحث کرتی
ہے۔ صفات و خواص سے آگاہ ہوتی ہے۔ قدم و حدوث کا مسئلہ تحقیق کرتی ہے۔ ان سب
مراحل کے بعد ایک نتیجے پر پہنچتی ہے اور چاہتی ہے کہ اُسے حقیقۃ الٰہ قرار دے لیکن جب

اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ساری گردشِ پرکار تھی دائرہ امکان سے ذرہ برابر بھی قدم آگے نہ بڑھا تو بیساختہ کہہ اُٹھتا ہے سبحان ربک رب العزت عما یصفون - اب اس ایک شعر کو دیکھو چند سادے الفاظ میں کس وضاحت سے آیۃ کریمہ کی معنی خیز تفسیر کی ہے۔ کس طرح دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے۔ یہ ہے زورِ کلام اور حسنِ بیان۔

دوسری مثال اور دوسرا مسئلہ

اس عقیدے کو کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے اور جو کچھ عالم کون میں ظاہر ہوتا ہے وہی مقتضائے مصلحت ہے۔ وجود وعدم دونوں اُس کے تحتِ حکم ہیں۔ نیستی وہستی کوئی بھی حکمت سے خالی نہیں، کس صفائی وروانی سے نظم کا جامہ پہنایا ہے ؎

داندۂ توئی ہرچہ راز ست — سازندہ توئی ہرچہ ساز ست
از بودنی ہرچہ بود دارد — از تو قسمِ وجود دارد
وانچہ از عدم ست نام او نیز — از حکمتِ تست ماندہ ناچیز
بودِ ہمہ گشتہ از تو موجود — حکمِ تو رواں بہ بود ونابود

تیسری مثال اور تیسرا مسئلہ

صرف عقل علتہ معرفت باری تعالیٰ ہے یا نہیں اس کا یوں جواب دیتے ہیں ؎

لوامع صفتش ہست چشم پوشِ عقول — چو آفتاب کے نورش حجابِ ابصار ست
حکیم گفت شناسم بعقل یزداں را — زہے کمالِ حماقت وہ ایں چہ گفتار ست

کنہِ باری تعالیٰ تک عرفا کی رسائی ہے یا نہیں اس کا کیسا خوبصورت جواب دیا ہے ؎

بکنہِ حق نرسد عارف ارچہ دانندہ ست ۔۔۔ برآسماں نہ پرد جعفر ارچہ طیارست

چوتھی مثال اور چوتھا مسئلہ

اس مسئلہ کو کہ دنیا کی ہر شئے سے معرفتِ حق حاصل ہے یوں بیان کرتے ہیں ؎

بہر صحیفہ برگ ست نوحکمتِ او ۔۔۔ نوشتہ چوں لقبِ شہ بروئے دینارست

اسی مضمون کا شعر سعدی علیہ الرحمہ کا بھی نہایت مشہور ہے ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ۔۔۔ ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

تصوف کا دوسرا شعبہ

تصوف میں الٰہیات کے بعد وہ مسائل ہیں جن کا تعلق سالک کی ذات سے ہوتا ہے۔ مثلاً رضا و تسلیم، ریاضت و مجاہدہ، عشق و محبت، ذکرِ قلب و حیاتِ دل وغیرہ وغیرہ۔ چند نمونے اس شعبۂ تصوف کے بھی ملاحظہ ہوں۔

مثالِ اوّل

انسان کو راضی برضا رہنا چاہیے اور کسی حالت میں شریعت کے دائرہ سے قدم باہر نہ نکلنے پائے۔ ان باتوں کو یوں سمجھاتے ہیں ؎

آنچہ مقدر شدہ ہست چوں نبود بیش و کم ۔۔۔ گر برسد خرمیم ور نہ رسد باک نیست

حرص بجا کت کشد شارعِ دیں گیر زانکہ ۔۔۔ بے روشِ مصطفٰے راہ بر افلاک نیست

مثالِ دوم

ریاضت کی تصوف میں کتنی ضرورت ہے بغیر مجاہدہ کچھ نہیں ہوتا قدم قدم پر ایثار و قربانی کرنا چاہیے۔ اسے عمدہ مثالیں دے کر نہایت خوبصورتی سے سمجھاتے ہیں ؎

گاہِ وغا در صفِ مردانِ مرد ۔۔۔ نام نبرد آں کہ خدنگے نخورد

طبل کہ سوراخ کنندش بہ پوست — بہر برون رفتنِ آوازِ اوست

تا نشود خستہ بصد جا دلت — نورِ حقائق نشود حاصلت

چہرۂ سنگ ار نہ کنی گو بگو — دانہ کجا سود شود جو بجو

مثالِ سوم | دل کیا ہے۔ اس کی کیا قدر ہے۔ اس کی زندگی کیا ہے۔ اس کی موت کیا ہے ان امور کو جس شاعرانہ پیرایہ میں اور جس محققانہ طریقے سے اُنھوں نے بیان کیا ہے اُنھیں کا حصہ ہے کہتے ہیں ؎

چوں تنِ آدم بگل آراستند — خانۂ جاں بہرِ دل آراستند

آدمی آن ست کہ در وے دل ست — ورنہ علف خانۂ آب و گل ست

دل نہ ہماں قطرۂ خون ست و بس — کز خور و آشام برآرد نفس

دل اگر ایں مہرۂ آب و گل ست — خر ہم از اقبالِ تو صاحب دل ست

لیک دل آں شد کہ ہوائے در وست — وز طرفے بوئے وفائے در وست

زندہ بجاں خود ہمہ حیواں بود — زندہ بدل باش کہ عمر آں بود

زندگیِ دل چہ بود؟ سوز و چاک — زندگیِ کالبدی چیست؟ خاک

غمزدہ بہ جاں کہ غم اندوز نیست — سوختہ بہ دل کہ در و سوز نیست

سردیِ دل مردگیِ دل بود — خوں چو بہ تن سرد شود گل بود

مثالِ چہارم | عشق کی کیا شان ہے عشاق کی کیا روش ہے۔ عشق کا کیا درجہ ہے ان باتوں کو اس وجد و کیف میں بیان کرتے ہیں کہ اگر ذرا غور کرو تو دل روحانی سرور سے

یکیف ہو جائے ؎

عشقِ زبانی زہر افسردہ پرس		سوزش آں از دلِ آزردہ پرس
ذوقِ نمک گرچہ زباں را خوش ست		چوں بجراحت فگنی آتش ست
موم بود دل کہ ز عشق ست زار		کو بگدازاو فتد از یک شرار
شعلۂ عشق چو شد خانگی		سوختہ شد عقل بہ پروانگی
زندہ نہ آنست کہ جانے دروست		اوست کہ از عشق نشانے دروست
جاں کہ نہ عشقش بود آں بازی ست		عشق نہ بازی ست کہ جان بازی ست
چند بری عشق بہ بازی پسر		عشق دگر باشد و بازی دگر
مرد کہ در عشق ز جاں فرد نیست		گر صفِ کافر شکند مرد نیست
چوں تو فغاں از سرِ خارے کنی		بہ کہ جز از عشق شمارے کنی

مثال پنجم | مرد وہی ہے جو مصائب میں گھبرا نہ جائے۔ ابتلا و امتحان کے میدان میں جرأت و استقامت سے مقابلہ کرے اور آخر میں کامیاب ہو کر رہے ؎

مرد نہ ترسد ز فقر شیر نہ ترسد ز زخم		مذہب عیّار نیست بیم عسس داشتن
عذرِ عروساں بود دعوئ مردی و بس		گاہ وغا پیشِ خصم روے بہ پس داشتن

اسی مضمون کو ایک دوسری جگہ یوں لکھتے ہیں ؎

شیر شو و صید را در تہِ چنگال کش		مرد شو و خصم را بر سرِ میداں طلب

تصوف کا تیسرا شعبہ | سب سے وسیع ترین تصوف کا وہ حصہ ہے جس میں عشقیہ روش کی

آمیزش ہوتی ہے۔ اس کی بنیاد سعدی علیہ الرحمۃ نے ڈالی تھی جس پر ایک قصرِ عالی شان
خسروِ اقلیم سخن نے تعمیر کر دیا۔

تخیل کا کمال اور کلام میں درد — بیان کی اس صنف میں خصوصیت کے ساتھ ان کا تخیل بہت ہی بلند پایہ رکھتا ہے۔ اپنے تخیل کو یہ جسمانی جامہ پہنا کر اس طرح پیش کر دیتے ہیں جس سے ان کا تخیل تخیل باقی نہیں رہتا بلکہ وہ گوشت و پوست و استخواں سے درست ملکوتی روح پھونکی ہوئی مورتیں ہوتی ہیں۔ تمثیلاً ذیل کے اشعار دیکھو ؂

مثال اول

گل اندر خوابگاہِ نرگس افتد چوں زد بوئے — ولیکن عشق بازاں را خسک در خوابگاہ افتد
ز حیثیت کاروانِ صبرِ من تاراج کافر شد — مسلماناں کسے دیدست کاندر شہر راہ افتد

مثال دوم

فصلِ نوروز کہ آورد طرب بر ہمہ خلق — چشمِ بد دور مرا موسمِ باراں آورد
ہر سحر باد کہ بر سینۂ من کرد گزر — در چمن بوئے کباب از پئے مستاں آورد

انھیں اشعار کو دیکھو تخیل کیسا اعلیٰ ہے اور پھر کلام میں کس طرح درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے کہ دل تڑپ کر رہ جاتا ہے یہ شاعرانہ حیثیت سے بھی اعلیٰ مظہر ملکوتی عالم میں حسن و عشق حقیقی کے خیالات میں محو اور دوسرے نازک تر جذبات و لطائف میں غرق زندگی بسر کرتے تھے اور ان کے لئے بقول انہیں کے ؂

(یک بلبلِ خوش نوائے و دل کش — بہتر ز دو صد کلاغِ ناخوش) ہے۔

صاحب سیر الاولیا لکھتے ہیں کہ اوائل میں جب امیر خسرو شعر کہتے تو اس کو اپنے شیخِ طریقت حضرت سلطان المشائخ (رضی اللہ عنہ بحرمتہ) کو دکھایا کرتے تھے۔ ایک

روز حضرت نے فرمایا کہ "طرز صفاہانیاں بگو یعنی عشق انگیز و زلف و خال آمیز۔ اُسی روز سے خسرو زلف و خال کے پھندے میں ایسے پھنسے کہ تمام ماسوی اللہ سے بے نیاز ہو گئے اور آج تک اُن کا عاشقانہ کلام مردہ دلوں کے لئے آب حیات کا کام کر رہا ہے۔ ثبوت کے لئے ان کے کلام کا دفتر بھرا پڑا ہے۔ جہاں سے چاہو اُٹھا کر دیکھو ایک چھوڑ ہزار ثبوت پاؤ گے۔ یہاں صرف دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں ؎

مثال سوم

بروے یار پیشِ دیگراں دہ جلوہ بستاں را
مرا بگزار تا می بینم آں سروِ خراماں را
گرفتارِ خیالات لبش گشتم یقیں باشد
اثر ہر کہ مگس در خواب بیند شکرستاں را
مپرس از من کہ چوں می باشد آخر جانِ غمناکت
کہ من دیریست کز یادش فراموش کردہ ام جاں را

مثال چہارم

تنِ پاکت کہ زیرِ پیرہن ست — وحدہ لا شریک لہ چہ تن ست
اندر آ در میانِ جاں بنشیں — کہ تو جانی و جانِ من بدن ست
تا زیم در غمِ تو جامہ درم — وز پسِ مرگ نوبتِ کفن ست
دلِ خسرو خوش ست با تنگی — کہ مرا یادگار زاں دہن ست

کلام میں رنگینی کی وجہ

اس رنگینی کی وجہ صاف ہے۔ آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد۔ ان کو اہل دل گروہ سے واسطہ تھا۔ ناسوت و ملکوت جبروت و لاہوت اور

ان چاروں سے ماورا جو عالم ہیں ان کی سیر سے ان کی چشم بینا بصارت حاصل کئے ہوئے تھی اور انھیں عالموں کی آب و ہوا میں ان کے قوائے باطنی نے پرورش پائی تھی۔ دل خستہ تھا اور آتشِ عشق سے برشتہ زبان صرف دل کی ترجمان تھی اور بس خسرو دل کی برشتگی و سوختگی کچھ ازل سے ہی لیکر آئے تھے جس کو چشتی نسبت نے اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ اُس پر شیخ طریقت حضرت سیدنا نظام الدین اولیا سلطان المشائخ محبوبِ الٰہی (رضی اللہ عنہ بحرمتہ) کی توجہ ظاہری و باطنی جب پڑتی تو اُس آتش کی شعلہ فشانی افسردہ دلوں کو اور بھی جلا کر خاکستر کر دیتی۔

لطائفِ اشرفی، سفینۃ الاولیا، سیر الاولیا، سبع سنابل، نفحات الانس وغیرہ میں خسرو علیہ الرحمہ کے شرر افشاں دل کے متعلق حضرت سلطان المشائخ کے یہ کلمات نقل کئے ہیں:۔

ایک بار آپ نے فرمایا کہ "کل قیامت میں جب خداوند عالم پوچھے گا کہ میرے دربار کے لئے کیا تحفہ لائے تو میں خسرو کو پیش کر دونگا" پھر کسی وقت ارشاد ہوا کہ "کل قیامت میں ہر ایک شخص کسی شے پر ناز کریگا اور اے ترک میں تیرے سوزِ سینہ پر ناز کرونگا" اکثر دعا میں یوں فرماتے کہ "الٰہی بسوزِ سینۂ ایں ترک مرا بہ بخش" اور ایں کا اشارہ حضرت خسرو کی طرف فرماتے۔ اللہ اللہ وہ کیا دل تھا اور دولت عشق سے کیسا مالا مال تھا۔

اسی سوز و گداز نے خسرو کو حضرت سلطان المشائخ کا ایسا محبوب بنا دیا تھا کہ

آپ اکثر فرماتے کہ "اے ترک میں سب سے تنگ آ جاتا ہوں یہاں تک کہ کبھی خود اپنے آپ سے بھی تنگ آتا ہوں لیکن تجھ سے کبھی تنگ نہیں آتا"، کبھی یوں اظہارِ محبت فرماتے کہ "اگر ایک قبر میں دو شخص مدفون ہو سکتے تو میں وصیت کرتا کہ خسرو کو میری قبر میں دفن کرنا"

حضرت سلطان المشائخ کا یہ شعر ؎

گر برائے ترکِ تُرکم آرہ بر تارک نہند ترکِ تارک گیرم و امّا نہ گیرم ترکِ تُرک

اسی محبت کو مشعر ہے۔ ایک اور آپ کی رباعی کلام خسرو کے مدح میں ہے جس سے ان کے کلام کی مقبولیت معلوم ہوتی ہے وہو ہذا ؎

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست ملکیتِ ملکِ سخن آں خسرو راست

آں خسرو ماست ناصر خسرو نیست زیرا کہ خدائے ناصر خسرو ماست

دربارِ شیخ سے خسرو کو ترک اللہ کا لقب عطا ہوا تھا۔ اور اکثر صرف لفظ ترک سے خطاب ہوتا خسرو علیہ الرحمہ کو اس خطاب پر ناز تھا۔ چنانچہ ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

بر زبانت چوں خطابِ بندہ ترک اللہ رفت دستِ ترک اللہ بگیر و ہم باللّٰہش سپار

یہ چند کلماتِ طیبات جو حضرت سلطان المشائخ کے نقل کئے گئے ہیں ان سے مدعا یہ ہے کہ ایک وہ شخص جو فطرتاً آتشِ عشق دل میں دبی رکھتا ہو جب اُسے کامل و مکمل شیخ طریقت ملجائے اور پھر شیخ کی محبت و عنایت اُس پر ایسی ہو کہ مرید کے مرتبے سے مرادُ کے مرتبے میں پہنچ جائے تو اُس کے مقاماتِ سلوک و تصوّف کا کیا پوچھنا اور اُس کے کلام کی تاثیر کا کیا کہنا۔

تاثیر کلام | اہل دل جو کچھ کہتا ہے اُسے ایک اہل دل ہی سمجھ سکتا ہے۔ تزک جہانگیری و دیگر تذکرہ مثل داغستانی وغیرہ میں یہ روایت معتبر موجود ہے کہ جہانگیر نے صوفیہ کی دعوت سماع کی مجلس گرم ہوئی۔ قوال نے امیر خسرو علیہ الرحمہ کا یہ شعر گانا شروع کیا ؎

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے   من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

مولانا علی احمد مہر کن نشانی تخلص اُس وقت وجد و رقص میں آئے۔ جہانگیر نے اس شعر کا مطلب پوچھا مولانا اُسی طرح رقص کرتے ہوئے جہانگیر کے سامنے گئے اور فرمایا کہ ہنود اپنی کسی عید میں عورت و مرد سب کے سب جوق درجوق نہایت شان و شوکت سے دریا کنارے جمع ہو رہے تھے اور بموجب اعتقاد غسل کرکے ثواب حاصل کر رہے تھے حضرت سلطان المشائخ بھی اُس وقت سیر کرتے ہوئے اُس طرف گزرے۔ اُن کے اس شغف مذہبی و انہماک کو دیکھ کر آپ نے خسرو علیہ الرحمہ کی طرف جو ہمرکاب تھے اشارہ کرکے فرمایا ؎

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

اُس وقت ٹوپی حضرت سلطان المشائخ کے سر مبارک پر اتفاقاً کج تھی۔ خسرو علیہ الرحمہ نے فوراً دوسرا مصرع

من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

عرض کرکے پورا شعر کر دیا۔ مولانا علی احمد روایت ختم کرکے چاہتے تھے کہ اپنے سر پر ہاتھ لے جائیں تاکہ ٹوپی اپنی اُسی طرح کج کرکے جہانگیر کو دکھائیں کہ اس شان سے کلاہ مبارک حضرت سلطان المشائخ کی کج تھی۔ لیکن ہاتھ کا اُٹھانا تھا کہ وجد کا وہ عالم طاری ہوا کہ ایک

نعرہ کے ساتھ جاں بحق تسلیم ہو گئے۔

سیر الاولیا جس کے جامع امیر خُرد خلیفہ حضرت سلطان المشائخ ہیں۔ اُس میں ایک نقل لکھی ہے کہ ایک روز حضرت سلطان الاولیا محبوب الٰہی (رضی اللہ عنہ بحرمتہ) کے حضور میں امیر خسرو کے صاحبزادہ نے امیر کی ایک غزل پڑھنی شروع کی۔ جب وہ اس شعر پر پہنچے کہ ؎

خسرو تو کیستی کہ در آئی دریں شمار   کیں عشق تیغ بر سرِ مردانِ دین زدہ است

حضرت سلطان المشائخ کی روتے روتے یہ حالت ہوئی کہ آپے سے گزر گئے۔

اسی سیر الاولیا میں ایک وقت کی اور نقل لکھی ہے کہ امیر خسرو خود سلطان جی کے حضور میں اپنی ایک غزل پڑھنے لگے جونہیں اُنھوں نے یہ شعر پڑھا ؎

رخ جملہ را نمود و مرا گفت تو مبیں   زیں ذوق مست و بیخبرم کیں سخن چہ بود

حضرت سلطان المشائخ نے گوشۂ چشم سے (کہ چشمۂ محبت تھا) خسرو کی جانب دیکھا اور بیخود ہو گئے۔

الغرض ایسی بہت سی معتبر روایتیں ملتی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل دل گروہ میں خسرو کا کلام کیا مرتبہ رکھتا ہے۔

خسرو کی غزل سرائی | اس میں کچھ شبہ نہیں کہ غزلیات کے اُن انقلابات و ایجادات کے سبب سے جو سعدی نے شاعری کی اس صنف میں کئے تھے خسرو بہت کچھ سعدی کے مقلد و متبع ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سعدی سے قبل نظم کے لئے بہت سے کام تھے۔ صرف اوقات فرصت میں عشق و عاشقی اور اُس کے لوازم سے تفریح کر لی جاتی تھی اور باقی اوقات دوسرے کاموں کے لئے تھے۔ قدما میں تو غزل کوئی نظم کی قسم ہی نہ تھی۔ تشبیب میں کچھ عاشقانہ مضمون

ادا ہوجاتے تھے۔ آخر دورِ قدما میں غزل نے اپنا مستقل وجود اختیار کیا لیکن اُن غزلوں کا یہ رنگ تھا کہ چمن سے گزرے ایک نگاہ پھولوں کے خوش رنگ تختے پر بھی ڈالی اور بڑھ گئے۔ اچھی صورت سامنے آگئی۔ آنکھیں ٹھنڈی ہوگئیں۔ کبھی کبھی دل میں ایک گدگدی سی ہوگئی اور بس۔ جام و صراحی محفل میں رکھی گئی تو شاعری نے دو ایک گھونٹ سے تبدیلِ ذائقہ کرلیا۔ یہی انداز دوسرے دور تک رہا۔

لیکن تیسرے دَور میں نظم محض تفریح کے لئے رہ گئی۔ جوش اور ولولے ٹھنڈے ہوچکے تھے۔ اصل مردی مٹ رہی تھی۔ اس لئے اس دَور میں نظم اور کاموں سے فارغ تھی۔ صرف ایک غزل سرائی تھی جس سے بزمِ سخن کی گرمی تھی۔ زبان زیادہ منجھ کر صاف ہوگئی تھی۔ سعدی اسی تیسرے دَور کے رنگین بیان شاعر تھے لیکن یہ صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک عالم و ولی کامل بھی تھے۔ اُنھوں نے غزل میں تصوف کی آمیزش کی اور نہایت لطف سے حقائق و واردات قلبیہ کو غزل میں کہنا شروع کیا۔ عشق و حسن کے راز و نیاز اور اُس پر تصوف کی چاشنی پھر زبان کی صفائی و شیرینی۔ کلام میں پختگی و گھلاوٹ ان چیزوں نے سعدی کو غزل کا امام بنا دیا۔

خسرو بھی اسی دَور میں مسندِ شاعری پر جلوہ افروز ہوئے۔ قاعدہ ہے کہ اگر کسی زمانے میں کسی ناظم یا ناثر کا طرز اہلِ زمانہ کے مذاق و خیال کے مطابق ہو تو پھر وہی طرز رائج الوقت و عام پسند ہوجاتا ہے اور خواہی نخواہی اُس زمانے کے ناظم یا ناثر کی نظم و تحریر کا جزو لاینفک بن جاتا ہے اور رفتہ رفتہ بلا آورد ویسی ہی عبارات مضامین و خیالات ہر ایک ذی جوہر کے

قلم سے نکلنے لگتے ہیں۔ خاصۃً جب کہ اُس ایجاد میں واقعی پاکیزگی اور لطف بیان بھی ہو تو پھر اُس کی ہمہ گیری کا کیا پوچھنا۔

سعدیؔ جن کے عہد پیری میں خسروؔ کی شاعری جوان ہوئی ہو کچھ اس شیرینی و حلاوت سے شیراز میں بیٹھے ہوئے غزل کی نغمہ سرائی کر رہے تھے کہ ان کی اس تازہ روش نے اپنا سکّہ بٹھا رکھا تھا۔ عام مذاق کی پسندیدگی گرویدگی کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ جو جو انقلاب و ایجاد کہ اس صنف میں اُنہوں نے کئے وہ مثل عناصر کے ضروری مان لئے گئے تھے۔ اور حق تو یوں ہو کہ سعدی کی غزل گوئی اسی کی مستحق تھی اور ہو۔ پس خسرو جیسا صحیح مذاق رکھنے والا خلقی شاعر کیوں اُسے نمونہ نہ بناتا۔ لیکن اسی کے ساتھ جہاں سعدی کی تبعیت ضروری مان لی وہاں اپنے اختراعات و اضافات کا بھی ایک کافی ذخیرہ فارسی داں عالم کے لئے چھوڑ گئے۔

صنف غزل میں خسرو کے اضافے

غزل کی صنف میں کس طرح کے اضافے ہیں جو خاص دماغ خسرو کے مرہون ہیں اُن کی مجمل فہرست یہ ہو۔ بحروں کی موزونی، تشبیہ و محاورات کی جدت، بیان کا اعجوبہ اسلوب۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن سے غزل میں جان پڑجاتی ہو۔ غزل کا کمال یہ ہو کہ درد، سوز و گداز، شکستگی و نیاز، عشق کی ہنگامہ آرائی، حسن کی دلکشی و دلربائی، اس طرح عام محاورہ اور روزمرہ کی بول چال میں ادا ہو جس میں کسی طرح کی پیچیدگی نہ پائی جائے۔ ہاں اسلوب بیان ایسا ہو جس سے دل شگفتہ ہو جائے۔ تشبیہ ایسی لطیف ہو کہ جذبات میں ہلچل پڑجائے۔ واقعات عشق اس طرح کہے جائیں کہ سننے والے کو بھی عاشق

پر رحم آجائے۔ غزل میں شاعر کا بس یہی کمال ہی۔ اس جگہ چند اشعار لکھے جاتے ہیں تاکہ ہر ایک کی مثال ناظرین کے سامنے ہو مثلاً:

ایک وہ شخص جس کے مسلمہ فضل و کمال نے اُسے محسود خلائق بنا رکھا تھا عاشق ہو کر سب کچھ کھو بیٹھتا ہی اب وہ حاسدوں سے کہتا ہی خوش ہو کہ تمہاری مرادیں پوری ہوئیں دیکھو میں وہی یکتائے زمانہ ہوں لیکن اب نہ فضل مجھ میں رہا نہ کمال۔ اس مضمون کو خسرو اس درد سے ادا کرتے ہیں کہ سُننے والے کا دل بھر آتا ہی ؎

حسد می بردی اے دشمن بعقل و دانشِ خسرو   بیا تا بر مرادِ خاطرِ خود بینی اکنونش

معشوق جن کو اپنے بناؤ و سنوار کے سوا کسی سے کوئی غرض نہیں ہوتی اُن کے اس استغنا اور خود آرائی کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

گل چہ داند کہ حالِ بلبل کیست   او ہمیں کارِ رنگ و بو داند

معشوق سامنے سے گزرتا ہی عاشق کے دل پر ایک بجلی گرتی ہی۔ اب طبیعت پر قابو کر نہ دل پر اختیار استغاثہ کرتا ہی تو دارالقضا و دارالافتا کوئی بھی اس مظلوم کی داد رسی نہیں کرتا اس مضمون کو دیکھو ؎

کافرے رفت و دلم غارت کرد   شہر اسلام و مرا داد نہ بود

معشوق کی ہر ہر ادا ہی کہ دل چھینے لیتی ہی۔ عاشق کا ایک دل کس کس کا مقابلہ کرے۔ بھاگنا چاہے تو یہ بھی ممکن نہیں۔ آخر گھبرا کر اُسی سے تدبیر پوچھتا ہی ؎

لب و دہان و رخت ہر یکے بلائے دل اند   یکے دلم چہ کند جانب کدام شود

بخت بیدار معشوق کو عاشق پر مہربان کرتا ہی۔ معشوق حالت پوچھتا ہی۔ عاشق جس کی تباہی و بربادی شرح و بیان سے مستغنی ہی وہ کہے تو کیا کہے۔ اپنا دل جو معشوق کے پیچھے کھو چکا ہی اور اب وہ معشوق کا ہی نہ عاشق کا اُس کا گلہ کیوں کر کرے۔ اُسے معشوق سے کیوں کر مانگے ان پُر کیف معاملات کو دیکھو ؎

مرا غمے ست کہ پیدا نمی توانم کرد — شکایتِ دلِ شیدا نمی توانم کرد

تو حالِ من خود ازیں روئے زردِ من می پرس — کہ من بروئے تو پیدا نمی توانم کرد

مگر تو خود بکرم باز بخشیم دلِ ریش — کہ من ز شرم تقاضا نمی توانم کرد

عشاق کے آنسو کبھی دریا ہیں اور کبھی سمندر۔ ان کے جوش و طغیانی کا یہ عالم ہی کہ کبھی سکون آنے ہی نہیں پاتا لیکن خسرو نے جس انداز سے اس مضمون کو ادا کیا ہی وہ اپنی جدت میں آج تک نیا ہی ؎

میروی و گریہ می آید مرا — صبر کن چنداں کہ باراں بگزرد

اس شعر کی جدت و جامعیت قابل لحاظ ہی۔ معشوق جانا چاہتا ہی اس لئے کہ لازمۂ معشوقیت ہی یہ ہی۔ عاشق کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہ نکلتے ہیں اب وہ معشوق سے کہتا ہی کہ گو میرے پاس بیٹھنا ناگوار سہی۔ لیکن ذرا صبر کر پانی تھم جائے تو چلے جانا۔ لطف یہ کہ اس پانی کی علت معشوق کا جانا ہی ہی۔ دیکھو صرف ایک چھوٹے سے شعر میں کتنے مضامین ہیں۔ معشوق کے جانے سے جو صدمہ کہ عاشق پر گزرتا ہی اُس کا بیان ہی۔ معشوق کو عاشق کے پاس بیٹھنا جبر ہی جس کے لئے تلقینِ صبر ہی۔ آنسو بارش کی طرح آنکھوں سے

جاری ہیں جب تک یہ بارش نہ تھمے اُس وقت تک کے لئے معشوق سے التماس توقف ہی طول قیام کی آرزو کس لطف سے پیش کی گئی ہی۔ افسوس ہم سطریں کی سطریں لکھ گئے لیکن وہ مزہ کہاں جو خسرو کے ایک شعر میں ہی۔

اسی اشک کے مضمون کو ایک دوسرے شعر میں نظم کرتے ہیں۔ اور ایک عجیب خیال کا اظہار کرتے ہیں ؎

اشکم بروں می افگند رازِ درونِ پردہ را　　　آرے تنکا تنہا بود مہمانِ بیروں کردہ را

شعرا نے معشوق کے قامت کو گویا کیا کچھ نہیں کہا ہی لیکن زرا اندازِ خسرو دیکھنا کہ وہ کیا کہتے ہیں اور کس طرح کہتے ہیں ؎

یارب آں بالا مگر از آبِ حیواں ریختند　　　یا مگر جانِ کساں بگداختند آں ریختند

شیرۂ جانہائے شیریں برکشید ندازنہاں　　　ویں تنِ شیریں ازاں شیرینیِ جاں ریختند

آتشِ عشق سے سوختہ و برشتہ عاشق جب اپنے معشوق کو دیکھتا ہی تو اس میں ایک حیاتِ تازہ آجاتی ہی۔ اب وہ اس اثر سے متعجب ہی حیات بخشی کی وجہ پوچھے تو کس سے پوچھے خالقِ عالم کو پکارتا ہی۔ اور پوچھتا ہی کہ تو ہی بتا۔ اس کا خمیر آبِ حیات سے ہی جس کی تاثیر سے مجھ میں جان پڑجاتی ہی یا بہت سی جانوں کو پگھلا کر یہ ایک جسم بنا ہی یا شیریں جانوں کا شیرہ و روح کھینچکر یہ ایک جسم شیریں بنا ہی۔ دیکھو کیسا لطیف و شیریں خیال ہی۔

نظم کے پرکھنے والے اربابِ بصیرت کا یہ فیصلہ ہی کہ بعض بعض اشعار خسرو کے ایسا بلند پایہ رکھتے ہیں کہ ہر شعر ایک دیوان کی قوت رکھتا ہی۔ مثلاً ؎

زلفت زہر دو جانب خوں ریز عاشقان ست | چیزے نمی تواں گفت روئے تو درمیان ست

رُخ خود بپوش ورنہ رقم منجماں را | بحسابِ ہشتم آخر بشمار خواہی آمد

خلاصہ یہ کہ غزلوں میں ان کا مستانہ وار نعرہ دل ہلا دیتا ہی اور یہاں ان کا تیر بے خطا ثابت ہوتا ہی کہیں کہیں ان کی نمکینی سعدی کی شیرینی پر چشمک زن ہی۔ اپنی تمنا، اپنی مایوسی، اپنا انتظار، اپنی ناکامی، اپنی بیقراری، اپنی پریشانی کی جو تصویریں اپنی غزلوں میں اُنھوں نے کھینچی ہیں وہ گویا جیتی جاگتی بولتی چالتی چڑیاں ہیں جو اپنی دردانگیز آواز سے دل ہلائے دیتی ہیں چند غزلوں کے مسلسل اشعار ہم یہاں نقل کرتے ہیں ؎

از جانِ من آرام رفت آرام جانِ من کجا | ہجرم نشانِ فتنہ شد فتنہ نشانِ من کجا

آمد بہارِ مشک دم سنبل دمید و لالہ ہم | سبزہ بصحرا زد قدم سروِ روانِ من کجا

در کارِ غم شد سوریم بے پردہ شد مستوریم | تلخ ست عیشِ از دُوریم شکرّ فشانِ من کجا

ہر دم جگر در سوز و تاب انے دیدہ یزم خونِ ناب | اینک مَے و اینک کباب آں میہمانِ من کجا



گل نو رسید و بوئے زبہارِ من نیامد | چہ کنم نسیمِ گل را چو زیارِ من نیامد

دلِ من چرا چو غنچہ نہ شود دریدہ صد جا | کہ صبا رسید و بوئے زبہارِ من نیامد

اگرائے حریف داری نظرے بروے یارے | تو بہارِ خویش خوش کن کہ بہارِ من نیامد

بہ شبِ نشاط یارا چہ خبر ترا زخسرو | کہ بہ جانبِ تو روزے شبِ تارِ من نیامد

زندگی کی بے ثباتی، دنیا کی بے وفائی، زمانہ کا جور، یارانِ رفتہ کی جدائی کا گلہ

اکثر شعرا نے کیا ہی مگر جس درد انگیز لہجہ میں یہ راگ خسرو الاپ گئے ہیں انھیں کا حصہ ہے ؎

یاران کہ بودہ اند ندانم کجا شدند		یارب چہ روز بود کہ از ما جدا شدند

گر نو بہار آید و پرسد ز دوستاں		گو اے صبا کہ آں ہمہ گلہا گیا شدند

اے گل چو آمدی ز زمیں گو چہ گونہ اند		آں لالہ رویہا کہ در تہ گردِ فنا شدند

آں سروراں کہ تاجِ سرِ خلق بودہ اند		اکنوں نظارہ کن کہ ہمہ خاکِ پا شدند

خورشید بودہ اند کہ رفتند زیرِ خاک		آں ذرّہ ہا کہ ہر ہمہ اندر ہوا شدند

بازیچہ ایست طفل فریبِ متاعِ دہر		بے عقل مرد ماں کہ بریں مبتلا شدند

غزل میں خسرو کی قادر الکلامی احاطۂ انضباط و تحسین سے باہر ہے۔ ان کی عبارت میں الفاظ کو اپنے مضمون کے ساتھ غضب کا تناسب پایا جاتا ہے۔ جو لفظ جہاں کے لئے مناسب ہوتا ہے وہی یہ استعمال کرتے ہیں بحروں اور قافیوں کے یہ بادشاہ ہیں چاہیے کہ بحور و قوافی انکی روانی طبع کے سدراہ ہوتے ہوں ہرگز نہیں بلکہ یہ اور بھی ان کی طبیعت میں جولانی پیدا کر دیتے ہیں تمثیلاً ذیل کی غزل پڑھو۔ کیسا سرتوڑ قافیہ ہے۔ مگر رہوارِ قلم اس روانی سے جاتا ہے کہ زمین ہموار و مسطح معلوم ہوتی ہے ؎

سروے چو تو در اُجہ و درنتہ نباشد		گل شکلِ رخِ خوب تو لہستہ نباشد

دوزند قبا بہرِ قدت از گلِ سوری		تا خلعتِ زیبائے تو ازلتہ نباشد

در جنتِ فردوس کسے را نہ گزارند		تا داغِ غلامیِ تو اش بتہ نباشد

لقمانی مسکیں نکند میل بہ جنت		در صحنِ بہشت ار طبقِ بتہ نباشد

این حسن و لطافت کہ تو کافر بچہ داری
در چین و خطا و ختن و خستہ نہ باشد

اب ایک دو نمونے عام عاشقانہ جن میں معشوق سے خطاب عشق کی واردات مستی و بیخودی کی باتیں ہیں درج کرتا ہوں ؎

ساقیا مے دہ کہ امروزم سرِ دیوانگیست
دور بر گرداں کہ مرگم از تہی پیمانگیست

من بہ نسبت جاں دہم تو رحمت آری بر تنم
این عنایت درمیانِ دوستاں بیگانگیست

شمع شیرینی چشیدست از بسوز دباک نیست
لذت از آتش گرفتن مذہبِ پروانگیست

ہر تو خفتے می کشد ہر سو منِ بدنام را
بس می بنایم چوں کنم وایں دلِ خودکام را

یکشب بیا مے دیدمت و آنگہ بیاد پائے تو
رنگیں بساطے می کشم از خونِ چشم آں بام را

خواہم کہ خونِ خود دمے در گردنِ جامت کنم
دانی چہ دولت میدہی ساعت از لب جام را

تا چند ہر دم از صبا در جنبش آید زلفِ تو
آخر دمے آرام دہ دلہائے بے آرام را

گر کشتہ شد خسرو زغم تہمت چہ بر خوباں نہم
چوں چرخ خنجر میدہم در کشتنم بہرام را

شمعِ فلک بر آمد با آتشیں زبانہ
ساقیِ نامسلماں در دہ مےِ مغانہ

کشتیِ ما رواں کن ما تا کنارہ یابم
دریائے غم ندارد چوں ہیچ جا کرانہ

نے نے کہ از رخِ خود کن بہشتیم کہ بارے
یک دم خلاص یابم از محنتِ زمانہ

روتا رویم بیروں دستے بگردنِ تو
تو بیخودِ صبوحے من بیخودِ شبانہ

اے من غلام شکلت چوں در خمار باشی
نے روئے خواب شستہ نے موئے کردہ شانہ

مطرب بے و دخود بر دستے چو ابر بارا
ویں نہ ہدِ خشکِ ما را تر کن بہ یک ترانہ

من نیم خوردہ خوردم وز بادۂ نرگسی — دل بر لبِ تو دارم می خواستن بہانہ
خسرو کہ ہست مطرب و امستِ نازشہ خوار — ہاں درچنیں نشاطے یک رقصِ عاشقانہ

لشکر کشید عشق و دلم ترکِ جاں گرفت — صبر گریز پائے سر اندر جہاں گرفت
گفتی کہ ترکِ من کن و آزاد شو ز غم — آساں بہ ترک ہیچو توئی چہ تواں گرفت
اے آشنا کہ گریہ کناں پند میدہی — آب از بروں مریز کہ آتش بجاں گرفت
نظارہ ہم نہ کرد گہِ سوختن مرا — آنکس کہ آتشم زد و از من کراں گرفت
در طوقِ بندگیش رود جاں بعافیت — ہر فاختہ کہ خدمتِ سروِ رواں گرفت

کج کلہا ستمگرا تنگ قبائے کیستی — لا بہ گرائے دلبرا عشوہ نمائے کیستی
زیر کلاہِ جعد تر تا کمرت کشیدہ سر — بستہ بہ چابکی کمر چست قبائے کیستی
مرکبِ ناز کردہ زیں دادہ بغمزہ تیغِ کیں — ساختہ آمدہ چنیں تا ز برائے کیستی
سینہ بند جائے تو دیدہ بزیرِ پائے تو — با ہمہ در ہوائے تو تو بہ ہوائے کیستی
خسروِ خستہ را سخن بستہ شد از تو در دہن — طوطیِ شکرینِ من نغمہ سرائے کیستی

اگرچہ غزل میں مسلسل کلام نہیں ہوتا اُس کا ہر شعر ایک الگ مضمون ہوتا ہے اور اسی لئے شعرائے غزل ایجاد کی، لیکن یہ عاشق کی گفتگو ہے۔ کبھی کبھی وہ ایک مسلسل کلام بھی کرتا ہے۔ اس لئے اساتذۂ غزل کے دیوانوں میں ایسی غزلیں بھی بکثرت موجود ہیں جن کا مضمون مسلسل ہے خسرو کی آخری غزل جو میں نے درج کی ہے وہ تسلسل ہی کا نمونہ ہے۔

شوخی و ظرافت پر جب آتے ہیں تو ایک ایک جملے میں سو سو چمن کھلا جاتے ہیں۔

طبیعت اس بلا کی چلبلی پائی ہے کہ خود حسن بیان منہ چومنے دوڑتا ہے مثلاً ؎

توشبانہ می نمائی بہ برکہ بودی امشب | کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ | نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

مست آمدۂ باز مہمان کہ بودی | دائم شکری در شکرستان کہ بودی

اے یار جدا ماندہ دل تنگ کہ جستی | اے یوسف گم گشتہ بہ زندان کہ بودی

دیوانہ من بر سر کوے کہ گذشتی | تشویش دہ حال پریشان کہ بودی

می دوش کجا خوردی و ساغر بہ کہ دادی | در ظلمت شب چشمۂ حیوان کہ بودی

جعدت کہ کشدست و لبت را کہ گزیدست | پیش کہ نشستی شب و مہمان کہ بودی

آراستہ و مست در آغوش کہ خفتی | ایں بخت کرا بود بفرمان کہ بودی

چھوٹی بحروں میں یہ جب کہتے ہیں تو آب حیات کی نہروں کی روانی کا مزہ آجاتا ہے۔ مثلاً اس غزل کو دیکھو ؎

دیوانہ شدم در آرزویت | اے چشم ہمہ جہاں بسویت

مائیم و تحیر و خموشی | و آفاق ہمہ بہ گفتگویت

وے روے تو دیدم و نمردم | شرمندہ بماندہ ام ز رویت

پرسی کہ چگونۂ ز من دور | دور از تو چہ پرسیم چو مویت

خسرو بکمند تو اسیر ست | بیچارہ کجا رود ز کویت

اگر غزل گو شعرا کی فہرست طیار کی جائے تو صرف اُن کے اسما سے ایک ضخیم جلد طیار ہو سکتی

ہے۔لیکن غزل کا حق جس نے ادا کیا ہو اگر اس نقطۂ نظر سے فہرست طیار کیا چاہو تو بجز چند ناموں کے اور کچھ نہ پاؤ گے جن میں اُستادِ غزل سعدی ہیں اور ان کے بعد خسرو و حسن دہلوی۔ سعدی نے جن اصول و مضامین پر غزل کی بنیاد رکھی وہ محض شاعری نہ تھی بلکہ حقائق و معارف کی چاشنی بھی اُن میں تھی اس لئے خسرو و حسن دہلوی کے سوا کوئی شاعر سعدی کے تتبع میں کامیاب نہ ہوسکا۔ ان دونوں میں بھی خسرو کو مرتبۂ اوّلیت حاصل ہے خسرو کی غزلوں پر اگر ایک مختصر و جامع تنقید چاہتے ہو تو صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ وہی بادۂ شیراز ہے جو دوبارہ کھینچ کر دو آتشہ ہوگئی ہے۔

غزل کا دوسرا دور

اس کے بعد ایک دوسرا دورِ غزل کا آیا جس میں خواجو کرمانی و حافظ شیرازی ہیں اگرچہ یہ کوئی نیا دور نہ تھا لیکن بعض مضامین مثلاً ساقی و صراحی بادہ و جام میخانہ و پیرِ مغاں رند و خراباتی کی مدح زاہد و واعظ کی ہجو۔ دنیا کی بے ثباتی انکا نہایت ہی جوش و بلند آہنگی سے ترانہ گایا گیا تھا۔ یہ باتیں سعدی کی غزلوں میں اُسی انداز خاص سے جو اُنکا طرز تھا موجود تھیں لیکن ان کا مرتبہ بنیاد کا تھا۔ خواجو کرمانی نے اُنھیں بنیادوں کو ذرا نمایاں کیا اور حافظ نے اُسے آسمان تک پہنچا دیا۔ اُنہوں نے اپنی سُریلی آواز سے فارسی داں دنیا میں ایک مستی و مدہوشی کا عالم پیدا کردیا جس کا نشہ آج تک باقی ہے۔ خواجہ حافظ نے جس وقت شاعری شروع کی ہے اُس وقت سلمان ساوجی و خواجو کرمانی کا رنگ چھایا ہوا تھا خود ان کی طبیعت میں بھی فطری جوش و مستی بھری ہوئی تھی۔ اُنہوں نے اپنے کلام کی بنیاد انھیں دونوں کی داغ بیل پر ڈالی جیسا کہ اُن کے بعض اشعار سے ظاہر ہے ؎

شہنشہِ فضلا بادشاہِ ملکِ سخن　　جمال ملت و دین خواجۂ جہاں سلماں

چہ جائے گفتۂ خواجو و شعرِ سلمان ست　　کہ شعر حافظِ شیراز بہ ز شعرِ ظہیر

اوستادِ غزل سعدی ست پیشِ ہمہ کس امّا　　دارد غزلِ حافظ طرز و روشِ خواجو

لیکن ان کی طبیعت کے اصلی جوہر نے اُسے ایسا چمکایا جس کے سامنے سلمان و خواجو دونوں کے گوہرِ فکر بے آب معلوم ہونے لگے سلمان کی غزلوں میں تو کچھ نہیں۔ ہاں ان کے قصائد ہیں جن سے ان کی شاعرانہ قوت ظاہر ہے۔ البتہ خواجو کے دیوان میں ایسی بہت سی غزلیں ہیں جو حافظ کی ہم ردیف و ہم قافیہ و ہم بحر ہیں۔ اسی کے ساتھ اکثر مضامین اور اسلوب ادا کا بھی اتحاد پایا جاتا ہے جس سے حافظ کا تتبع صحیح ثابت ہوتا ہے۔ خواجو کا دیوان نایاب ہے جس نے نہ دیکھا ہوگا اُس کو تعجب ہوگا کہ حافظ اور خواجو کا تتبع۔ لیکن جس نے خواجو کا دیوان دیکھا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ وہی صہبائے مستی ہے جس کی تندی و تیزی بڑھا دی گئی ہے۔

مقصود اس سے یہ ہے کہ خسرو کا مقابلہ غزل میں حافظ شیراز سے نہیں کیا جاسکتا کیونکہ دونوں کا طرز ہی جداگانہ ہے۔ جہاں ایک رود و سرود زلف و خال باغ و راغ کوہ و صحرا دشت و دریا میں شاہد معنی کے جمال جہان آرا سے مست ہو رہا ہے وہاں دوسرا میخانہ وحی کا دلدادہ بن کر مے کی لہروں میں معشوق حقیقی کے رخ و عارض کا جلوہ دیکھ کر مدہوش ہے اگرچہ دونوں یکساں عشق کے پھندے میں پھنسے ہیں مگر دو رنگ سے ؎

ہر دو شاعر ہم سبق بودند در دیوانِ عشق　　یک بصحرا رفت و دیگر با مغاں مستانہ شد

حافظ کا صحیح مقابلہ خواجو کرمانی سے جو ان کے عہد میں تھے اور حکیم سنائی و عمر خیام سے جو

ان سے بہت قبل تھے کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ ان تینوں کا ایک ہی رنگ ہے۔ ورنہ یوں تو دس بیس شعر متحد المعنی انتخاب کر کے لکھ دینا کچھ دشوار نہیں مگر یہ فی الحقیقت اپنی بد مذاقی کا ثبوت دینا ہوگا مثلاً خسرو کا ایک شعر ہے؎

ازپسِ مرگ اگر بر سرِ خاکم گزری | بانگِ پایت شنوم نعرہ زناں برخیزم

اسی مضمون کو اسی بحر و قافیہ میں حضرت حافظ و سلمان ساوجی نے کہا ہے۔

حافظ؎

برسرِ تربت من با مے و مطرب بنشیں | تا من از کنجِ لحد رقص کناں برخیزم

سلمان؎

چوں شوم خاک بخاکم گزرے کن چو صبا | تا بہ بوئے تو زمین رقص کناں برخیزم

خسرو نے جس سادگی اور صفائی کے ساتھ خوش نما پیرایہ میں مضمون بیان کیا ہے وہ مذاقِ سلیم رکھنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ عاشق جو فراقِ یار میں ہمہ تن انتظار ہے اُس سے اتنا صبر نہیں ہو سکتا کہ معشوق کے پہونچنے کا انتظار کرے۔ پاؤں کی آہٹ پاتا ہے اور استقبال کو کھڑا ہو جاتا ہے۔ چوں کہ یہ مضمون فطرت سے بہت نزدیک ہے بدیں وجہ کلام نہایت بلیغ ہو گیا۔ ''بانگ پا'' اور ''نعرہ زناں'' نے شعر کے لطف کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔

حضرت خواجہ حافظ نے برخیزم کی کیفیت کو رقص سے اور بھی مکیف کر دیا۔ مگر ان کو لحد اُٹھانے کے لئے ساز و سامان چاہئے۔ مے ہو مطرب ہو اور اس کے ساتھ یار کی

نشست ہو۔ صرف آمد کافی نہیں۔ ان تینوں کے مجموعۂ قوت کا یہ اثر ہو کہ لحد سے رقص کناں اُٹھیں۔

سلمان کا شعر ان دونوں کے مقابل ہیچ ہے۔ اگرچہ سادگی و صفائی ہے مگر کوئی لطف نہیں۔ جو ہوا کہ خاک کو رقص میں لاتی ہے اور بگولا بناتی ہے وہ صبا نہیں ہے۔ صبا لطیف پُروائی ہوا کو کہتے ہیں یہاں بو کی وجہ سے صبا کا ہونا ضرور تھا۔ اگر شاعر صبا کی جگہ کسی تند و تیز ہوا کو لاتا تو بو اُڑ کر غائب ہو جاتی۔ یہاں صبا سے بو پہنچانے کی خدمت لی گئی ہے رقص کناں برخیزم کو اُس سے کوئی تعلق نہیں۔

غرض یہاں بحث خسرو کی تغزل سے ہے کہ یہ کس رنگ میں غزلیں کہتے ہیں اور ان کا پایہ غزل میں کیا ہے اور یہ بحث اس مختصر رسالے کے تحمل سے زیادہ ہو چکی اب ہمیں صرف ایک بات اور کہنی ہے کہ شاعری میں موسیقی کا بھی دخل بعضوں نے تسلیم کیا ہے چنانچہ سعدی و حافظ کی غزلوں میں جہاں اور لطافتیں بیان کی گئی ہیں وہاں بحور کی نغمہ و ترنم سے موزونی و مناسبت بھی بیان ہوئی ہے۔ اب میرا یہ کہنا کہ اگر شاعری کے محاسن میں موسیقی کا دخل ہے اور لطیف نظم کے الفاظ تال وسم سے مطابقت رکھتے ہیں تو اس باب میں خسرو علیہ الرحمہ کا کوئی بھی مقابل و مساوی نہیں۔ ایک کھلے راز کا اظہار یہ ہوگا

قصائد امیر خسرو سے قبل ظہیر رشید کمال اسمٰعیل الملقب بہ خلاق المعانی خاقانی الملقب بہ حسان العجم انوری وغیرہ مشہور قصائد نگار گزر چکے تھے۔ لیکن جس طرح کہ غزل میں یہ شیخ سعدی کے قدم بقدم رہے اور بہت سی غزلوں میں اپنی شان خسروی بھی

ظاہر کر گئے۔ اسی طرح قصائد میں بھی ان باکمالوں کے پہلو بہ پہلو چلتے ہیں اور جب ان کا خاص میدان آتا ہے تو سب کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جاتے ہیں۔

یہ ایک زمانہ دراز تک چونکہ شاہزادوں اور بادشاہوں کے دربار کے زیور رہے ہیں اس لئے قصائد نویسی کا موقع ان کو بہت ملا جس نے ان کی طبیعت پر اور بھی جلا کر دی

قصیدہ میں شاعر کا جوہر دو جگہ کھلتا ہے۔ ایک تو تخلص یعنی گریز جہاں سے مقصد شروع ہوتا ہے دوسری تشبیب و مقصد میں توازن ولطف کا اس طرح قائم رکھنا کہ دونوں حصوں میں سے کوئی بھی بدمزہ نہ ہونے پائے۔

نصر بن سیار جو بنی امیہ کی طرف سے خراسان کا والی تھا اس کے سامنے کسی نے مدحیہ قصیدہ پیش کیا جس میں سو شعر تو تشبیب کے تھے اور صرف دس شعر میں پوری مدح تھی۔ نصر نے جو کہ خود سخن فہم تھا قصیدہ سن کر کہا مابقیت کلمۃ عذبۃ ولا معنی لطیفا الا وقد شغلته عن مدیحی بتشبیبك یعنی الفاظ شیریں اور معنی لطیف تو سب تشبیب میں ختم ہو گئے اب مدح کے لئے کیا رہ گیا تب اس نے دوبارہ قصیدہ کہا جس کا مطلع یہ تھا

هل تعرف الدار لام العمر دع ذا وحبر مدحه فی نصر

یعنی کیا تو ام عمر کے مکان کو پہچانتا ہے اس ذکر کو چھوڑ اور نصر کی مدح لکھ۔ اسے سن کر نصر نے کہا۔ لا ذالك ولا هذا ولكن بين الامرين۔ یعنی نہ وہ افراط نہ یہ تفریط۔ بلکہ ان دونوں کے بین بین کلام ہونا چاہیئے۔

اس واقعہ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جہاں گریز میں شاعر کی قوت دیکھی جاتی ہے کہ

سلسلہ کلام کو باقی رکھتے ہوئے کس طرح مطلب و مقصد کی طرف آتا ہی وہاں یہ بھی دیکھا جاتا ہی کہ لطف بیان اور زور کلام میں بھی توازن رہا یا نہیں۔

خسرو علیہ الرحمۃ کے قصائد سیکڑوں ہیں اور ان دونوں کمالوں سے آراستہ و پیراستہ ہاں ارباب دنیا کی مدح میں اُن کا بیان پھیکا ہو جاتا ہی چوں کہ وہ دل کی صدا نہیں ہوتی اس لئے ایسے قصائد میں ساری قوت تشبیب میں صرف کر دیتے ہیں۔ گریز اچھی کرتے ہیں لیکن مدح اہل دول ان سے نہیں بن آتی۔ پھر بھی اگر کہیں اس پر متوجہ ہو گئے ہیں تو مبالغہ میں کسی سے پیچھے نہیں رہے مثال کے طور پر دو نمونے پیش کرتا ہوں۔

ظہیر فاریابی اپنے ایک قصیدہ میں قزل ارسلاں کی شان میں لکھتا ہی ؎

نہ کرسیِ فلک نہد اندیشہ زیر پای　　　تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

شیخ سعدی علیہ الرحمۃ اس پر یوں تعریض کرتے ہیں ؎

براہ تکلف مرو سعدیا　　　اگر صدق داری بیار و بیا
تو منزل شناسی و شہ راہ رو　　　تو حق گوی و خسرو حقائق شنو
چہ حاجت کہ نہ کرسیِ آسماں　　　نہی زیر پائے قزل ارسلاں
مگو پائے عزت بر افلاک نہ　　　بگو روے اخلاص بر خاک نہ

خسرو نے سلطان جلال الدین کی شان میں جو قصیدے لکھے ہیں اُن میں سے ایک قصیدے میں فرماتے ہیں ؎

ز آبِ حیات شست دہن را ہزار بار　　　تا بوسہ بر رکاب شہِ کامراں دہد

اندیشہ کے رسد کہ بہ بوسد رکابِ شاہ — گر بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد
زاں سوے کوں گر پرد اندیشہ تابہ — نتواند آنکہ بوسہ براں آستاں دہد

اسی بحر و قافیہ میں سلمان ساوجی کا بھی ایک قصیدہ شیخ اویس کی شان میں ہے اُس میں وہ کہتے ہیں ؎

در بوستاں بیادِ دہانِ تو غنچہ را — ہردم ہزار بوسہ صبا بر دہاں دہد
ہست آستانِ حضرتتا اقبال را حرم — مقبل کسے کہ بوسہ براں آستاں دہد
گشت ست پائے بازِ مشرف بدست تو — بر پائے خویش بوسہ بپایے ازاں دہد

دیکھو ظہیر فاریابی امیر خسرو سلمان ساوجی تینوں ایک ہی مضمون کہہ رہے ہیں لیکن یہاں خسرو چونکہ مبالغہ کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں اس لئے ظہیر و سلمان دونوں سے ان کا مبالغہ بڑھ گیا۔

ماہ نو کی تشبیب مشاہیر قصائد نگاروں کی ایک موقع پر صاحب خزانہ عامرہ نے جمع کردی ہے ہم اُس میں سے بخوفِ طوالت صرف خاقانی و انوری و خسرو کی تشبیب درج کرتے ہیں۔ ظہیر کے ساتھ مقابلہ اوپر گزر چکا اب تکرار سے کیا حاصل۔

خاقانی ؎

دوش چوں خورشید را مصراعِ خاور ساختند — ماہِ نو را چوں حمائل حلقہ پیکر ساختند
محتسب گوئی بماہِ روزہ جامِ می شکست — آں شکستِ جام را رسوائے خاور ساختند
چرخِ جادو پیشہ چوں زریں قوارہ کرد گم — دامن کحلیش را جیبِ مقور ساختند

درزبان چرخ راگوئی چہ سہوافتادہ بود
کاں زرہ سیمیں بدیں دامن نہ درخورساختند

یاشبانگہ قصد کرد اختراں تپ زدہ
کاسماں طشت وشفق چوں ماہ نشتر ساختند

نیمۂ قندیل عیسےٰ بود یا محراب روح
یا مثالِ طوق اسپ شاہ صفدر ساختند

انوری ؎

دوشِ سلطانِ چرخ آئینہ فام
آنکہ دستور شاہ راہست غلام

ازکنارِ نبردگاہِ اُفق
چوں بدستِ غروب داد زمام

دیدم اندر سواد طرۂ شب
گوشوارہ فلک زگوشۂ بام

گفتم آں نعل خنگ دستورست
قرۃ العین وفخر آل نظام

خسرو ؎

برآمد ماہِ عیداز اوجِ گردوں
طربِ چوں ماہِ نو شد ہردم افزوں

رہلوحِ آسماں نونے ست یا عین
کہ بیروں آمدہ از کلکِ بیچوں

بہ بیں اندر رکوع آں پارۂ نور
ہلالش گوئی خواہی خواہ ذوالنوں

ہمانا حلقۂ گوشِ سپہرست
کہ دار داز کواکب درِّ مکنوں

سوادِ شام درپیشِ مہِ نو
مگر لیلےٰ است درپہلوے مجنوں

چنیں ماہِ نو وعیدِ خجستہ
مبارک باد برذاتِ ہمایوں

قصائدگوئی کے لئے جن باتوں کی ضرورت ہی وہ بوجہ احسن واکمل خسرو میں موجود تھیں اور اُنھوں نے نہایت خوبی وخوش اسلوبی سے اپنے قصائد میں اپنے جوہر کا اظہار کردیا ہی۔

شوکت و ندرت الفاظ مسائل علمیہ مقدمات حکمیہ دقائق سلوک و تصوف اصطلاحات علوم مختلفہ دقت معانی صنائع و بدائع لفظی و معنوی (خصوصاً تجنیس و ترصیع) بلند پروازی مبالغہ وغیرہ۔ قصائد نویسی کے زیور ہیں۔

خسرو کا خزانۂ خیال اس سب متاع سے مالا مال تھا۔ پھر جس فراوانی سے وہ اس کو لٹا سکتے تھے وہ کچھ کہنے کی بات نہیں۔ ان کے کلیات کو اٹھا کر دیکھو۔ مختلف بحور و قوافی میں پچاسوں قصیدے پاؤ گے اور نہایت سیر۔

الحمد للہ کہ پیر جواں ہمت خادم اسلام و مخدوم قوم نواب حاجی محمد اسحٰق خاں صاحب کے چشمۂ فیض کی بڑھتی ہوئی موجوں میں قوم کو قصائد خسرو کے بھی مطالعہ کا موقع ملے گا۔

ہم یہاں محض ایک دو نمونے قصائد خسروی کے درج کرتے ہیں تاکہ ایک مجمل اندازہ ان کی قصائد نویسی کے متعلق ناظرین کر سکیں۔

موعظت و اخلاق میں ان کا ایک قصیدہ ہے جس کا نام بحرالابرار یا دریائے ابرار ہے نہایت ہی سیر قصیدہ ہے اُس میں یہ التزام ہے کہ ہر شعر کا پہلا مصرع دعویٰ ہے اور دوسرا دلیل دو شعر اُس کے یاد ہیں اُنھیں کو لکھتا ہوں ؎

عاشقی رنج ست و مرداں را بسینہ راحت ست   سلسلہ بند ست و شیراں را بگردن زیور ست

راہ رو چوں در ریا کوشد مرید شہوت ست   بیوہ زن چوں رخ بیارا ید بہ بند شوہر ست

چند قصائد ان کے صنعت لف و نشر مرتب میں ہیں جن میں علاء الدین کی مدح کی ہے۔ تین شعر نمونۃً اُس میں سے بھی لکھتا ہوں ؎

کجا خیزد چو تو سروے جوان و نازک و نو بر | شکر گفتار و شیریں کار و گل رخسار و مہ پیکر
نبا شد چوں لب و اندام و گیسو و رخت ہرگز | شکر شیریں و گل رنگیں و شب مشکیں و صبح ازفر
ببرد اندیشۂ مہر و فراق و آرزوئے تو | ز شخصم تاب و ز رویم آب و چشم خواب و جانم خور

خسرو کے بعد سلمان ساوجی و قاآنی نے اسی صنعت میں قصیدے لکھے ہیں جو اُن کے کلیات میں موجود ہیں لیکن سلمان ساوجی کا قصیدہ تو بہت ہی پھیکا رہا۔ بالکل آورد و تصنع معلوم ہوتا ہے۔ قاآنی جو شوکتِ الفاظ کا بادشاہ ہے یہ اپنے زورِ الفاظ سے بہت کچھ رنگ آمیزی کرنا چاہتا ہے لیکن خسرو سے بمراحل دور رہے۔

خسرو نے اپنے ایک طولانی قصیدے میں جس قادر الکلامی کے ساتھ مسئلہ تخلیقِ عالم اور اُس کے متعلقات پر بحث کی ہے اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان فلسفیانہ مسائل میں وہ اس طرح تیرے ہوئے ہیں اور فلسفہ کے دقائق و نکات اُن پر اس طرح حل ہیں کہ طرح طرح کے اسلوب سے بیان کرنے پر اُنھیں قدرت تامہ حاصل ہے۔

پدید کرد جواہر مجرد از مادہ | کہ در خزانۂ ملکش سبلکِ اظہار ست
یکی ست نفس کہ ہست او مدبر ابدال | کہ بہر ہر بدنے روز و شب بہ تیمار ست
وگر دوم طلبی عقل جوہریست کہ آں | نہ در تعلقِ کارِ دیار و دیار ست
زہے عجائب صنعش کہ در لوایح کن | ولد سہ ہست نہ و مرد ہفت زن چار ست
بنات و معدن و حیوان دریں حدیقہ کنوں | سہ میوہ ہست کہ از یک درخت آں بار ست
یکیست سنگ جماد و ملون و سادہ | کہ از مشابہتِ دو شریک بیزار ست

دوم چو شعلہ دراں تکیہ کرد بر پایش | گہے بکنج حرم گہ بصفۂ نار ست
سوم رونده وگرداں خزانہ خانۂ جاں | کہ بہرِ نقب خزانہ بسیش ہنجار ست
دراں خزینہ چہارم گراں بہا گہر یست | کہ قیمتش نہ دو و عالمش خریدار ست
ازاں سہ جاہل سود و زیان و لذت و ذوق | بریں یکے کہ یگانہ ست جملہ اَنبار ست
وجودِ آدمی از عین غرتش عکس ست | چو عکسِ آب کے از آدمی نمودار ست

اسی قصیدے میں انسان کی ترکیب جسمانی وحیوانی کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

زآب و گل تنِ مردم چو قلعۂ آراست | بشکلِ تنگ و بمعنی جہانِ اسرار ست
درو کشید چو عنصر چہار بار زا رے | کہ رختِ ہر دو جہانش بچار بازار ست
خزینہ دار نفائس بسینہ دل را ساخت | خرد وزیر شد و جان سپاہ سالار ست
نخست حسِ بروں را بہ تجربہ بنگر | کہ ذوق و فائدہ در ہر یکے چہ مقدار ست
دگر چو ہں دروں بینی آنچہ اندر تن | ہزار عالمِ مستور خاص ستار ست
تو حس مشترک و وہم و فہم صورت کن | کہ ہر یک آئینۂ جاں بغیر زنگار ست

شاعر کی جادوگری و سحر نگاری کے جو مواقع ہیں اُن میں سے ایک یہ ہے کہ خشک علمی مضامین کو اپنی رنگین بیانی سے ایسا آراستہ کرے کہ صحیح مسائل کا بیان دل آویز و دل پذیر ہو جائے جس نے فلسفہ وحکمت میں ان مسائل کو پڑھا ہوگا وہی سمجھ سکتا ہے کہ ان دقیق مسائل کو خسرو نے کس محققانہ طرز سے ادا کیا ہے۔ جو مسائل کتب حکمیہ میں چند صفحوں میں بیان ہوئے ہیں یہاں اُنھیں چند اشعار میں بیان کر رہے ہیں۔

خاقانی نے ایک نہایت طویل لذیل قصیدہ لکھ کر اُس کا نام مرات النظر رکھا ہی جس کا مطلع یہ ہی؎

دلِ من پیر تعلیم ست و من طفلِ زباندانش
دم تسلیم سر عشر و سر زانو دبستانش

یہ قصیدہ اُس کا بہت ہی مشہور قصیدہ ہی اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس قصیدے میں اُس نے بڑی داد قادر الکلامی دی ہی۔ مضامین اپنے علو مرتبت میں اور خیالات اپنی بلند پروازی و ندرت میں آپ اپنا جواب ہیں۔ عادت کے موافق خاقانی نے اس قصیدے پر بہت کچھ فخر و مباہات کئے ہیں اور کوس انا ولاغیری بجایا ہی۔ خسرو نے اس کے جواب میں ایک قصیدہ اسی بحر و قافیہ میں لکھا اور اُس کا نام مرات الصفار رکھا۔ خسرو کے بعد مولٰنا جامی نے بھی اسی بحر و قافیہ میں طبع آزمائی کی۔ اور اپنے قصیدے کا نام جلاء الروح رکھا۔

ان تینوں قصائد میں کیا فرق ہی۔ اس بحث کو میں یہاں چھیڑنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ ان پر بحث کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے جس کا یہاں موقع نہیں۔ اور چند اشعار کے مقابلہ سے پورے قصائد کی خوبیاں اور ایک دوسرے کا فرق ظاہر نہیں ہو سکتا تاہم اس خیال سے کہ سطحی طور سے بھی عام ناظرین اندازہ کر سکیں اپنے مقصد کے لئے مناسب ہوگا کہ تینوں قصائد میں سے تھوڑے تھوڑے اشعار ذیل میں درج کر دیے جائیں جس میں جامی کا قصیدہ خود تنقید کا مرتبہ رکھتا ہی اُنھوں نے آخر قصیدے میں فیصلہ کر دیا ہی کہ کس کے قصیدے کا کیا پایہ ہی۔

خاقانی سے

دلِ من پیرِ تعلیم ست و من طفلِ زباندانش — دم تسلیم سرِ عشر و سرِ زانو دبستانش

نه ہر زانو دبستان ست و ہر دم لوحِ تسلیمش — نه ہر دریا صدف دارست و ہر نم قطرہ نیسانش

سرِ زانو دبستان ست چوں کشتی نوح آں را — که طوفاں خوش در داست و جودی گرد دامانش

کسے کیں خضرِ معنی رہست دہنگیر چوں موسیٰ — کفِ موسیٰ و آبِ خضر بینی در گریبانش

مرا ہمت چو خورشید ست شاہنشاہ ژند استا — که چرخش زیر رانست و سرِ عیسیٰ ست بر رانش

بلے خود ہمتِ درویش چوں خورشید می باید — که سامانش ہمه شاہی ست او فارغ ز سامانش

زہے خضرِ سکندر دل ہوا تخت و خرد تاجش — خہے سرمست عاقل جاں بقا نزل و رضا خوانش

دو کون امروز دکاں نیست کحال شریعت را — که خود کحل الجواہر یافت از انصار و اعوانش

به بندار کحل دیں خواہی کمر چوں دستہ ہاون — به پیشِ آنکه ارواح اند ہاون کوب دکانش

ہمه گیتی ست بانگ ہاون اما نشنود خواجه — که سیمابِ ضلالت ریخت اندر گوش خذلانش

فلک ہم ہاونِ کحل ست کردہ سرنگوں گوئی — که منعِ کحل سائی را نگوں کردند زیں سانش

حق یہ ہے کہ اس خاقانِ ملک سخن نے اپنی قادر الکلامی اور بلند خیالی کا بے مثال نقش صفحۂ قرطاس پر کھینچ دیا ہے۔ بلحاظ شکوہ الفاظ۔ رفعت خیال۔ زور کلام استعارات و تشبیہات کی موزونی۔ بندش کی چستی۔ اشعار کی برجستگی فصاحت و بلاغت و متانت اور صنائع شعری کے خاقانی کا یہ قصیدہ بے بدل ہے۔

امیر خسرو ؎

دلم طفل ست و پیر عشق استاد زبان دانش — سواد الوجہ سبق و مسکنت کنج دبستانش
زبان دان پیر عشق آمد کہ ہر کہ آموخت ز فرا و — درونش لوح محفوظ ست و خاموشی ست بزبانش
ببازار فقیران رو اگر نقد لیست در کیسہ — کہ چندیں تحفہ گنج ست در ہر کنج دکانش
چو مرد از خود بروں آید گل و خارست یکرنگش — چو مست از ہوش فارغ شد شب و روزست یکسانش
ز دریاے شہادت گر نہنگ لا برآرد سر — تیمم واجب آید نوح را در عین طوفانش
نہ من گفتار دانا را جوابے ساختم لیکن — جوے آوردم و کاہی کہ ریزم پیش یکرانش
سخن زاں گونہ گفتم من بلند امروز در دہلو — کہ از خواب گراں بیدار کردستم بشروانش
مرا انصاف مطلوب ست نے تحسین ازیں معنی — کسے کو بگذرد ز انصاف باشد خصم یزدانش

خسرو اقلیم معانی نے بھی اپنے قصر مرات الصفا کی آئینہ بندی اور زیب و زینت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔ اور جواہر زواہر معانی سے اس کی آرائش و زیبائش اس طرح کی ہے کہ خاقانِ ملک سخن کے قصر معلیٰ کی رفعت شان سے ہم رتبہ ہو سکے۔ اور انصاف یہ ہے کہ اگر بڑھا نہیں، تو قریب قریب بام مراد تک رسائی حاصل کی ہے۔ لذت کلام نزہت خیال حسن ادا فصاحت و متانت اور صنائع شعری کے اعتبار سے ان کا قصیدہ بھی لاجواب جواب ہے۔

جامی ؎

معلم کیست عشق و کنج خاموشی دبستانش — سبق نادانی و دانا دلم طفل سبق خوانش

ز ہر کس نابد ایں اوستاد و شاگردی نہ ہر کوہے ۔۔۔ بدخشاں باشد و ہر سنگ پارہ لعلِ رخشانش

زبان خبر بے زبانی نیست ایں نادر معلم را ۔۔۔ دریغا در ہمہ عالم ندانم کس زباں دانش

دو شاخِ لا شود در کفر غلّ گردن سالک ۔۔۔ چو یکتاید درِ الّا بوحدت چشمِ عرفانش

میانِ لا و الا یک الف فرق ست و زنبود ۔۔۔ درِ الا آں الف بالا شمار و عقل یکسانش

سخن آں بود کز اوّل نہاد استاد خاقانی ۔۔۔ بمہمان خانۂ گیتی پئے دانشوراں خوانش

چو در سیرِ معانی یافت خسرو سوئے آں خواں رو ۔۔۔ ملاحتہائے او فگند شورے در نمکدانش

اگر امروز ایں خادم زیجر شعر تر آبے ۔۔۔ پئے دست و زباں شستن بیارد نیست تاوانش

سخن سنج جام نے جو فیصلہ کیا ہے اُس سے بہتر فیصلہ اس زمانے کے لوگوں کا کیا ہوسکتا ہے۔ خاقانی نے خوانِ نعمت بچھایا۔ خسرو نے اُس کو نمک ڈال کر بامزہ بنایا جامی علیہ الرحمۃ نے کھانے والوں کے ہاتھ دھلوا دیئے۔ اب ہم بھی قصائد کی بحث کو ختم کرتے ہیں۔

مثنوی | مثنوی میں بھی خسرو کا پایہ بہت ارفع ہے سادگی و صفائی کے ساتھ ساتھ ایک خاص جوش و اثر دل آویزی و دل ربائی ان کی مثنویوں میں پائی جاتی ہے۔ بیان کی سلاست زبان کی شوخی الفاظ کی موزونیت ندرت بندش کی نفاست خیالات کی ہمواری عبارت کی روانی مثالوں کی چاشنی تمثیلوں کی برجستگی مواعظ و پند کی لینت و شیرینی اہل ذوق کو والہ و شیدا بناتی ہے۔

اصناف نظم میں مثنوی کی قدامت اور اس کے اقسام | مثنوی نظم کی بڑی صنف اور بہت قدیم صنف ہے باعتبار مضامین

اس کی تین قسمیں ہیں رزمیہ۔ بزمیہ۔ اور اخلاقی و صوفیانہ۔

رزم اور فردوسی فردوسی کا شاہنامہ جو اُس کی تمام شاعرانہ قوت کا خلاصہ و جوہر ہے اُس میں رزم کی تصویر ایسی ہوبہو کھینچی ہے جس کا مقابل آج تک کوئی پیش نہ کرسکا اگرچہ اُس کے اس التزام نے کہ عربی آمیزش سے حتی الامکان زبان فارسی محفوظ رہے بہت سے ثقیل و نامانوس الفاظ داخل کردیئے۔ لیکن رزم کی مثنوی میں فردوسی کی زبان سے اُن الفاظ کی ثقالت بھی ایسی ہی خوشنما و بیکر آرا رہی جیسے ایک نبرد آزما جنگ جو کے جسم پر جوشن و زرہ۔

فردوسی و یوسف زلیخا محمود کے دربار سے جب فردوسی شکستہ خاطر ہوکر بھاگا تو اُس نے اپنی اُس زندگی میں یوسف زلیخا لکھی اور چاہتا تھا کہ بزم میں بھی اپنی عروس سخن کو اس جلوہ گری سے ظاہر کرے کہ رزم و بزم دونوں کا سکہ فردوسی ہی کے نام کا جاری ہو لیکن یہ حصہ کسی آیندہ آنے والے کا تھا۔ اس لئے اس کی سعی یوسف زلیخا میں کچھ کامیاب نہو سکی۔ بعض اس کی علت اُس کی شکستہ خاطری اور پریشاں حالی قرار دیتے ہیں خیر سبب کچھ بھی کیوں نہو لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ رستم و سہراب۔ بہمن و اسفندیار کے خنجر و شمشیر کا بیان کرنے والا لیلےٰ کے تیغِ ادا اور کمندِ گیسو کو کیونکر جان سکتا ہے اس لئے اس کا لکھنا نہ لکھنے کے برابر تھا۔

ہاں اُس قدر عشق کا بیان جس میں سپاہ منشی کی آن بان قائم رہے وہاں تک تو اُس کا قلم بے مثل مصوری کرتا ہے لیکن اس سے جہاں عشق نے قدم آگے

بڑھایا۔ بس فردوسی کا قلم کانپ اُٹھتا ہے اگر کوئی فردوسی کے کمالات پر خاک ڈالنا چاہے تو اُس کی یوسف زلیخا سے جامی علیہ الرحمۃ کی یوسف زلیخا کا مقابلہ کرکے عوام کو بخوبی دھوکا دے سکتا ہے۔

صوفیانہ و اخلاقی مثنویاں مولنا رومی حکیم سنائی فرید الدین عطار کے رشحات قلم سے عالم وجود میں آئیں اور اس طرح مثنوی کی دو قسمیں بہ تمام و کمال زیور نظم سے آراستہ و پیراستہ ہوگئیں۔ لیکن ان کی ایک قسم یعنی بزم و عاشقانہ وہ اپنی پوری آرائش و زیبائش کے لئے کسی زبردست قلم کی ہنوز منتظر تھی۔

مولنا نظامی اور مثنوی یہاں تک کہ ۵۳۳ھ میں مولنا نظامی گنجوی پیدا ہوئے ان کا خاندان ایک علمی خاندان تھا اور اس کے ساتھ شعر و سخن کا بھی گھر میں شغل رہا کرتا تھا۔ مولنا طالب العلمی کے ساتھ اشعار کی بھی مشق کرتے جاتے تھے۔

پچیس یا چھبیس برس کی عمر میں پہنچکر مخزن الاسرار تصنیف فرمائی۔ اور بہرام شاہ کے نام سے اُسے معنون فرمایا۔ پانچ ہزار دینار سُرخ ایک قطار شتر اور مختلف قسم کے کپڑے انعام پائے۔ یہ مثنوی صوفیانہ ہے فلسفۂ نظری و عملی کو صوفیانہ طرز میں بیان کیا ہے اگرچہ اس موضوع پر مولنا سے پیشتر اسلاف بہت کچھ لکھ چکے تھے لیکن رنگینی و مرصع کاری مولنا کے قلم سے ہوئی تھی جیسا کہ مطالعۂ مخزن الاسرار سے یہ وصف ظاہر ہوگا

مخزن الاسرار کے بعد شیریں و خسرو تصنیف ہوئی۔ اس سے فارغ ہوکر داستان لیلیٰ و مجنوں کو نظم کا جامہ پہنایا۔ پھر ہفت پیکر کی آراستگی فرمائی۔ آخر عمر میں سکندر نامہ

لکھ کر اپنے زورِ قلم کا ایک نمونہ چھوڑ گئے۔

مولٰنا نظامی کی جامعیت | اگرچہ مولٰنا کی ہمہ گیر طبیعت نے تمام اصنافِ سخن پر زورِ قلم دکھانا چاہا۔ غزلیں بھی کہیں قصائد بھی لکھے لیکن اصل مضمون مثنوی ہی جس میں مولٰنا کی طبعِ رواں عجیب عجیب خوش رنگ و خوش بو گل کھلاتی ہی۔

مثنوی میں نظامی کی خصوصیات | یہ نظامی ہی کی جدت آفریں طبیعت تھی جس نے شیریں و خسرو اور لیلیٰ مجنوں لکھ کر شاعری کو عشق و حسن کے مراحل و منازل بھی مثنوی کے سہارے طے کرا دیئے۔ اور مثنوی کی تیسری قسم جو ہنوز تشنہ تھی وہ نظامی کے چشمۂ فیض سے اب ایسی سیراب ہوئی کہ آج تک اس راہ کے پیاسے اُسی چشمۂ صافی سے پیاس بجھاتے ہیں۔

مولٰنا نظامی سے قبل مثنوی کے لئے تین بحریں مخصوص تھیں شعرا جب مثنوی کہتے تو اُنھیں تین بحروں میں اُن کے کلام کی روانی پائی جاتی۔ مولٰنا نے دو بحریں اور اضافہ کیں۔ مخزن الاسرار و ہفت پیکر کی بحریں مثنوی کو نظامی ہی کے دبیرِ قلم کی عطا کردہ ہیں شعرائے مابعد نے ان دونوں نئی بحروں کو بھی ویسا ہی قبول کیا جیسا کہ اس سے پیشتر کی تین بحریں مقبول تھیں اس طرح اب مثنوی کی پانچ بحریں ہوگئیں۔

علاوہ اس کے کہ یہ دو امور خصوصیات بلکہ اولیات نظامی ہیں نفسِ بیان، ترکیب و نشستِ الفاظ، زورِ تشبیہ اور ندرتِ استعارہ۔ ان محاسن سے مولٰنا کا گنجینۂ سخن مالامال ہی۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جن سے دورِ اوّل کا کلام بہت کچھ خالی تھا اگرچہ ایک

خلقی حسین آرائش کا محتاج نہیں ہوتا۔ لیکن جب وہی حسین آرائش کے ساتھ سامنے آتا ہی تو پھر دل پر کچھ اور ہی اثر پڑتا ہی۔

نظامی کے کلام میں وہ حسن بھی ہی جو قدما، کی مثنویوں میں تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اُسے سولہ سنگار سے ایسا آراستہ کیا ہی کہ اہل نظر کی نگاہ اُن سے ہٹنے نہیں پاتی۔ مولنٰا کے اس کمال کا سخن سنجوں نے ایسا صحیح اعتراف کیا کہ بزم شعرا میں انھیں خدائے سخن کا لقب ملا۔ اور یہ لقب مولنٰا کے ساتھ مخصوص اور آپ کے تخلص نظامی کا مرادف ہوگیا ہی۔

اقسام سہ گانہ مثنوی میں جس قوت و جامعیت سے کہ مولنٰا کے قلم نے مضامین رنگین کے مینھ برسائے ہیں اُن کا احاطہ ناممکن ہی۔ پھر جذبات کی مصوری و واقعات کی تصویر کشی مولنٰا نے کچھ اس کمال و خوبی سے کی ہی کہ فردوسی جیسا واقعہ نگار بھی کہیں کہیں پیچھے رہ جاتا ہی۔ مولنٰا کے اس کمال کے دو نمونے ہدیۂ ناظرین ہیں۔

مثال اوّل | دارا جب غلاموں کے ہاتھ سے زخمی ہوتا ہی اور حالت نزع میں آخری سانس لے رہا ہی اُس وقت سکندر اُس کے پاس جاتا ہی اور دارا اُس سے کچھ کہتا ہی اس واقعہ کو فردوسی و نظامی دونوں نے بیان کیا ہی لیکن جو تصویر کہ مولنٰا کے قلم نے کھینچی ہی اُس کے خط و خال ایسے نمایاں ہیں کہ دارا کے جذبات جذبات معلوم نہیں ہوتے بلکہ گوشت و پوست سے درست ایک چلتی پھرتی صورت معلوم ہوتی ہی۔

فردوسی نے واقعہ یہ دکھانا چاہا ہو کہ مرتے وقت انسان کے تمام ولولے اور جوش فنا ہو جاتے ہیں بسترِ مرگ پر ایک فقیر و بادشاہ دونوں کے جذبات پہلو بہ پہلو ہوتے ہیں۔ اپنی بیکسی و بے مائگی پس ماندوں کی حیرانی و تباہی دونوں پر یکساں چھا جاتی ہو۔

اس لئے فردوسی دارا سے ایسے کلمات نقل کرتا ہو جس سے صرف دنیا کی بے ثباتی اپنی مجبوری انقلابِ دہر کا عبرت ناک سماں سمجھا جاتا ہو۔

برخلاف اس کے مولانا نظامی علیہ الرحمۃ اُس لطیف فرق کو نہایت خوبی سے بیان فرماتے ہیں جو شاہانہ و خسروانہ دماغ کے ساتھ مخصوص ہو وہ بھی تاسف و تحسر کے کلمات دارا کی زبان سے بیان کرتے ہیں لیکن شاہنشاہی اور کیانی تاجداری کی شان اُس میں مضمر ہو اور یہی نکتہ بیان کا کمال بلکہ سخن کی جان ہو۔ دونوں کے کلام سے سات سات شعر اس جگہ ثبوت کے لئے نقل کرتا ہوں۔

فردوسی	نظامی
زمین و زماں بندہ بد پیشِ من	اگر تاج خواہی ربود از سرم
چنیں بود تا بخت بد خویشِ من	یکے لحظہ بگزار تا بگزرم
چو از من ہماں بخت بیگانہ شد	مگرداں سرِ خفتہ را از سریر
ہمہ کاخ و ایواں چو ویرانہ شد	کہ گردونِ گرداں برآرد نفیر

فردوسی	نظامی
زنیکی جدا ماندہ ام زیں نشاں	تو اے پہلواں کآمدی سوے من
گرفتار در دست دشمن کشاں	نگہ دار پہلو ز پہلوے من
زفرزند و خویشاں شدہ نا اُمید	کہ باآنکہ پہلو دریدم چو میغ
سیہ شد جہاں دیدگانم سفید	ہمی آید از پہلویم بوئے تیغ
زخویشاں کسے نیست فریادرس	چہ دستت کہ با ما درازی کنی
اُمیدم بہ پروردگار است و بس	بتاجِ کیاں دست بازی کنی
بریں ست آئینِ چرخِ رواں	نگہ دار دستت کہ دار است ایں
اگر شہریاری وگر پہلواں	نہ پنہاں چو روز آشکار است ایں
بزرگی بفرجام ہم بگزرد	زمیں را منم تاج تارک نشیں
شکار ست مرگش ہمی بشکرد	مجنباں مرا تا نجنبد زمیں

دیکھو فردوسی نے بجز اس کے کہ پہلے شعر میں اُس کا صاحبِ تخت و اقبال ہونا بیان کیا ہے اس کے سوا اور کوئی کلمہ ایسا نہیں کہا جس سے ایک ایسے شخص کے جذبات کی خصوصیت معلوم ہوتی جس کا وجود ایک بہت بڑے شاہی خاندان کی یادگار تھا اور جس کی زندگی کی ہر حرکت وسکون سلطنت کیانی کا ایک تاریخی ورق تھا۔

برخلاف اس کے مولانا کا ہر شعر اس خصوصیت کے اظہار میں کیسا کامل ہے

جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک بادشاہ دم واپسیں تک بھی شاہی جذبات سے خالی نہیں ہوتا۔

مولانا نظامی کے کمال کی ایک دوسری مثال

اسی طرح اس واقعہ کو کہ خود سکندر قاصد کے لباس میں ایک دوسرے شاہانہ دربار میں جاتا ہے۔ پیام پہنچاتا ہے اور پہچان لیا جاتا ہے کہ یہ قاصد نہیں بلکہ خود سکندر ہے۔ لیکن سکندر انکار کرتا ہے۔ آخر میں شاہان عجم کی تصویریں نکالی جاتی ہیں اور اسکندر کے پاس کوئی حجت نہیں رہتی ہے۔

اس واقعہ کو دونوں نے بعینہٖ لکھا ہے فرق صرف اس قدر ہے کہ مولانا نظامی نے نوشابہ کے دربار میں پہنچایا ہے اور فردوسی قیدافہ کی بارگاہ میں لیجاتا ہے لیکن واقعات کا تسلسل جو نظامی کے یہاں ہے وہ فردوسی کے یہاں بالکل نہیں پایا جاتا۔

فردوسی نے سکندر کو جو قاصد بنایا تو تھوڑی دیر کے لئے اس کے شاہانہ حوصلے خسروانہ جذبات ملوکانہ اولوالعزمی شجاعانہ ہمت یہ سب ہیچ مچ فنا ہوگئے اور قاصدی کے جامہ میں آتے ہوئے حقیقتاً ہر طرح کا ضعف بھی اس میں آگیا۔ چنانچہ قیدافہ کے دربار میں وہ جب پہنچتا ہے تو دربار کی آراستگی اور شاہانہ جاہ و حشم اُسے متحیر کردیتا ہے۔ سطوت و ہیبت شاہی سے وہ مرعوب ہوکر تمام مراسم قاصدی پورا کرتا ہے۔ لیکن اثنائے گفتگو میں بادشاہ کو خود بخود خیال ہوتا ہے کہ یہ صورت سکندر سے ملتی ہے اور وہ تصویر نکال کر دیکھتا ہے۔

مگر نظامی اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں کہ اگر بادشاہ کسی معمولی و کہتر شخص کے لباس میں بھی آجائے تو شاہانہ دماغ کے لوازم اُس حال میں بھی اُسے اہل بصیرت کی نگاہوں میں ممتاز رکھتے ہیں۔

اس لئے سکندر جب نوشابہ کے دربار میں پہنچا تو سجدہ برسم قاصداں بجا نہ لاسکا طرز کلام میں اُس کے جو وقار و جرأت پائی جاتی تھی اُس میں شان قاصدوں کی نہ تھی۔ اس سے نوشابہ کو حیرت ہوتی ہے اور خیال گزرتا ہے کہ یہ جرأت بادشاہوں جیسی ایک قاصد میں کیونکر ہو سکتی ہے۔ اس خیال کی بنا پر وہ کہتی ہے :-

که صد آفریں بر تو شاہِ دلیر — که پیغام خود میگزاری چو شیر
میانجی نہ شاہِ آزادۂ — فرستندۂ نہ فرستادۂ

سکندر انکار کرتا ہے۔ قاصد ہونے پر مصر ہے اور سکندر کی عظمت و جلال کا خطبہ پڑھتا ہے تب نوشابہ تصویر منگواتی ہے سکندر کی تصویر اُس کے روبرو رکھ دیتی ہے اب وہ حیران ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ فردوسی جو مثنوی کے باب میں پیغمبر تسلیم کیا گیا ہے اور جس کے کلام کی پختگی خیالات کی بلندی جذبات و احساسات کی مصوری ایک امر مسلم ہے نظامی نے اُس استاد مسلم کے ساتھ میدانِ رزم میں مسابقت کی اور اس میں

شک نہیں کہ اُن تمام مقامات پر جہاں اُس سے کچھ بھی کمی رہ گئی تھی نظامی نے اُسے پورا کرکے ایک قدم اپنا آگے بڑھالیا۔ بہت سی جگہوں میں اُس کے دوش بدوش رہے۔ لیکن جو میدان کہ فردوسی کا خاص ہو چکا تھا اور اُس کے کلام کی بلندی اُس حد تک پہنچ گئی تھی کہ جس سے ترقی ناممکن تھی وہاں رزم میں البتہ نظامی سے اُس کے کلام کی فوقیت نمایاں ہے۔

بہرحال فردوسی و نظامی کا سکندرنامہ و شاہنامہ سے مقابلہ مقصود نہیں اور حق تو یوں ہے کہ ایک ایسے جوہر کا جسے حکاک نے تراش خراش کر مجلے بنایا ہو اُس کا ایک کان جواہر سے کیا مقابلہ۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ نظامی کی ہمہ گیر طبیعت کا صحیح اندازہ ناظرین کو ہوجائے اور یہ معلوم رہے کہ ان کی پُرزور طبیعت فردوسی کے چمن سے گزرتے ہوئے وہاں پہنچکر گل کھلاتی ہے جس جگہ فردوسی پہنچنے سے کانپ اُٹھتا ہے۔

مولنا نظامی کی جامعیت بمقابلہ فردوسی

مولنا نظامی قصائد لکھتے ہیں غزلیں کہتے ہیں۔ مثنوی عشقیہ اخلاقی و صوفیانہ تصنیف کرتے ہیں اور اپنی سحرالبیانی کا خراج تحسین باکمال اساتذہ سے وصول کرتے ہیں۔ لیکن فردوسی کا قلم جب رزم سے کسی دوسری طرف کا قصد بھی کرتا ہے تو تھرا اُٹھتا ہے شق ہو ہو جاتا ہے۔ یہی حال دوسرے مثنوی کہنے والے شعرا کا نظامی کے مقابلہ میں ہے۔ ہر ایک مثنوی گو ایک ایک صنف مثنوی پر قدرت

رکھتا ہے لیکن اقسام سہ گانہ مثنوی پر قوت و شوکت کے ساتھ صرف نظامی ہی کا قلم رواں ہے۔

خمسہ نظامی کا سو برس تک جواب نہ ہو سکا

الغرض اس خدائے سخن کی پانچ مثنویاں جو خمسۂ نظامی کے نام سے مشہور ہیں ۵۹۷ھ میں مکمل ہو کر ایسی مقبول خاص و عام ہوئیں کہ ان کا جواب غیر ممکن سمجھا جانے لگا۔ اور اس طرح یہ خمسۂ نظامی سو برس تک انا ولا غیری کا مدعی رہا۔ اب سو برس بعد تلك الایام نداولها بین الناس کا یوں ظہور ہوتا ہے کہ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ اس میدان میں قدم رکھتے ہیں اور اس جوش و مستی سے بادیہ پیمائے سخن ہوتے ہیں کہ باوجود مشاغل گوناگوں و تصانیف متنوعہ تین برس سے کم عرصے میں نہایت کامیابی کے ساتھ خمسہ نظامی کی منزل سے قریب اپنے خمسۂ خسروی کا خیمہ نصب کر دیتے ہیں۔ ذالك فضل الله یوتیه من یشاء والله ذو الفضل العظیم

بیان مثنوی میں یہ صفحات جو فردوسی و نظامی کے متعلق لکھے گئے ان سے صرف اس امر کا ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اقسام نظم میں مثنوی اپنے ایسے مرتبۂ کمال پر پہنچ گئی تھی کہ سو برس کے عرصہ میں جس قدر بھی کہ شعرا گزرے انہوں نے قصائد کہے غزلیں کہیں اور اسلاف سے کہیں زیادہ اپنے کلام کو محاسن و لطائف سے آراستہ کیا لیکن مثنوی کے ارادے سے جب نظامی کے خمسہ پر نظر ڈالتے تو خواہ اس خمسہ جواب دے جاتے۔

حالانکہ اصناف نظم میں سب سے زیادہ مفید مثنوی ہی کی صنف تھی مسلسل مضمون اسی میں بیان ہو سکتا ہے اور اسی لئے شعرائے ایران نے مثنوی کی قسم ایجاد کی تاکہ واقعات و حالات تاریخی نظم کی دل آویزی سے مرغوب و پسندیدہ ہو کر بقا کی صورت میں آجائیں لیکن نظامی کے کلام کی بلندی نے سب کے حوصلے اس طرح پست کر دیئے تھے کہ مثنوی کی صنف قریب تھی کہ معدوم ہو جائے۔

یہ خسرو علیہ الرحمۃ کے کمال و زور بیان کا احسان ہے کہ عالم نظم میں سو برس بعد پھر مثنوی کا دورہ آیا۔

خسرو کا احسان اور مثنوی کی دوبارہ زندگی

خسرو علیہ الرحمۃ نے اس خزینۂ نظم کے ابواب اپنی خداداد قابلیت سے اس وسعت و فراخی سے مفتوح کر دئے کہ آج تک شعرا اپنے اپنے حوصلہ و استعداد کے مطابق اس سے حصہ پا رہے ہیں۔

مثنوی پر یہ احسان حضرت خسرو علیہ الرحمۃ کا ہے جن کے قلم اعجاز رقم نے پھر اسے ایسا زندہ کیا کہ آج تک یہ مردہ نہ ہو سکی۔ خسرو علیہ الرحمۃ کے کلام میں اگر خمسۂ خسروی کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تو بھی اُن کے کمال کا مسلّم ہونا ظاہر تھا۔ اس لئے کہ نظامی علیہ الرحمۃ کے بعد مثنوی گوئی کا ارادہ شاعری کے لئے کچھ آسان نہ تھا۔

مولانا نظامی کی تمام عمر کا بیش بہا سرمایۂ ناز اور اُن کے چمن شاعری کا گل سرسبد کہا جاتا ہے وہ صرف مثنوی ہے۔

مولانا کی طبیعت میں نظم کی اس صنف سے خاص لگاؤ تھا اطمینان و فراغ

خاطر سے مشق اس کی بڑھاتے رہے یہاں تک کہ کلام کی بلندی اُس مرتبہ پر پہنچی کہ خدائے سخن کا لقب ملا لیکن خسرو علیہ الرحمۃ جنہیں اپنا وقت صبح سے شام تک دربار شاہی میں بسر کرنا ہوتا تھا اور اُس کے بعد جب مہلت و فرصت ملتی تو اُسے اپنے شیخ طریقت کی خدمت میں سعادت اندوز فرماتے۔ اسی کشاکش وضیق وقت میں جو لمحات کہ مل جاتے اُن میں شاعری کی طرف توجہ ہوتی۔

انصاف شرط ہے کہ ایک ایسے شخص کا خمسۂ نظامی کے مقابل جو اُن کی عمر کا سرمایہ ہے تین برس میں خمسہ طیار کرنا کیا کرامت نہیں ہے۔

اس بحث کو ہم یہاں چھیڑنا نہیں چاہتے کہ خسرو کا خمسہ کہاں تک کامیاب ثابت ہوا۔ اس لئے کہ اس رسالہ کے آخری حصہ میں مبسوط بحث اسی مضمون پر ہے ہفت پیکر و ہشت بہشت کا سیر کن مقابلہ کیا گیا ہے یہاں صرف اس قدر بیان کرنا ہے کہ خسرو علیہ الرحمۃ نے جب یہ دیکھا کہ شاعری کی ایک مفید صنف معدوم ہوئی جاتی ہے نظامی کی ہیبت کسی کو قلم اُٹھانے کی اجازت نہیں دیتی تو آپ نے بسم اللہ کہہ کر ہمتِ مردانہ سے کام لیا۔ اور الحمدللہ کہ آپ کی سعی مشکور ہوئی جیسا کہ خمسہ کی پہلی مثنوی مطلع الانوار میں فرماتے ہیں ؎

گرچہ ہمالک سخن از پنج گنج | نوبتِ آں گنجہ نشیں گشت پنج
نوبت خسرو کہ بپیچش نواست | پنجہ زنِ نوبتِ آں خسرو ست
سازم ازاں ساں بہائے پنج | پنج کلید از پئے آں پنج گنج

کاپنج بہر گنج بود ناپدید　　　فتح شود ہم بزبانِ کلید

آں نمط آرم کہ ہمہ ناقداں　　　فرق ندانند ازیں تا بداں

ملکِ کہن را چو گرفتم بہ تیغ　　　گوہرِ خود نیز فشاندم چو میغ

خسرو علیہ الرحمۃ نے مولانا نظامی کے خمسہ کو پانچ خزانے بتایا ہی اور اپنے خمسہ کو اُن خزائن کی کنجیاں یہ استعارہ اُس وقت اور بھی لطف دے جاتا ہی جب یہ دیکھا جائے کہ بعد خسرو علیہ الرحمۃ کے ستّر سے بھی زیادہ خمسۂ نظامی کی طرز پر مثنویاں لکھی گئیں۔

منقولۂ بالا اشعار کے پچھلے دو شعروں سے یہ مقصود ہی کہ نظامی کی روش لفظاً و معناً اس طرح اختیار کی جائے اور بیان ایسا رنگین و مرصع ہو کہ تابع و متبوع میں فرق نہ معلوم ہو۔ پھر صرف یہی نہیں کہ محض اتباع نظامی اس خمسہ کا کمال ہو بلکہ خود اپنی مجتہدانہ قابلیت کا بھی ثبوت اس میں دیا جائے۔ چنانچہ جہاں خسرو کی ہمہ گیر طبیعت نے نظامی کی روش فتح کی ہی وہاں خزائن خسروی کے خاص جواہر بھی آیندہ آنے والوں کے لئے مینھ کی طرح برسا دیئے ہیں پس خسرو کا یہ کہنا بالکل صحیح ہی کہ ؎

ملک کہن را چو گرفتم بہ تیغ　　　گوہرِ خود نیز فشاندم چو میغ

اس امر کا ثبوت کہ خسرو نے جو کچھ اپنی مثنویوں علی الخصوص خمسہ کے متعلق کہا ہی وہ صرف جذبات شاعرانہ کی نغمہ سرائی نہیں ہی بلکہ ایک امر واقعی کا سچا اور حقیقی بیان ہی اُس حصۂ کتاب میں ثابت ہو جائے گا جہاں نہایت تفصیل سے نظامی و خسرو کے

اشعار کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

صنف مثنوی پر احسان خسروی کی تفصیل

لیکن اس جگہ مجمل طور پر اس کا اظہار ضروری ہے کہ صنف مثنوی پر وہ کونسا خاص احسان ہے جسے خسرو کی گوہر افشانی کہی جائے۔

(۱) ابھی یہ مضمون بیان ہو چکا ہے کہ قدماء کے کلام میں مثنوی کے لئے صرف تین بحریں تھیں نظامی علیہ الرحمۃ نے دو بحریں اس پر اضافہ کر کے مثنوی میں وسعت پیدا کی۔

بحور مثنوی میں ازدیاد

خسرو علیہ الرحمۃ کا جب زمانہ آیا تو آپ نے پانچ پر دو بحریں اور بڑھائیں اور اس طرح مثنوی کے لئے سات بحریں ہو گئیں پھر آپ نے ایک مثنوی لکھی جس کا نام نہ سپہر قرار دیا اور اس میں دو نئی بحریں اور بھی اضافہ کیں اس طرح چار تازہ بحریں مثنوی کو خاص خزانۂ خسروی سے عطا ہوئیں۔

(۲) نظامی کے عہد تک یہ دستور تھا کہ عنوان محض سادہ ہوتے مثلاً حمد نعت مدح سلطان وقس علیٰ ہذا۔ اسی قدر عبارت عنوان کے لئے کافی سمجھی جاتی۔

عنوان میں جدت

لیکن خسرو علیہ الرحمۃ نے اس میں بھی ایک جدت پیدا کی۔ آپ نے اپنی مثنویوں میں عنوان کو ایک عجیب دلکش و رنگین نثر میں لکھا ہے دیکھو اسی ہشت بہشت کے عنوانات۔

چنانچہ مثنوی مطلع الانوار میں اپنی اس ایجاد کو خود فرماتے ہیں ؎

چوں شود آراستہ نظم بو در ازگہر نثر کنم خانہ پر

ہر چہ نویسیم بسر داستاں رہت کنم رہ زپئے راستاں
تا قلمِ ہر کہ دوا دو کند پس روئ این روشِ نو کند

اس طرح عنوان قائم کرنے سے ایک یہ لطف بھی پیدا ہوگیا کہ جب پڑھنے والا ایک مضمون ختم کر لیتا ہے اور دوسرا شروع کرنا چاہتا ہے تو عنوان جو نثر میں تحریر ہے اپنی عبارتِ رنگین سے ذوقِ مذاق میں چاشنی پیدا کر دیتا ہے اور اس تبدیلِ ذائقہ سے طبیعت میں تازگی آجاتی ہے۔ مسلسل ایک ہی بحر میں اشعار جو آتے جاتے ہیں ان سے تکان و سیری پیدا ہونے نہیں پاتی۔ پھر عنوان کا بیان و مضمون پر حاوی ہونا اور اُن حدود سے کم و بیش نہ ہونا جو عنوان سے مفہوم ہوتا ہے ایک عجب متکلمانہ کمال ہے۔

مثنوی نہ سپہر و قران السعدین میں یہ طرز اختیار کیا گیا ہے کہ ہر عنوان پر ایک ایک شعر لکھتے چلے گئے ہیں۔ اگر اُن تمام عنوانوں کے اشعار مسلسل جمع کر لئے جائیں تو ایک پر زور قصیدہ ہو جاتا ہے۔ اس طرح بعض مثنویاں ضمن عنوان میں ایک فصیح و بلیغ قصیدہ بھی رکھتی ہیں۔

عنوان کا اپنے بیان و ماتحت مضمون پر حاوی و محیط ہونا یہاں بھی پایا جاتا ہے حال آنکہ قصیدہ نگاری نے اس راہ کو سخت سنگلاخ کر دیا تھا۔

فن تقریر و تحریر کے نقاد اس کمال کی البتہ داد دے سکتے ہیں کہ عنوان و موضوع کے اندر رہ کر اس طرح لکھنا یا بولنا کہ نہ تو موضوع سے کلام بڑھکر نکلنے پائے نہ بیان کسی پہلو سے تشنہ رہ جائے، کس قدر اہم و معرکتہ الآرا ہے۔

غرض تحریر عنوان کا یہ جدید و دل پذیر طرز خاص ایجاد خسرو علیہ الرحمۃ ہے۔ اگرچہ جس طرح اس کے موجد ہونے کا انتساب خسرو علیہ الرحمۃ کی طرف ہے اسی طرح اس کے خاتم بھی وہی ہیں (اس لئے کہ آیندہ آنے والے اس کی تقلید نہ کر سکے) لیکن اگر غالب دہلوی کی اُردو تحریر کی روش پچھلے نہ اختیار کر سکے تو اس سے غالب کی ایجاد اور کمال میں کیا نقص لازم آتا ہے۔

(۳) واقعات تاریخی یا قصص ماضیہ کہ جن شعرانے کہ نظم کیا مثلاً شاہنامہ سکندر نامہ اور یوسف زلیخا وغیرہ ان کا مرتبہ نظم میں آکر بہت ہی گر جاتا ہے لوازم شاعری کا ایسا ہجوم ہوتا ہے کہ واقعات کی صورت بالکل متغیر و متبدل ہو جاتی ہے ایسی مثنویوں سے شاعری کی ترقی، زبان کی صفائی، محاورات کی چاشنی، بندش کی چستی البتہ حاصل ہوئی لیکن علمی و تاریخی فائدہ اُس سے حاصل نہو سکا۔

مثنوی میں صحیح دلچسپی تاریخ

خسرو علیہ الرحمۃ کی مثنوی نگاری میں یہ بھی ایک کمال ہے کہ جہاں شعرائے سلف کی روش پر قصص منظوم فرمائے، وہاں شاعری و مثنوی گوئی سے ایک صحیح افادہ بھی فرما گئے۔ چند ایسی مثنویاں ہیں جن سے قطع نظر محاسن مثنوی کے تاریخی حالات نہایت محققانہ و ناقدانہ حیثیت سے معلوم ہوتی ہیں مثلاً خضر خاں و دیول دی، تغلق نامہ، نہ سپہر، قرآن السعدین وغیرہ۔

ان کتابوں میں اُس عہد کے واقعات و حالات، سلطنت و سلاطین کی روش ارکین و اعیان دولت کا طرز اس تحقیق و خوبی سے نظم کیا ہے کہ آج اُس عہد کی بہت سی

تاریخی باتوں کا صحیح پتہ اُنھیں مثنویوں سے چلتا ہی۔ کتنی تاریخیں ہیں جن کی تصحیح کا ماخذ وہی مثنویاں ہیں۔

ہندوستان کے اُس عہد کی تاریخ کا جس نے ناقدانہ و محققانہ مطالعہ کیا ہی وہی شخص ان مثنویوں کو پڑھ کر صحیح داد خسرو کی شانِ مورخانہ کی دے سکتا ہی۔

سلاست | (۴) سلاست و صفائی اگرچہ دورِ ثانی کے کلام میں پیدا ہو چکی تھی لیکن نظامی علیہ الرحمۃ کی مثنوی میں کتنے مقامات ایسے پر پیچ ہیں جن کی گرہ شروح کے ناخن آج تک نہ کھول سکے مثلاً

سکندر نامہ میں جشنِ نوشابہ استعارات و تشبیہ کے ندرت میں ایک بے مثل بیان تسلیم کیا گیا ہی لیکن اُنھیں چند اوراق میں کتنے اشعار ایسے ہیں کہ آج تک اُن کا صحیح حل نہ ہو سکا۔ شارحین بہت کچھ لکھتے ہیں لیکن پھر بھی حضرت نظامی کی روح سے بہ ادب تمام معافی ہی مانگنی پڑتی ہی۔ لیکن خسرو کی مثنویوں کو پڑھو۔ باوجود کثرت صنائع بدائع (جو اُن کا روزمرہ ہی) بیان میں ایسی سلاست و صفائی ہی جس طرح سمندر کا شفاف پانی۔

شاعری میں مذہب و علم کا لحاظ | (۵) سب سے بڑی خصوصیت ان میں یہ ہی کہ ان کی مثنویوں میں شاعری تحقیقات علمیہ و مسائل اسلامیہ پر کہیں غالب نہیں ہونے پاتی۔ ان کا قلم کہیں سے لغزش نہیں کرتا۔

مولنٰنا نظامی نے (جن کا فضل و تقدس اظہر من الشمس ہی) مثنوی

ہفت پیکر میں جو حضرت سلیمان علیہ السلام کا قصہ بیان کیا ہے مذہبی نقطۂ نظر سے سخت قابل گرفت ہے لیکن یہ وہ اتہام شاعری ہیں جن سے شعرا کا کلام خالی نہیں ہوتا ہاں یہ خسرو علیہ الرحمۃ کا کمال ہے کہ شاعری کے تمام اسلحہ ان کی سرکار میں سب سے زیادہ رواں لیکن علم و مذہب اُن کے حملے سے بالکل مامون و مصئون۔

وصف نگاری کا ایجاد | (۶) وصف نگاری کا ایجاد بھی خسرو ہی کی قوت فکریہ و صحیح تخیل کا نتیجہ ہے شعرائے سلف محسوسات و موجودات خارجیہ کی الفاظ میں تصویرکشی نہیں کرتے تھے حال آنکہ یہ چیزیں بھی اس کی مستحق تھیں کہ ان کے بیان سے بھی نظم کا چمن آراستہ کیا جاتا۔ مثلاً

کسی شہر کے سواد کا اس طرح بیان کرنا جس سے اُس کا شوق دلوں میں پیدا ہو جائے یا وہاں کے پھول پھل کا بیان یا وہاں کی عمارتوں کا بیاں۔

خسرو علیہ الرحمۃ نے قران السعدین میں اس طرح کے بہت سے مضامین نظم کئے ہیں شہر دہلی کی تعریف۔ اہل شہر کی تعریف، وہاں کی مسجد کی تعریف، کشتی کی تعریف کاغذ کی تعریف، منارہ کی تعریف وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے کثیر مضامین اُس مثنوی میں ہیں اور اس کا نام خسرو نے وصف نگاری رکھا ہے۔

جس طرح کسی شئے کی تصویر اپنی اصل سے زیادہ دلکش ہوتی ہے اسی طرح اُس کا نظم میں بہ تمام و کمال بیان بھی ایک خاص لطف پیدا کر دیتا اور شاعر کی قوتِ متخیلہ اور زور بیان سے خبر دیتا ہے۔ اس لئے خسرو علیہ الرحمۃ نے اس کی طرف

توجہ کی اور اس بیان میں بھی اپنا کمال ظاہر کر دیا چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

بود در اندیشۂ من چند گاہ ق کز دلِ دانندۂ حکمت پناہ

چند صفت گویم و آنش دہم مجمعِ اوصاف خطابش دہم

طرز سخن را روشِ نو دہم سکّۂ ایں ملک بہ خسرو دہم

الغرض اس طرح کی بہت سی خصوصیات ہیں جن کا ایزاد و ایجاد خسرو کی مجتہدانہ جدت آفریں طبیعت کا نتیجہ ہے۔

سلاطین میں خسرو کی مثنویوں کی قدر دانی

اب ہم اس بیان کو صرف اس ایک مضمون پر ختم کرتے ہیں کہ خسرو کی مثنوی نگاری کی ان کے زمانے میں کیسی قدر ہوئی اس کے لئے صرف قطب الدین خلجی کی قدر افزائی ایک روشن بیان ہے۔

اس بادشاہ نے مثنوی نہ سپہر کے صلہ میں ہاتھی کے وزن سے ان کو سونا تول دیا

چنانچہ خود قطب الدین کی زبان سے اسی نہ سپہر میں کہتے ہیں ؎

بتاریخ ہیچوں من اسکندرے کند ہر کہ آرایش دفترے

ز گنج گراں مایۂ بے شمار دہم بار پیش آں پیل بار

مرا خود دریں رہ پدر شد دلیل کہ میداد زر ہمتراز وے فیل

شناسد کسے کش خرد رہنموں کہ از پیل بار است وزنش فزوں

چو میراث شد پیل زر دادنم نہ زیبا ست زیں سہل تر دادنم

بادشاہ کی اس قدر افزائی کا اسی مثنوی میں یوں شکریہ ادا کرتے ہیں ؎

شہا گنج بخشا کرم گسترا | معانی شناسا سخن داورا
مرا عمر کز شصت بالا گزشت | ہمہ پیشِ شاہانِ والا گزشت
زشاہاں کسے اولم کرد یاد | معز الدنا بود شہ کیقباد
ازاں پس ز فیروزہ چرخِ بلند | شدم پیشِ فیروز شہ ارجمند
ازاں پس کہ در شہ ستائی شدم | تونگر زِ گنجِ علائی شدم
شد اکنوں کہ اقبال ہمدم مرا | نوازندہ شد قطبِ عالم مرا
چنیں بخششی کز تو جم یافتم | زشاہانِ پیشینہ کم یافتم
کنوں لابد از سحر سنجے چو من | باندازۂ بخشش آید بمن
جریدہ بریں پیش پرداختم | چو ایں نامۂ خاص کم ساختم

خسرو کے کلام کی قدر افزائی جیسی کہ ان کے عہد میں ہوئی زمانہ مابعد میں بھی اُس کی عظمت و عزت وہی قائم رہی۔ چنانچہ خسرو کا تغلق نامہ جب کہ اُس کے چند اوراق فنا ہوگئے اور جہانگیر نے اپنے عہد ۱۰۱۱ھ میں اُسے کچھ نامکمل پایا تو اُس کے دل میں یہ تڑپ پیدا ہوئی کہ کسی طرح یہ مثنوی مکمل ہوجائے۔ شعرائے دربار سے فرمائش کی ہر ایک نے طبع آزمائی کی لیکن حیاتی کا کلام بادشاہ نے پسند کیا۔ اگرچہ خسرو کے کلام میں کوئی پیوند تو کیا لگا سکتا ہے لیکن پھر بھی اُس کے کلام کی شائستگی و متانت اس درجہ پر تسلیم کی گئی کہ اوراق گم شدہ کی جگہ حیاتی کا کلام پیوند کردیا گیا۔ بادشاہ نے اس صلے میں حیاتی کو چاندی سونے میں رکھ کر تول دیا۔ چنانچہ کسی شاعر نے اس واقعہ کو نظم کیا

اور تاریخ یہ کہی۔ "شاعرِ سنجیدۂ شاہی"۔

ملک و قوم میں قدردانی | خسرو کے کلام کی سلاطین وسلطنت نے جو عزت کی وہ ان دونوں عطایائے شاہی سے ظاہر ہے فارسی داں دنیا کی قدردانی اس سے واضح ہے کہ خسرو کی بہت سی مثنویاں بارہا مختلف مطابع میں طبع ہوئیں اور ہاتھوں ہاتھ قدردانوں تک پہنچ گئیں۔

اس بے توجہی ولاپروائی وبدمذاقی کے زمانے میں بھی جسے فارسی کا کچھ بھی مذاق ہے یا جہاں کہیں کتب خانے ہیں ایک ایک کتاب کے متعدد قلمی نسخے موجود ہیں اور یہ خصوصیات کچھ ہندوستانی کتب خانوں کی نہیں ہیں بلکہ یورپ کا بھی کتب خانہ تصانیف خسرو سے معمور ہے۔ خدیو مصر کے کتب خانے کی فہرست جب دیکھی گئی تو اس سے یہ معلوم ہوا کہ عرب نے اپنے عجمی بھائی کے عجمی کلام کی خود اہل عجم سے کچھ کم محبت وحفاظت نہیں کی ہے بلکہ بعض خصائص جزئیہ میں وہ ممتاز خصوصیت رکھتے ہیں۔

تھوڑی کوشش سے ایک ایک کتاب کے دس دس اور بارہ بارہ نسخے تو خود کالج میں فراہم ہو گئے۔ کتنے گھر ابھی ایسے ہیں جہاں اور بھی نسخے موجود ہونگے بعض کا تو ہمیں علم نہوا اور بعض جگہ انکار واخفا ہی کچھ کمال سمجھا گیا۔ چنانچہ بہار شریف میں خمسۂ خسرو کا موجود ہونا جب معلوم ہوتا ہے تو اُس وقت مولانا رشید احمد صاحب انصاری پروفیسر کالج علی گڑھ نہایت شوق وذوق میں سفر کرتے ہیں۔ بہار شریف پہنچکر صاحب کتاب سے ملتے ہیں۔ کتابیں دیکھتے ہیں۔ چند روز کے لئے کالج لانے کی ہر سعی جائز کرتے ہیں ہر طرح کی ضمانت پیش کرتے ہیں لیکن افسوس کہ وہاں سے خمسہ

کالج نہیں پہنچ سکتا۔

عزیزان وطن! صدیوں بعد جب کہ مذاق سخن باقی نہ رہا کتابیں پنساریوں کی دوکانوں میں پہنچ کر پڑیاں باندھنے کے مصرف میں آنے لگیں قدیم علمی خاندان ویران ہو گئے مصائب و آفات نے گھر کے گھر تباہ کر دیئے۔ بہت سے قیمتی جواہر جنھیں اسلاف نے صدیوں میں کمایا تھا یکسر غارت ہو گئے۔ خسرو کی مثنویوں کا اس وقت تک باقی رہنا اُس کے کمال مقبولیت و گرانمائگی کو مشعر ہے۔ رہا اس کا گلہ کہ سیکڑوں نسخے کیوں نہ ملے۔ تلاش و جستجو کی زحمت ہی کیوں ہوئی۔ اس کساد علمی کے زمانے میں ایک امر فضول ہے ؎

ہم مٹ گئے تو پرسشِ نام و نشاں ہے اب　　اس کی تلاش کر کہ محبت کہاں ہے اب

اب اس پہلو سے بھی ایک نظر ڈالنی ضروری ہے کہ خسرو کی تصنیف سلسلہ تعلیم و تعلم میں کہاں تک مقبول ہوئی۔

سلسلہ تعلیم میں مقبولیت سلسلۂ تعلیم میں آپ کی مثنوی قران السعدین جو سب مثنویوں سے مقدم ہے ویسی ہی مقبول ہوئی جیسا کہ سکندر نامۂ مولنا نظامی۔ بڑے بڑے فضلائے اجل نے اُس کے حواشی و شروح لکھیں۔ وقت تصنیف سے اُس وقت تک کہ علوم مشرقی کی تعلیم ہندوستان میں جاری رہی قران السعدین داخل نصاب فارسی تھی۔

واقعہ ہے کہ یہ مثنوی نہایت ہی دلچسپ ہے۔ یہ صرف اپنا تاریخی ہی پہلو نہیں رکھتی ہے بلکہ گوناگوں مضامین پر مشتمل ہے اور انھیں تنوعات نے اسے اس قدر مقبول بنا دیا ہے

نفس قصہ میں تو کوئی خاص دلچسپی ہی نہیں۔ اس لئے کہ باپ بیٹے کا دکھڑا ہی کیقباد بغرا خاں کا بیٹا سعادت فرزندی کو تہ کرکے باپ کے مقابلے میں آتا ہی۔ دہلی سے چل کر سرجو کے کنارے اس کی فوج پڑاؤ ڈالتی ہی۔ کچھ پیام وسلام کے بعد باپ بیٹے میں موافقت و مصالحت ہوجاتی ہی۔

اب کیقباد یہ چاہتا ہی کہ یہ بیہودہ واقعہ میری زندگی کا ایک با افتخار کارنامہ بن کر مشہور رہو۔ اسی خیال کی بنیاد پر خسرو سے نظم کرنے کی فرمائش کرتا ہی۔ یہ خسرو ہی کا کمال ہی کہ واقعات کو حقیقت کے دائرہ میں قائم رکھ کر اس طرح اس قصے کو نظم کیا ہی کہ کیقباد کی رندانہ زندگی اُس کے عہد کی سرمستی اور اُس کی تعیش پسند زندگی کا اہل شہر پر اثر سب کچھ اپنے لطف بیان سے لطیف پیرایہ میں کہہ گئے۔

اس مثنوی کی بحر اگرچہ وہی ہی جو نظامی کے مخزن الاسرار کی ہی لیکن اسلوب بیان و ترتیب مضامین خاص خسرو کا ایجاد ہی۔ یہ اسی ایجاد کا نتیجہ ہی کہ قران السعدین اس قدر مقبول ہوئی۔ اگرچہ اس ایجاد سے یہ نقص ضرور کتاب میں پیدا ہوگیا کہ کہیں کہیں واقعہ کا تسلسل باقی نہیں رہتا لیکن ایسے پھیکے و بدمزے قصے کے لئے تسلسل ایسا ضروری نہ تھا جیسا کہ دل آویز و دل پذیر ہونا ضروری تھا۔

قران السعدین کی پسندیدگی کی وجہ

قران السعدین نظم کے تین اصناف پر محیط ہی۔ قصیدہ، غزل، مثنوی اس طرح اس کتاب میں اقسام ثلثہ نظم کا لطف آتا ہی۔ جو قصہ کہ نظم کیا گیا ہی وہ خود ہندوستان کی صحیح اور سچی داستان ہی۔ اپنے ملک کے واقعات سے

دلچسپی ایک امر فطری ہے۔ پھر مضامین میں اس قدر تنوعات ہیں کہ ہر طرح کے خیالات موجود۔ کہیں بہار کا ترانہ ہے اور اس کی نسیم کی عطر فشانی۔ کہیں لو کی لپٹ اور باد خزاں کے جھونکے۔ کسی جگہ سیر دریا اور کشتی کی روانی ہے اور کسی جگہ ساقی و جام کی گردش سے مستی و مدہوشی۔ صرف وصف نگاری کی تحت میں چالیس سے زیادہ اشیاء کا بیان آگیا ہے۔ لطف یہ کہ ان سب چیزوں کا تعلق ہند کی ہی خاک سے ہے۔ پھر کیوں ایسی کتاب مطبوع عام و خاص نہ ہوتی۔ ہر شخص کے جذبات کی ضیافت کا سامان جس چیز میں جمع ہوگا اُسے ہر شخص ضرور پسند کرے گا۔ قران السعدین کی یہی بوقلمونی اس کی شہرت و ہمہ گیری کی قوی و اصلی علت ہے۔ اس لئے اساتذۂ فن نے بھی اسے تعلیم فارسی کا ایک عنصر بنا دیا تاکہ طلبہ کو ایک ہی کتاب میں موقع موقع سے اصناف نظم کی تمام اقسام کا اجمالی علم ہوجائے۔ مضمون کی رنگا رنگی دلچسپی کو روز افزوں کرتی رہے۔

دوسری وہ مثنویاں جن میں ہندوستان کے ہی واقعات بیان کئے گئے ہیں وہ داخل درس نہ ہوئیں مثلاً

مثنوی خضر خاں و دیول دئی کا اجمالی بیان

خضر خاں و دیول دئی کا قصہ باوجود اس کے کہ خود موجود رہا ہے اُس پر داستان عشق و حسن۔ جس میں حسن کی ناز آفرینی عشق کی نیازمندی، فراق کے صدمے، وعدۂ یار کی لذتیں۔ یہ ایسے مضامین ہیں جنھیں اگر خاص ملک خسرو کہا جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔

پھر وہ شخص جس کے عشق کی داستان ہے خسرو کا اس سے تعلقات گوناگوں سبب سے

بڑا علاقہ یہ کہ دونوں ایک پیر طریقت کے حلقہ بگوش۔ آخر میں اسی شاہزادہ کی جو وارث تخت و تاج تھا قسمت کا پلٹ جانا اور انقلاب دہر کا ایک عجیب و مہیب عبرتناک سماں یہ مضامین خسرو جیسے شخص کے لئے جو واقعات عالم پر غائر نظر رکھتا ہو اور اُن سے کل ممکن الاستخراج نتیجے نکال کر دنیا کے سامنے مقبول طبع صورت میں پیش کر سکتا ہو کیسے وسیع ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ خسرو کی تمام مثنویوں میں جوش سے لبریز ہی مثنوی خضر خاں و دیول دیبی ہی اس مثنوی کی حمد و مناجات سے ہی معلوم ہو جاتا ہی کہ شاعر کس جوش سے اس قصے کو بیان کیا چاہتا ہی مثلاً حمد اس شعر سے شروع کرتے ہیں ؎

سرِ نامہ بنام آں خداوند — کہ دلہا را بخوباں داد پیوند

اس کے بعد مناجات ہی اور اُس کا اوّل شعر یہ ہی ؎

خداوندا چو جاں دادی دلم بخش — دلِ عاشق نہ جانِ عاقلم بخش

یہ مثنوی کیا لکھی ہی سحر سامری کی تصویر کھینچ دی ہی۔ حاصل یہ کہ دیگر تاریخی مثنویاں جو سلسلہ تعلیم میں داخل نصاب نہوئیں تو اُس کی صرف یہ وجہ ہوئی کہ اُن مثنویوں میں کشش و تعلیم کی صرف ایک ایک ہی چیز تھی۔ باعتبار مضمون و موضوع تاریخ اور باعتبار نظم مثنوی حال آنکہ تعلیم اس کی مقتضی تھی کہ مختلف مضامین مختلف شعرا و مختلف دور کے پڑھائی جائیں تاکہ زمانہ تعلیم میں ہر دور کی خصوصیت ہر ایک کا انداز و اسلوب بیان طالب العلم کو معلوم ہو جائے۔ اسی خیال سے خمسہ نظامی میں سے سکندر نامہ جامی

کی مثنویوں میں سے یوسف زلیخا، سعدی کے کلام میں سے بوستاں اور خسرو کی تصانیف سے قران السعدین داخل نصاب کی گئیں۔ خلاصہ یہ کہ خسرو کی مثنویوں کو سلطنت، ملک اور تعلیم تینوں نے انتہائی عزت و پسندیدگی سے دیکھا۔

قطعہ و رباعی | غزل، قصیدہ، مثنوی میں جب کہ کسی شاعر کا کمال ثابت ہو جائے تو پھر کسی اور صنف نظم کی بحث سے اُس کا کمال بے نیاز ہے۔ لیکن جب کہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض شعرا کے لئے صرف چھوٹی قسمیں نظم کی دلیل کمال سمجھی گئیں تو پھر یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خسرو جیسے ہمہ گیر شاعر کی خسرویت کا نمونہ اُن چھوٹی قسموں میں بھی دکھا دیا جائے۔

سب سے پہلے خسرو کا وہ قطعہ ہدیۂ ناظرین ہے جس میں اُنھوں نے موسیقی و شاعری کا محاکمہ کیا ہے[۵۱]۔ کیوں کہ جہاں خسرو کو دیوان فطرت سے تمغاے شاعری ملا تھا وہاں فن موسیقی میں بھی ان کو ید طولیٰ حاصل تھا پھر ان سے بڑھکر کس کا محاکمہ قابل وقعت ہو سکتا ہے۔

دیگر قطعات و رباعیات کا بھی یہی حال ہے کہ ہر ایک میں ایک لطف خاص اس طرح پایا جاتا ہے کہ اُن کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید خسرو کا اصلی میدان یہی ہے۔ لیکن یہ خصوصیت خسرو کی صرف قطعہ و رباعی کے ہی ساتھ نہیں ہے بلکہ اصناف نظم میں سے جس قسم نظمِ خسرو کا مطالعہ کرد گے تو بے اختیار "کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست" کہہ اُٹھو گے۔

---

۵۱ ملاحظہ ہو قطعۂ اول صفحہ ۱۳۳

قطعات

(۱)

مطربی میگفت خسرو را که ای گنجِ سخن — علمِ موسیقی ز جنسِ نظم نیکوتر بود
زانکه این علمیست کز دقت نیاید بر قلم — واں نه دشوارست کاندر کاغذ و دفتر بود
پاسخش گفتم که من در هر دو معنی کاملم — ق — هر دو را سنجیده بر وزنی که آں بهتر بود
فرق می گویم میانِ هر دو معقول و درست — تا دهد انصاف آں کز هر دو دانشور بود
نظم را علمی تصور کن به نفسِ خود تمام — کو نه محتاجِ سماع و صوتِ خنیاگر بود
گر کسی بی زیر و بم نظمم فرو خواند رواست — نی بمعنی هیچ نقصان نی بلفظ اندر بود
ور کند مطرب بسی هاں هاں و هوں هوں در سرود — چوں سخن نه بود همه معنیِ او ابتر بود
ناله زن را بیں که صوتی دارد و گفتار نی — لاجرم در قول محتاجِ کسی دیگر بود
پس درین صورت ضرورت صاحبِ صوت و سماع — از برای شعر محتاجِ سخن پرور بود
نظم را حاصل عروسی داں و نغمه زیورش — نیست عیبی گر عروسِ خوب بی زیور بود
من کسی را آدمی دانم که داند ایں قدر — ور نداند پرسد از من ـ ور نه پرسد خر بود

دیگر

ز افسردگاں مجو اثرِ زندگیِ دل — نی از مزاجِ ظالمِ سوزنده خوی خوش
نی شعلهٔ بر آتشِ لاله تواں فروخت — نی از گلِ چراغ تواں یافت بوی خوش

دیگر

از جود و کرم قبولِ حق جوئے — خود نام بود گر آنت میل ست
مقصود ز سرمہ نورِ چشم ست — زیبائی چشم خود طفیل ست

دیگر

روشن دلانِ صاف درون را خلل بود — در کارِ خلق چشم کشادن بخیر و شر
پوشیدہ نیست نزدِ ہمہ کس کہ طاس را — سوراخ عیب باشد و غربال را ہنر

دیگر

خسرو چہ حالت ست کہ در دہر عالماں — از جاہلانِ دونِ دنی باز پس ترند
این نکتہ را بہ بیں و بانصاف خوش برآے — کز چار حرف قطرہ و دریا برابر ند

دیگر

اقبال را بقا نہ بود دل در و مبند — عمرے کہ بر غرور گزاری ہبا بود
ورنیست باورت زمن این نکتہ یاد گیر — اقبال را چو قلب کنی لابقا بود

دیگر

رفتم سوے حظیرہ و بگریستم ہزار — از ہجر دوستاں کہ اسیرِ فنا شدند
ایشاں کجا شدند چو گفتم حظیرہ ہم — داد از صدا جواب کہ ایشاں کجا شدند

رباعیات

توحید

ہر جا کہ سخن ز رب و بت وا فتد — وہ کیں دلِ بت پرست آں سو افتد

یارب تو مرا درونہ دہ کہ بصدق — ہو گویم و اندر دلِ من ہو افتد

نعت

از عزِ محمد ار نداری خبرے — کن از رہِ عقل در شہادت نظرے

اللہ و محمد ست پیوستہ بہم — یعنی کہ میانِ شاں نہ گنجد دگرے

دیگر

وصفِ شرفِ تو بیش از ادراک آمد — سبقِ ادبت نعبد ایاک آمد

توقیعِ تو کز صحیفہ پاک آمد — لولاک لما خلقت الافلاک آمد

دیگر

اے آنکہ شدہ طفیلت آدم پیدا — گشت از سببِ تو چرخِ اعظم پیدا

نورِ تو نہ گنجید چو در یک عالم — بہر تو خدا کرد دو عالم پیدا

مدح پیر

از شیخ نظام چوں سلام ست مرا — با حسنِ عمل عیشِ مدام ست مرا

امید پسِ مراد و کام ست مرا — زیرا ہمہ کار با نظام ست مرا

تصوّف

بستاں چو بسر کشید پیرایۂ ابر — آوردہ بروشیر فرو دایۂ ابر
گل بسکہ لطیف و نازک آمد در باغ — ترسم کہ گراں شود بر و سایۂ ابر

دیگر

دل در شکنِ زلف دوتاے تو بماند — جاں نیز چو ذرّہ در ہواے تو بماند
ہر کس سرِ خود گرفت و رفت از کوئے — الا سرِ من کہ زیر پاے تو بماند

عشق

جاناں منشیں برگزرے تیزیٔ آہ — آتش رسدت ز آتش انگیزیٔ آہ
تا در سرِ کوئے تو نہ پنداری سہل — شب گردیٔ گریہ و سحر خیزیٔ آہ

دیگر

مائیم خرابِ جرعۂ می خوارا ں — مارا چہ غم از طعنۂ نیکو کارا ں
از سرکہ لگد می خورد از خمارا ں — کے غم خورد از سرزنشِ ہشیارا ں

دیگر

اے غم ہمی کہ برمنِ غم خوار آئی — وقتت چہ شود گر بدلِ یار آئی
دی شب کہ سیاہ میکنی روزِ مرا — یارب کہ بروزِ من گرفتار آئی

دیگر

دوش آمد و وعدۂ شرابم می داد — خونابہ بجائے مے نابم می داد
می پرسیدم حالِ دل او خامش بود — واں زلف بجائے او جوابم می داد

دیگر

از شعلۂ عشق ہر کہ افروختہ نیست — با او سرِ سوز نے دلم دوختہ نیست
گر سوختہ دل نہ زما دور کہ ما — آتش بدرے زنیم کو سوختہ نیست

اقسام پنجگانہ نظم میں خسرو کے کمالِ زور بیان کا ایک مختصر نمونہ پیش کیا جا چکا۔ اب چند فرعی و جزئی باتیں ہیں جن کا اظہار بھی غالباً نامناسب نہ ہوگا۔

صنائع و بدائع | اختراع معانی و بدائع و صنائع میں خسرو خسروِ شاعرانِ سلف و خلف ہیں۔ اگر اُن کے اختراعات کی بحث چھیڑی جائے تو ایک دفتر طویل ہوگا۔ اعجازِ خسروی متعدد بار چھپ کر فارسی داں دنیا میں شائع ہو چکی ہے۔ جسے شوق ہو وہ اُسے مطالعہ کرے۔ بس خدا کی قدرت اُسے نظر آئیگی۔ اس جگہ ان کی ایک ایسی صنعت کا ذکر کرتا ہوں جس کی کوشش دیگر شعرا نے بھی کی ہے۔

ترکیب الفاظ سے لحن | یعنی ان کے کلام میں اکثر الفاظ کی ترکیب و نشست سے ایک لحن خاص پیدا ہوتا ہے اور اسی سے لحن کے مطابق پڑھنے والے کے دماغ میں جذبات کی لہریں موجیں مارنے لگتی ہیں مثلاً ذیل کے اشعار و مصرعے ملاحظہ ہوں ؎

گنج بر در نخ وے گنج سنج — در کششِ گنج ہمی برد رنج

باش بکامم کہ بکامِ توام　　زندہ و نازندہ بنامِ توام

ع تہمتن تن سیاوش وش فریدوں فرسکندر در

ع سناں قاراں قلم ہا ماں علم خاقاں دہل سنجر

فردوسی نے نقارہ کی آواز کو ایک شعر میں اس طرح باندھا ہے کہ شعر بھی بامعنی رہا اور ایک مصرع کے الفاظ سے نقارہ کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

زنقارہ آواز آمد بروں　　کہ دوں ست دوں ست گردونِ دوں

یہ شعر فردوسی کا بہت مشہور ہے اور اُس کے اس کمال کا بہترین نمونہ لیکن خسرو علیہ الرحمۃ کا ایک شعر نعت میں ہے جس کے مقابلہ میں فردوسی کی یہ صنعت خاک میں ملجاتی ہے خسرو کا شعر یہ ہے ؎

دہل زن دہل زد بہ تحسینِ او　　کہ دیں دینِ او دینِ او دینِ او

علم موسیقی سے آشنا ارباب ذوق سمجھ سکتے ہیں کہ خسرو کے شعر کا پایہ کس قدر بلند ہے۔ اس لئے کہ نہ صرف ایک بامعنی مصرع کے الفاظ بآواز دہل ادا کئے ہیں بلکہ اس میں تال اور سر کے اصول کی پوری پابندی ملحوظ رکھی ہے۔ اگرچہ خسرو جیسے شاعر کے لئے جو فن موسیقی کا بھی امام ہو فردوسی کے جواب میں اُس سے بہتر شعر پیش کر دینا ایک معمولی بات ہے۔

اسی طرح خسرو کی ایک رباعی مشہور ہے جس کے چوتھے مصرعہ میں اسی کمال کا اظہار کیا ہے ؎

آں روز کہ روحِ پاکِ آدم بہ بدن　　گفتند در آ نمی شد از ترسِ بدن

خواندند ملائکاں بہ لحنِ داوٗد　　در تن در تن در آ در آ در تن در تن

تکرار لفظ اور اختلاف معنی | ایک ہی لفظ کو مختلف پہلوؤں سے استعمال کر کے مختلف معنی پیدا کرنے میں بھی اُن کو ید طولیٰ حاصل تھا تمثیلاً ذیل کے ابیات دیکھو۔

پیمانۂ دوست پر ز دُر کرد   پیمانۂ خصم نیز پر کرد

در چپ زدنِ خرد شوی راست   دانی چپ خود ز جانب راست

الفاظ ہندی کا استعمال ہندی کے الفاظ بھی نہایت سلاست سے بے تکلف استعمال کر جاتے ہیں جس سے کلام میں چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً

ہم بہ نشستہ چوں دریا لکی نہ چرخ کہار آمدہ

خان کرہ چھوے کشور کش   کز لبِ شاہاں کڑہ دار دبہ پا

دوسرے مصرعہ میں لفظ کڑہ سے وہی پاؤں کا زیور مُراد ہے۔

اقتباس آیات قرآن آیات کلام الٰہی سے اپنے اشعار میں یہ ایسی مرصع کاری کرتے ہیں کہ دل پھڑک اُٹھتا ہے۔ تمثیلاً ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

حرز کلہ بستہ ز اوحی بہ   چتر سیہ کردہ ز اسریٰ بہ

زیر نگیں عرصۂ ملک جمش   خطبۂ ھب لی رقم خاتمش

نَعْبُدُ اِیَّاكَ طرازِ علم   فاخلع نعلیك مقامِ قدم

اکثر اشعار کے دوسرے مصرعہ میں کلامِ پاک کی کامل آیۃ تلاوت فرمائی ہے اور یہ وہ کمال خسرو کا ہے کہ کسی کے کلام میں اس فراوانی سے اس کی مثال نہیں ملتی۔ مثلاً اشعار ذیل کو دیکھو ؎

چہ ملامت کنید خسرو را   فَاتَّقُوا اللّٰہَ یَا اُولِی الْاَلْبَاب

قضا در ہفت سقفش دید و برخواند   بَنَیْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا

اوّل آں اوّلیں خلیفۂ کار ثانی اثنین اذ ھما فی الغار

فصل بہار | مناظر قدرت میں بہار کا سماں ایک ایسا مضمون ہے کہ شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہوگا جس نے اس منظر کی تصویر نہ کھینچی ہو۔ لیکن یہی مضمون جب خسرو کے یہاں آتا ہے تو پھر اس کی بہار قابلِ دید ہوتی ہے۔ خسرو نے جہاں کہیں ابر و بہار باغ و کہسار گل و گلزار کا نقشہ کھینچا ہے وہاں ہو بہو فوٹو پیش کر دیا ہے۔ مثالاً چند اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

چوں نافہ کشاد باد نوروز بشگفت بہار عالم افروز
ابر از صدفِ سپہر بگیر در گوش بنفشہ ریخت گوہر
سرو از علم بلند پایہ بر فرق سمن فگند سایہ
از شبنم گوہریں شمائل آراست گلوے گل حمائل
غنچہ بدر آمد از شبستاں پر شیر شدش ز ابر پستاں
بید از سرِ عجز چوں گہروار شد بر سر یاسمیں گہربار
نازک تن لالۂ دل افروز لرزیدہ شد از نسیم نوروز

خود اپنے کلام کی تنقید | بایں ہمہ کمال وہ اپنے کلام و شاعری کو خود پرکھتے ہیں اور خوب پرکھتے ہیں اپنا مرتبہ آپ بتاتے ہیں اور تواضع کا بیش بہا نمونہ پیش کرتے ہیں ؎

مشو خسرو بشعرِ خویش غرہ کہ گویندہ بسے ہست از پس و پیش
چو گفتِ خویش را بے عیب خواہی بچشمِ دشمناں بیں گفتۂ خویش

ہمہ کس گفتِ خود را خوب داند　　　　وگر یارست ہم تحسین کند بیش

دیباچہ غرۃ الکمال جو شعر و سخن پر ایک بے نظیر تبصرہ کہا جاسکتا ہی اُس میں شعرا کی تین قسمیں خسرو علیہ الرحمۃ نے بیان کی ہیں اوّل اُستاد کامل دوم نیم اُستاد سوم سارق پھر اُستاد کامل کے لئے چار شرطیں قرار دی ہیں۔ اوّل کسی طرز خاص کا موجد ہو۔ دوم اُس کا کلام شعرا کے انداز پر ہو واعظانہ وصوفیانہ نہ ہو سوم یہ کہ غلطیاں اور لغزشیں نہ کرتا ہو۔ چہارم یہ کہ مضامیں سرقہ نہ کرتا ہو۔

پھر اپنے متعلق یوں فرماتے ہیں کہ میں اُستاد کامل نہیں ہوں ہاں نیم اُستاد ہوں اس لئے کہ مجھ میں صرف دو شرطیں پائی جاتی ہیں۔ ایک تو میرا کلام شعرا کے انداز پر ہی دوسرے یہ کہ میں سارق نہیں ہوں۔ میں نہ تو کسی طرز خاص کا موجد ہوں نہ اس کا مدعی کہ میرا کلام لغزشوں سے پاک ہوتا ہی۔

انصاف پرستی و بے نفسی کی مثال اس سے زیادہ واضح اور کیا ہوسکتی ہے حاسد و معاند بھی اگر خسرو کا پایہ کم کرنا چاہے تو اس سے بڑھکر اور کیا کہہ سکتا ہی۔ اس طرح اپنے کلام کی آپ تنقید بے شائبہ نفس خصوصیات بلکہ اولیات خسرو ہی۔

تواضع و ہضم نفس | صاحب کمال کا یہ بھی کمال ہی کہ اُس میں شائبہ تک پندار وخودی کا نہ پایا جائے۔ نقادان فن کی نگاہوں میں جس قدر ایک باکمال کی عظمت بڑھتی جاتی ہی اُسی قدر خود اُس کے انداز میں تواضع بڑھتی جاتی ہی۔

ارباب قلم میں جتنے باکمال سخنور گزرے ہیں اُن میں کوئی رزم کا سماں باندھنے

ہیں کامل ہی کوئی بزم کا نقشہ کھینچنے میں یکتا ہے کوئی غزل سرائی میں بے نظیر ہے
کوئی قصائد میں بے ہمتا ہی کوئی اخلاقی رنگ میں فرید ہے کوئی متصوفانہ وحکیمانہ
آہنگ میں بے مثل۔ لیکن ایک جامع کمالات جس کے رشحات قلم سے نثر و نظم کی
تمام اصناف نے تر و تازگی پائی ہو اور جس نے اپنی پرجوش طبیعت کے اوج و موج
سے مضامین گوناگوں کا دریا بہا دیا ہو جب وہ اپنی ہیچمدانی کا اظہار کرتا ہے تو
اُس سے اُس کا کمال اور بھی ارفع و اعلیٰ ہو جاتا ہی۔ جیساکہ خسرو علیہ الرحمۃ باوجود اُس
جامعیت کے جو اُنھیں حق تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی اپنی کم مائگی و بے بضاعتی اس طرح
بار بار بیان کرتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہی کہ غرور و پندار کا ایک شمہ بھی
اس کامل الفن میں نہ تھا۔ حالانکہ شعر و سخن کا وہ میدان ہی جس میں تلامذہ نے اپنے
اساتذہ کو ہل من مبارز کہہ کر پکارا ہے۔ لیکن خسرو علیہ الرحمۃ کا یہ کمال ہی کہ اساتذۂ
متقدمین جن کا کلام ابتدا میں آپ نے مطالعہ فرمایا تھا اور جن کی پختہ و پسندیدہ
روش آپ نے اختیار کی اُن کا نام بھی ادب سے لیتے ہیں اپنے کو اُن کا ارادت مند
و شاگرد بتاتے ہیں اپنے تلمذ کو اس جوش عقیدت سے ظاہر کرتے ہیں کہ واقعی تلامذہ
جو اُن اساتذہ کے ہوں گے اُنھوں نے بھی اس سے زیادہ ادب آمیز کلمات نشائد
نہ کہے ہوں گے۔

نظامی سے اظہار عقیدت اور اُن کے کمال کا اعتراف

امام مثنوی گویان مولانا نظامی علیہ الرحمۃ کے کمال
اور اُستادی کا اس جوش عقیدت سے بار بار مختلف

مثنویوں میں ذکر فرماتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ اُن کے عہد میں موجود ہیں اور اُن سے اپنے مثنویوں کی اصلاح لے رہے ہیں۔ چنانچہ مثنوی مجنوں و لیلیٰ میں فرماتے ہیں ؎

زندہ ہست بمعنی اوستادم ورنیست منش حیات دادم

مولانا کا کمال اور اپنی بے مائگی کا یوں نقشہ کھینچتے ہیں ؎

میدا د چو نظم نامہ را پیچ باقی نگزاشت بہر ما ہیچ

مثنوی قران السعدین میں جن الفاظ سے مولانا کا کمال بیان کیا ہے وہ آداب سلف کا بہترین سبق آموز نمونہ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

نظم نظامی بہ اضافت چو دُر وز دُرِ او سربسر آفاق پر

پختہ از و شد چو معانی تمام خام بود پختن سودائے خام

ہر کہ دریں جنبش طبع آزمائے سر بہ نہی اوّل و آنگاہ پاے

مثنوی او راست ثنائے بگو بشنو و از دور دعائے بگو

از پئے بخشش بخدا آرزوے لیک عنایت ز بزرگاں بجوے

سوز سخن را نہ بجامی طلب پختگیش ہم ز نظامی طلب

اسی طرح جا بجا غزل سرائی میں اپنے ہمعصر و ہم عہد شاعر کہن مشق دیرینہ سال سعدی علیہ الرحمۃ کی جو شیراز میں بیٹھے ہوئے حقایق و معارف کی نغمہ سرائی غزلیات میں کر رہے تھے اُستادی تسلیم فرماتے ہیں۔ قران السعدین میں فرماتے ہیں ؎

ور غزلت یاد جوانی دہد | وز خوشی طبع نشانی دہد
تن زن ازاں ہم کہ کساں گفتہ اند | ہرچہ تو گوئی بہ ازاں گفتہ اند
نوبتِ سعدی کہ مبادا کہن | شرم نداری کہ بگوئی سخن

پھر اپنی ایک غزل کے مقطع میں یوں فرماتے ہیں ؎

خسرو سرمست اندر ساغرِ معنی بریخت | شیرہ زاں خمخانہ مستی کہ در شیراز بود

مثنوی نہ سپہر میں ایک جگہ سعدی و ہمام دونوں کو اُستادِ غزل تسلیم کرتے ہوئے اُن کے دیگر اصنافِ نظم پر نہایت محققانہ و مودبانہ تنقید فرماتے ہیں ؎

کس نہ بیند سوے نظمِ دگیر | کہ نہ گردد بدے منزل گیر
چوں نماند بدے خلقے یاد | گرچہ شہزادہ ہماں دل کہ نہ داد
تا بجائیکہ حد پارسیاں | اندریں عہد و وتن گشت عیاں
زاں یکے سعدی و ثانیش ہمام | ہر دو را در غزل آئینِ تمام
لیک اگر سوے دگر بارے ہست | شعر شاں ہست بداں گونہ کہ ہست

دیباچہ غرۃ الکمال میں نہایت وضاحت سے اس کی تصریح خسرو علیہ الرحمۃ نے خود فرما دی ہے کہ اصنافِ نظم میں سے کس پیشرو کی روش کس صنف میں اختیار فرماتے ہیں تفصیل کے لئے ناظرین کو غرۃ الکمال کی اشاعت کا منتظر رہنا چاہیئے۔ لیکن مجملاً اُس کا خلاصہ یہ ہے۔ فرماتے ہیں۔

قصائد میں خاقانی و اسمٰعیل کا پیرو ہوں مثنوی میں نظامی کا غزل میں سعدی کا

اتباع کرتا ہوں لیکن قطعات و رباعیات و دیگر اقسام نظم میں کسی غیر کے مسلک کا سالک نہیں ہوں بلکہ جو کچھ کہتا ہوں اور جس طرز و اسلوب میں کہتا ہوں وہ خود اپنا ہی ایجاد ہے"

اس بیان سے مقصد یہ ہے کہ خسرو کے کمال کا یہ پہلو بھی ناظرین کے سامنے آجائے کہ ع نہد شاخ پر میوہ سر بر زمیں

ورنہ اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ نظم آپ کی فطری چیز ہے اس روانی سے یہ نظم لکھتے ہیں جیسے کوئی نثر لکھتا ہو۔ گویا ان کے خیالات عالم بالا سے نظم ہی کے پیرایہ میں ان کے دماغ میں اُترتے ہیں۔

مضمون آفرینی میں یہ کسی کے مرہون منت نہیں بلکہ اپنے ہی دماغ کے معدن سے انھوں نے صفحۂ قرطاس پر لال و گہر اُگل دیئے ہیں چنانچہ خود ہی ایک جگہ فرماتے ہیں

ہر چہ من از خامہ فشانم بروں　　　گنج خدائیست کہ رانم بروں

لیکن یہ محض اسلاف کا پاس ادب ہے جو اُن کے برابر بیٹھنے کا دعوی نہیں کرتے اور نہایت انکسار سے یوں فرماتے ہیں ؎

چوں پس رو طرز ہر سوادم　　　پس شاگردم نہ اوستادم

متاخرین اور کمال خسروی کا اعتراف

اس ادب شناسی کا یہ صلہ ملا کہ خسرو علیہ الرحمۃ کے معاصرین اور شعرائے مابعد ہر ایک نے خسرو کو اپنے سے بہتر اور اپنا رہنما تسلیم کیا۔ ان کے کمال کو باکمالوں نے پہچانا اور ادب سے سر تسلیم خم کیا۔

امیر حسن علاء سنجری جو خسرو علیہ الرحمۃ کے ہم عصر اور غزل کے بے مثل اُستاد ہیں

جب وہ اپنے کلام کا خسرو علیہ الرحمۃ کے کلام سے مقابلہ کرتے ہیں تو اس طرح کہتے ہیں ؎

خسرو از راہ کرم بہ پذیرد　　انچہ من بندہ حسن می گویم
سخنم چوں سخن خسرو نیست　　سخن این ست کہ من می گویم

ملا عصمت بخاری اور بابا کمال خجندی جیسے باکمال اساتذہ بھی خسرو علیہ الرحمۃ کے خوشہ چیں ہیں بہارستان میں مولانا جامی نے اس کی تصریح کی ہے۔ اور کاتبی نیشاپوری نے ملا عصمت کے خصوص میں نہایت ہی لطیف قطعہ کہا ہے۔

(۲) قطعہ کاتبی نیشاپوری

میر خسرو را علیہ الرحمۃ شب دیدم بخواب　　گفتم این عصمت ترا یک خوشہ چین خرمن ست
شعر او چوں شعر تو اندر جہاں شہرت گرفت　　گفت باکے نیست شعر او ہماں شعر من ست

بابا کمال خجندی جو عجم کے ایک مشہور سخنور اور خواجہ حافظ اور عصار تبریزی کے معاصر و حریف مقابل ہیں ان کے متعلق امیر شاہی سبزواری یوں کہتا ہے۔

(۳) قطعہ امیر شاہی سبزواری

گر حسن معنی ز خسرو برد نتواں عیب کرد　　زانکہ استاد ست خسرو بلکہ ز استاداں زیاد
ور معانی حسن را برد از دیواں کمال　　ہیچ نتواں گفتن او را دزد برد ز داو فتاد

کمال سے مراد بابا کمال خجندی کی ذات ہے۔

(۴) قطعہ مرزا محمد طاہر آشنا

کسی نے مرزا محمد طاہر آشنا سے پوچھا کہ اگلوں میں کس کا کلام دلفریب ہے اور پچھلوں میں

کس کا شعر دلپذیر ہے۔ اس کے جواب میں ایک قطعہ لکھکر مرزا محمد طاہر نے بھیجدیا۔

اے کہ سوال کردۂ کز متقدمین کرا | ہست زیادہ در سخن شعر بلند و دل نشیں
وز متاخریں بود شعر خوشش کہ بیشتر | بیش ز ہمگناں بود طبع کہ معنی آفریں
نزد من اند در سخن زیں دو گروہ ایں دو تن | خسرو دہلوی ازاں قدسی مشہدی ازیں

ظہوری جو اپنے زمانہ میں نظم و نثر کا بے نظیر اُستاد تسلیم کیا گیا ہے وہ اُن مدعیانِ باطل کی بدمذاقی کا جنھیں خسرو کی ہمسری کا سودا سما گیا تھا اس طرح گلہ کرتا ہے۔

(۵) ظہوری اور بارگاہ خسروی کا ادب

بساط ادب برکراں افگنند | بہ خسرو غزل درمیاں افگنند

اس شعر سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ظہوری کا دل خسرو کی عظمت سے کس قدر لبریز ہے
خسرو کے بعد سب سے اول خواجو کرمانی ہیں جنھوں نے اپنا خمسہ مرتب کیا ہے ان کے شاعرانہ کمال کی نسبت صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ حافظ علیہ الرحمۃ جیسا مست با جوش و خروش شاعر بھی ان کا نام ادب سے لیتا ہے اور اپنے کو ان کا متبع کہتا ہے وہ اپنی مثنوی کمال نامہ میں خسرو کا اتباع کرنے والا اپنے آپ کو کہتے ہیں۔

(۶) خواجو کرمانی اور خسرو کی تقلید

سوختم ایں لخلخۂ خسروی | در طبق موہبتِ مولوی

مولانا جامی جن کی مثنوی نگاری خصوصیت کے ساتھ ممتاز سمجھی گئی ہے وہ ایک جگہ مولانا نظامی کا امام مثنوی گویاں صرف اس امر سے اثبات کرتے ہیں کہ خسرو کا

خمسہ بھی نظامی کے خمسہ سے بڑھ نہ سکا بلکہ اُس کے بعد کا اُسے مرتبہ ملا۔ نظامی کا خمسہ
دُرِ شاہوار ہے اور خسرو کا خمسہ زرِ خالص فرماتے ہیں۔

(۷) مولانا جامی اور خسرو

زویرانۂ گنجہ شد گنج سنج ــــ رسانید گنج سخن را بہ پنج
چو خسرو بداں پنجہ ہم پنجہ شد ــــ وزاں بازوئے فکرتش رنجہ شد
کفش بود زاں گونہ گوہر تہی ــــ زرش ساخت لیکن زرِ دہ دہی

ان اشعار سے جہاں نظامی کا فضل ثابت ہوتا ہے وہاں یہ بھی ثابت ہے کہ نظامی کے بعد مثنوی میں خسرو ہی کا مرتبہ ہے۔ دوسرے مثنوی نگاروں کا مولانا جامی کے نزدیک یہ مرتبہ بھی نہیں کہ اُن کا نظامی کے مقابلہ میں نام تک لیا جا سکے ۔ چہ جائیکہ مقابلہ۔

(۸) مولانا جامی کی دوسری شہادت

مثنوی تحفۃ الاحرار کے خطبہ میں مولانا جامی یوں تحریر فرماتے ہیں "ایں صدف پارۂ چند ست بے مقدار از جست و جوئی کارگاہ بے سرانجامی گرد کردہ شدہ و خزف ریزۂ چند بے اعتبار از رفت و روب بزم گاہ شکستہ جامی فراہم آوردہ چہ قدر آں دارد کہ در سلک جواہر شاہوار مخزن الاسرار حکیم گرامی شیخ نظامی انتظامش دہند یا در جنب جام زرنگار مطلع الانوار مورد بدائع لفظی و معنوی امیر خسرو دہلوی نامش برند چہ آں در جودت الفاظ و سلاست عبارات بمنزلہ ایست کہ فصیح زبانان عجم در بیان اوصاف

آں اعجمی اند۔ وایں دردقت معانی ولطافت اشارات بمثابۂ کہ نادرہ گویانِ عالم درمعرضِ جواب آں معترف بابکمی۔"

سخن سنج جام نے چند مختصر فقرات میں کیسی جامع تنقید مخزن الاسرار و مطلع الانوار پر کی ہے پھر نادرہ گویان کا مطلع الانوار کے جواب میں اپنے گنگ ہونے کا اعتراف خسرو کے اُستاد فن ہونے کا کیسا کھلا اقرار ہے۔

(۹) مولانا جامی کی تیسری شہادت

مولانا جامی ایک جگہ خدا سے دعا مانگتے ہوئے جہاں اپنے سخن کا عروج منزل گاہ نظامی تک چاہتے ہیں وہاں اس کی بھی تمنا فرماتے ہیں کہ خسرو جیسی پختگی و لطافت میرے کلام میں پیدا ہو جائے ؂

اہلِ دل از فکر چو محفل نہند — بادۂ راز از قدح دل دہند

رشحہ ازاں بادہ بجامی رساں — رونق نظمش بہ نظامی رساں

پست چو خاک ست بریزاز نوش — جرعۂ از جاگہ خسرو ش

قافیہ آنجا کہ نظامی سزاست — برگزر قافیہ جامی سزاست

بر سر خسرو کہ بلند اختر ست — از کفِ درویش گدا درخورست

(۱۰) امیر ہاشمی کرمانی اور کمال خسرو کا اعتراف

امیر ہاشمی کرمانی جو تقریباً مولانا جامی کے معاصر ہیں وہ اپنی مثنوی مظہر الآثار میں جو مخزن الاسرار کے رنگ میں لکھی ہے پہلے مولانا نظامی کے اُستاد فن ہونے کا اقرار

کرتے ہیں۔ اُس کے بعد خسرو ہی کی اُستادی تسلیم کرتے ہیں خسرو کے بعد جامی کا مرتبہ قرار دیتے ہیں۔ خسرو کے متعلق اُن کے اشعار یہ ہیں ؎

چوں ز قضا الحمد نو رسید | کو کبۂ نوبت خسرو رسید
خامہ برآور دبفکرِ جواب | مانند قلم بر ورقِ آفتاب
خامۂ خسرو چو گہر بار شد | نامۂ او مطلع الانوار شد
کرد دراں نامہ تکلف بسے | گفت جوابے کہ چہ گوید کسے
بزم سخن را بسخن ساز کرد | بر ہمہ کس راہ سخن باز کرد
فہم رموزش نکند ہر کسے | زانکہ معانیست بسے در بسے
زبدۂ اسرار حقایق ہمہ | محض اشارات دقایق ہمہ
گفتۂ او در نظر نکتہ داں | میدہد از علم لدنی نشاں
آنچہ دریں مائدہ افگند شور | سر بسر از قوت طبع ست و زور
ایں مئے صاف از قدح دیگر ست | مستی او را فرح دیگر ست
ہست دریں بزم گہِ دلفروز | نوبت ہر اہل دلے پنج روز
دور قدح طے شد و ساقی نماند | در خم دوراں مئے باقی نماند
چوں مئے خسرو بہ تمامی رسید | دورِ مئے عشق بجامی رسید

(۱۱) ضیاء برنی کا قول

مولانا ضیاء برنی صاحب تاریخ فیروز شاہی جو خسرو کے ہم عصر ہیں تحریر فرماتے

ہیں۔ امیر خسرو خسرو شاعران سلف وخلف بودہ است و در اختراع معانی و کثرت تصنیفات غریبہ نظیر نداشت و ہرچہ نسبت طبع لطیف وموزوں کندباری تعالےٰ اورا دراں ہنر سرآمد گردانیدہ بود۔ وجودے عدیم المثال آفریدہ و در قرن متاخر از نوادر اعصار پیدا آوردہ۔

(۱۲) سفینۃ الاولیا میں دارا شکوہ کی تحریر

امیر خسرو در شعر چناں قادر بودند کہ مطلع انوار راکہ در جواب مخزن اسرار است در دو ہفتہ تمام کردہ اند۔ و در اشعار ایشاں یکہ بیتہاست کہ کم کسے بآن خوبی گفتہ باشد۔ مضموں ہائے تازہ عالی در اشعار امیر آں قدر ست کہ اگر ہمہ راجمع کنند از تصانیف بعضے زیادہ میشود وہمیں طور در اقسام زبان وفنون علم ہندی بے مثل بودہ اند بجامعیت ایشاں کم کسے گزشتہ۔

(۱۳) شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد

امیر خسرو دہلوی رحمۃ اللہ علیہ وے سلطان الشعرا و برہان الفضلا ست در وادی سخن یگانہ عالم ونقاوہ نوع بنی آدم ست وے در سخن عالمے ست از عوالم خداوندی کہ پایاں ندارد آنچہ اورا از مضامین ومعانی در اطوار سخن وانواع آں دست داد ہیچ کس را از شعرائے متقدمین ومتاخرین ندادہ۔

شیخ رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ طبقات محدثین میں ہیں لیکن نظم سے بھی حصہ وافر کے مالک ہیں۔ آپ کے اشعار پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہتر نظم منظوم کرنے پر شیخ

رحمۃ اللہ علیہ کو خود بھی قدرت تھی بہرحال حدیث کی چھان بین کرنے والے کی نظر تنقیدی ہو ہی جاتی ہے۔ پس شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ایک جملہ مشعر کمال خسروی ہے۔

(۱۴) تذکرہ دولت شاہ سمرقندی

تذکرہ دولت شاہ میں ہے کہ امیر زادہ بایسغر خمسہ خسروی کو خمسہ نظامی پر ترجیح دیتا تھا اور خاقان مغفور الغ بیگ اسے قبول نہیں کرتا تھا۔ اس بحث نے یہاں تک طوالت اختیار کی کہ دونوں بادشاہوں میں کشاکش بڑھتے بڑھتے نوبت مقابلہ ومقاتلہ کی پہونچی۔ آخر میں دولت شاہ خسرو علیہ الرحمۃ کے متعلق یہ فقرات لکھتا ہے۔

القصہ معانی خاص و نازکیہائے امیر خسرو دہلوی وسخنہائے پر شور عاشقانہ او آتش در نہاد آدمی میزند خواجہ خسرو پادشاہ عاشقان ست از انش خسرو نام ست و در ملک سخنوری ایں نامش تمام ست درحق او مرتبہ سخن گزاری ختم ست ۔

(۱۵) آزاد بلگرامی

رئیس المحققین میر غلام علی آزاد بلگرامی فرماتے ہیں کہ حضرت سعدی شیرازی کے کلام میں اگرچہ خال خال وقوعہ گوئی پائی جاتی ہے جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہے (شعر سعدی)

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست
تا نہ گویند رقیباں کہ تو منظور منی

مگر ناسخ نقوش مانوی حضرت امیر خسرو دہلوی وقوعہ گوئی کے بانی تسلیم کئے گئے ہیں۔ حضرت خسرو فرماتے ہیں ؎

خوش آں زماں کہ بروئیش نظر نہفتہ کنم　　چو سوے من نگرد از نظر بگردانم

ولہٗ

غلام آں نفسم کا مدم چو خانہ او　　بخشم گفت کہ از در کشید بیرونش

ولہٗ

چو رفتم بر درش بسیار دربان گفت ایں مسکیں
گرفتارست شاید کایں طرف بسیار می آید

محقق بلگرامی ایک عجیب صنعت سے ان کے کلام کی داد دیتے ہیں یعنی خسرو کے دو شعروں سے دونوں آخر کے مصرعے لیتے ہیں اور اول مصرعہ اپنے طرف سے موزوں کر کے کلام خسرو کی داد دیتے ہیں ؎

آزاد　　خسرو

اے خسروِ شوخاں چہ کند وصفِ تو آزاد　　خوباں عملِ فتنہ ز دیوانِ تو یابند

دیگر

میر خسرو نمکیں شعر ترا خواند آزاد　　از نمکدانِ تو شد تازہ گرفتاریِ دل

میر آزاد بلگرامی نے جو تنقید کہ کلام خسرو پر کی ہے مو بمو راست ہے۔ خود ایک غزل میں خسرو علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

روح لیلیٰ آید و آموزد آئینہاے عشق
شعر خسرو گر رقم بر تربتِ مجنوں کنم

اگر تمام اقوال مصنّفین کے جو خسرو علیہ الرحمۃ کی نفس شاعری کے متعلق ہیں جمع کروں تو ایک رسالہ ہو جائے۔ لہٰذا اسی قدر پر بس کرتا ہوں

کہ مثنوی میں بعد نظامی علیہ الرحمۃ کی خسرو دہلوی سے بہتر کسی نے مثنوی نہیں لکھی۔ مولانا جامی خواجو کرمانی امیر ہاشمی کرمانی آذر اصفہانی سلم السماوات شرح الشعرا والہ داغستانی وغیرہ یہ سب اس کے معترف و مقر ہیں۔ قصائد میں خاقانی اور غزل میں سعدی کے بعد ہیں۔ باعتبار جامعیت کے کوئی ان کا مقابل نہیں۔ صاحب شعر العجم کی عبارت ملاحظہ ہو۔

(۱۶) شعر العجم کی عبارت

"ایران میں جس قدر شعرا گزرے ہیں خاص خاص اصناف شاعری میں کمال رکھتے تھے مثلاً فردوسی و نظامی مثنوی میں۔ انوری اور کمال قصائد میں سعدی و حافظ غزل میں۔ یہی لوگ جب دوسری صنف میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو پھیکے پڑ جاتے ہیں۔ بخلاف اس کے امیر قصائد مثنوی اور غزل تینوں میں ایک درجہ رکھتے ہیں مثنوی میں نظامی کے بعد آج تک ان کا جواب نہیں ہوا۔ غزل میں وہ سعدی کے دوش بدوش ہیں قصائد میں ان کی چنداں شہرت نہیں ہوئی لیکن کلام موجود ہے مقابلہ کر کے دیکھ لو۔ کمال اور ظہیر سے ایک قدم پیچھے نہیں"۔

اسی شعر العجم میں ایک دوسرے موقع پر ہے۔

"ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا۔ اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدّت میں دو ہی چار پیدا کئے ہوں گے صرف ایک

شاعری کرلو تو اُن کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے۔ فردوسی سعدی انوری حافظ عرفی نظیری بے شبہ اقلیم سخن کے جم و کے ہیں مگر ان کی حدود حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتیں۔ حافظ عرفی۔ نظیری غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے اور انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا۔ لیکن خسرو کی جہانگیری میں غزل مثنوی قصیدہ رُباعی سب کچھ داخل ہے اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی تضمین مستزاد اور صنائع و بدائع کا تو شمار نہیں۔"

خسرو کا حاسد عبید شاعر صفحات تاریخ سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ صاحبِ فضل و کمال کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ محسود ہو۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا باکمال گزرا ہو جس پر بعض بد نصیبوں نے حسد نہ کھایا ہو چنانچہ خسرو جیسا خوش طبع منکسر المزاج مسکین طبیعت محتاج دوست عاجز پرور اور دلنواز شخص بھی حاسدوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ سچ ہے ع

گل ست سعدی و در چشم دشمناں خار ست

دربار شاہی میں ایک ایرانی عبید نامی تھا وہ فضل و کمال میں جب خسرو کا مقابلہ نہ کر سکا تو آتش حسد سے جل بھُن کر کوئلہ ہو گیا۔ امیر خسرو پر طعن و تشنیع اور ان سے بغض و حسد ہی رکھنے کو اُس نے اپنا مایۂ ناز و افتخار سمجھا۔ صاحب شعر العجم کی بھی یہی رائے ہے۔ شعر العجم کے الفاظ یہ ہیں "بعض بعض ایرانی شعرا قومی تعصب کو چھپا نہیں سکے عبید ایک شاعر جو امیر خسرو کا معاصر ہے کہتا ہے کہ غلط او فتاد خسرو را الخ خسرو کا خمسہ جب طیار ہوا تو اس حیرت افزا

کمال نے اُسے ششدر تو کردیا لیکن حسد سے مجبور تھا داد کیونکر دیتا اس لئے کہ یہ شیوۂ اہلِ ہنر ہی نہ طریقِ حسود۔ آخر ایک شعر میں اپنے حسد ہی کا اظہار کیا ؎

غلط او فتاد خسرو راز خامی
کہ سکبا پخت در دیگ نظامی

ادبی مذاق رکھنے والوں سے یہ امر مخفی نہیں کہ اہل کمال کا ایک گروہ ایسا بھی گزرا ہے جسے معاصرین سے داد فضل کمال نہ ملی بلکہ بعض ایسے شترکا و فن جو اُن کے علوشان کے سمجھنے سے قاصر تھے اُنھوں نے نہ صرف اُن کے کمال کا انکار کیا بلکہ مطاعن کی بوچھار کی ہے۔ لیکن جبکہ معاصرت جو تنافر کی ایک قوی سلت تھی مٹ گئی تو پھر اُس کا آفتاب کمال ایسا چمکا کہ اُس کے انوار میں تمام ہلکی اور دھیمی روشنیاں جذب ہو کر فنا ہو گئیں۔

یاد ش بخیر غالب دہلوی کی شان میں اُس کے بعض معاصرین نے کیا کیا کچھ نہ کہا کسی نے تو یہ کہا ؎

کلامِ میر سمجھے ہم زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کی کہی یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

کسی نے اُس کے دیوان کے حجم و ضخامت پر یہ شعر چسپت کیا ؎

ڈیڑھ جز پر بھی تو ہی مطلع و مقطع غائب
غالب آسان نہیں صاحبِ دیواں ہونا

اس شعر کے کہنے والے آوج تخلص عبداللہ نام دہلی کے ایک شاعر گزرے ہیں جنھیں یہ
ناز تھا کہ سات دواوین مرتب کر چکا ہوں اور آٹھواں زیر ترتیب ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد
آبحیات میں لکھتے ہیں :۔

"ایک دن رستہ میں ملے دیکھتے ہی کہنے لگے آج گیا تھا اُنھیں بھی سُنا آیا۔
میں نے کہا کیا کڑک کر بولے ؎

ڈیڑھ جز پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالب آسان نہیں صاحب دیواں ہونا

پھر بیان کیا کہ ایک جلسہ میں مومن خاں بھی موجود تھے مجھ سے سب نے شعر کی فرمایش کی میں نے
ناسخ کی غزل پر غزل کہی تھی وہ سُنائی مقطع پر بہت حیران ہوئے ع

کہ جس کو کہتے ہیں چرخ ہفتم ورق ہے دیوان ہفتمیں کا

پوچھنے لگے کہ کیا آپ ساتواں دیوان لکھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہاں اب آٹھواں ہے بپا ہو گئے"
لیکن اب کہ وہ بساط لپٹ گئی۔ دنیا دیکھ رہی ہے کہ وہی ڈیڑھ جز کا دیوان ارباب
بصیرت کی آنکھوں کی عینک بنگیا۔ اور عبداللہ خاں جو آٹھ دیوان چھوڑ گئے اُن میں سے
آٹھ غزلوں کا بھی پتہ نہیں آج وہ اشعار جو غالب کی شان میں طنزیہ کہے گئے تھے کیا
کچھ بھی واقعیت رکھتے ہیں ؟

وہ شعرا اور اُن کے طعن آمیز اشعار کیا اس ثبوت میں پیش کیے جاسکتے ہیں کہ
غالب کا کلام بے معنی و مُہمل ہے اور اُسے صاحب دیوان نہیں کہا جاسکتا۔ چونکہ اُس کا

دیوان صرف ایک جلد ہی اور وہ بھی مختصر۔ پس کیا عبید کے اس شعر کو جو اسکی حاسدانہ طبیعت کی یادگار ہی اس ثبوت میں پیش کرنا کہ اہل ایران نے خسرو کو مثنوی نگار تسلیم نہیں کیا آفتاب پر خاک ڈالنا نہیں ہی؟

عبید کا افساد اور اُس کا انجام

صاحب منتخب التواریخ تغلق شاہ کا عہد بیان کرتے ہوئے ایک فتنہ کا یوں ذکر کرتے ہیں "دریں میان عبید شاعر مشہور مفتن معارض امیر خسرو علیہ الرحمۃ کہ ایں بیت ازاں بدبخت شہرت دارد غلط او فتاد الخ امیر در اکثر تصانیف از دست او وسعد فلسفی شکایت ہا کردہ و شیخ زادہ دمشقی بہ تقریب دیر رسیدن ڈاک چوکی از دہلی بدروغ آوازہ درانداختند کہ سلطان تغلق نماند۔ وفتورے عظیم در اہلِ اسلام رفت۔" اس کے بعد فتنہ اور پھر اُس کے اندفاع کا ذکر ہے آخر میں مفسدین کا ذکر کرتے ہوئے یوں لکھا ہی "عبید نیز ہم چناں منکوب بدست آمد و ایں جماعت را با خیل و تبار زیر پائے فیل انداختند در سنہ احدی وعشرین وسبعمائۃ" تاریخ فیروز شاہی میں مولانا ضیاء برنی کے الفاظ عبید کے متعلق یہ ہیں۔ "بدبخت خبیث فتان و مشطط"

اس عبارت سے صاف واضح ہی کہ عبید ایک مفسد فتنہ پرداز بے مایہ اور معمولی قابلیت کا شخص گزرا ہی شعر و سخن میں اُسے کچھ دخل ہی لیکن اس فن میں اسکا کوئی خاص پایہ نہیں اُس عہد میں عبید جیسے شاعر ہندوستان کے ہر گلی کوچے میں تھے۔ اُس کے اخلاق کی خامی و کمزوری اُس کی فتنہ پردازی و فساد انگیزی سے ظاہر ہے۔ کسی تذکرے میں بھی فقیر کی نظر سے یہ نہیں گزرا کہ اُس کے ثبوت شاعری میں

اُس سے کیا یادگار ہی نہ عبید کا دیوان ہے نہ مثنوی نہ قصائد۔ نہ کوئی اُس کے فضائل علمیہ ہی کا معترف ہی۔

خسرو کا اتباع اور اہل زبان

خسرو علیہ الرحمۃ کا یہ کتنا بڑا کمال ہے کہ ہندوستان میں پیدا ہوئے اسی جگہ نشو و نما پایا۔ اسی سرزمین میں اُن کی تعلیم و تربیت ہوئی لیکن کلام کا ایسا نمونہ چھوڑ گئے کہ اہل ایران نے اُس کی تقلید کی خسرو کے قصائد اہل ایران میں ایسے مقبول ہوئے کہ سلمان ساوجی وغیرہ نے بھی اُسے نمونہ بنا کر طبع آزمائی کی ہی جو شہادتیں کہ اوپر مذکور ہوئیں اُن سے اہل ایران میں کلام خسرو کی مقبولیت اور اہل زبان میں خسرو کے صاحب فن ہونے کا اعتراف بخوبی ثابت ہوتا ہے

ایک سطحی اعتراض اور اُس کا جواب

یہ اعتراض کہ خسرو علیہ الرحمۃ نے مولانا نظامی کے رنگ میں مثنویاں کیوں لکھیں اُنھیں داستانوں کو مکرر نظم میں کیوں لائے یہ کوئی اعتراض نہیں ہی بلکہ تعصّب کا نتیجہ ہے اس کا جواب پھر کیا دیا جائے۔ دنیا میں شاید ہی کسی موضوع پر ایسی کتاب کسی نے لکھی ہو جس موضوع پر اُس سے بعد آنے والوں نے اپنی قوت دماغی نہ صرف کی ہو بلکہ کبھی کبھی اتحاد موضوع کے ساتھ اتحاد اسم بھی پایا جاتا ہے۔ امام غزالی کی مشہور تصنیف تھافتہ الفلاسفہ ہے لیکن اسی نام کی اور دو کتابیں بھی موجو ہیں۔ ان تینوں کا موضوع ایک ہی لیکن انداز بیان ترتیب فصول سب میں جداگانہ ہی۔ شرح تجرید کے حواشی دیکھو دو نامور محقق یکے بعد دیگرے اُس کا ل لکھتے ہیں اور دونوں کے حواشی کا ایک ہی نام ہے یعنی قدیمہ۔ اسی طرح شیخ

بوعلی سینا کی معرکتہ الآرا کتاب اشارات ہے اُس کی بھی دو شرحیں ہیں اور دونوں شرح اشارات سے موسوم ہیں۔ شعر و شاعری میں جہاں صرف طبع آزمائی ہوتی ہے اُس میں اگر ایک ہی داستان کو دو شاعروں نے نظم کیا تو یہ اعتراض کیونکر ہوسکتا ہے۔

زورِ طبیعت کا اُسی جگہ صحیح اندازہ ہوتا ہے جہاں ایک ہی مضمون کو دو شخص بیان کریں اس سے ہر ایک کی قوّت فکریہ کا زور اور اُس کی رسائی معلوم ہوتی ہے۔ بدیں وجہ خسرو شیریں مجنون و لیلیٰ و داستان بہرام گور متعدد شعرانے نظم کی ہیں جن میں سوائے امیر خسرو کے سب اہلِ زبان ہیں۔ پھر خسرو پر اس اعتراض کی تخصیص کیا ہے۔ خسرو نے نام رکھنے میں جو صنعت قلب سے کام لیا ہے اُس سے ایک لطف پیدا ہو گیا مثلاً مولانا نظامی کی کتاب کا نام لیلیٰ مجنوں ہے اور ان کی مثنوی کا مجنوں لیلیٰ۔

اساتذۂ فن کے کلاموں پر جن کی نظر ہے اُن سے یہ امر مخفی نہیں کہ ایک ہی مضمون ہوتا ہے جسے ہر ایک شاعر کہتا ہے لیکن ہر ایک کا انداز جدا ہر ایک کی بندش الگ کہیں اگلوں کے کلام میں لطافت ہوتی ہے اور کہیں پچھلے اُس مضمون کو زیادہ پُر تاثیر بنا دیتے ہیں مثلاً سعدی کا ایک شعر ہے۔

پہلی مثال

بجز ایں گنہ ندارم کہ محبّ و مہربانم ۔۔۔ بچہ جرم دیگر از من سرِ انتقام داری

اسی مضمون کو خسرو کہتے ہیں ؎

گفتم کہ ہمیں ترا غلامم ۔۔۔ گر ہست گناہِ من ہمیں ست

خسرو کے شعر کا لطف ظاہر ہے صرف ایک لفظ غلام نے وہ خوبی پیدا کر دی ہے جو محب و مہربان کے دو لفظوں سے بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اُس پر گناہ کا اقرار حرف شرط کے ساتھ ایک عجیب لطف دے رہا ہے۔

کیا خسرو پر یہ اعتراض کیا جائے گا کہ جبکہ سعدی کا شعر موجود تھا تو پھر اس مضمون کے ادا کرنے میں کیوں وقت ضائع کیا گیا۔

دوسری مثال

خسرو کا ایک شعر ہے ؎

گفتہ بودے خسروا در خواب رُخ بنمایمت ایں سخن بیگانہ را گو آشنا را خواب نیست

اسی مضمون کو جامی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

گفتی شبے بخواب تو آیم ولے چہ سود چوں من بعمرِ خویش ندانم کہ خواب چیست

خسرو جن کا زمانہ جامی سے بہت پیشتر ہے جبکہ اُن کا ایسا پر لطف شعر موجود تھا تو پھر جامی کو ایسا شعر لکھنا جو لطف میں بھی خسرو کے شعر سے پیچھے ہے کیا ضرور تھا۔ کیا یہ اعتراض مولانا جامی پر ایک فضول ولا یعنی اعتراض نہیں؟

تیسری مثال

میر تقی میر کا ایک شعر ہے ؎

جاتا ہے آسماں لئے کوچہ سے یار کے آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

غالب دہلوی کہتا ہے ؎

سر پھوڑتا وہ غالبِ شوریدہ حال کا　　یاد آگیا ہمیں تری دیوار دیکھکر

خلاصہ یہ کہ کوئی مضمون جسے متقدم نے کہا ہو اگر اُسے کوئی متاخر کہے تو اگر دونوں کے کلام میں باعتبار بندش و ترکیب الفاظ مساوات ہی تو فضل متقدم کی طرف ہو گا۔ لیکن اگر متاخر نے اُس میں کوئی لطف پیدا کیا تو پھر یہ مضمون اُس کا ہو جائے گا اور یہ ایک طرح کی صنعت شمار کی جاتی ہی جسے ابداع کہتے ہیں۔

جواب کا دوسرا حصّہ یہ واقعہ ہی کہ ہر شاعر کی طبیعت ایک خاص رنگ رکھتی ہی اور اُس کے بیان کا اسلوب ایک خاص طرز رکھتا ہی۔ اکثر کلام اُس کا اُسی رنگ و روش میں پایا جاتا ہی۔ لیکن کبھی کبھی وہ اپنے مخصوص طرز سے علیحدہ ہو کر کسی دوسرے طرز میں بھی طبیعت کی جولانی دکھاتا ہی جس سے یہ معلوم ہوتا ہی کہ دوسری روش بھی اُس کی قدرت سے باہر نہیں۔

مثلاً غالب کی نازک خیالی اور دقت پسندی ضرب المثل ہی جیسا کہ وہ خود کہتا ہے

مشکل ہی زبس کلام میرا اے دل　　سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمایش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

لیکن جب کبھی اُس کا جی چاہتا ہی تو اپنے خاص رنگ سے علیحدہ ہو کر سہل کہنے پر جو آتا ہی تو سہل ممتنع میں بھی اپنی اُستادی ثابت کر دیتا ہی۔ مثلاً اُس کی ان غزلیات کو دیکھئے جن میں سے ایک ایک شعر یہاں درج ہی ؎

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری　　اور پھر وہ بھی زبانی میری

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام　　ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید　　نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

خسرو اور مجتہدانہ طبیعت خسرو علیہ الرحمۃ ایک مجتہدانہ طبیعت لے کر اس عالم کون و فساد میں آئے تھے۔ ناظرین تھوڑا صبر کریں نواب حاجی محمد اسحٰق خاں صاحب کے جود و کرم کا چشمہ عنقریب اُنھیں سیراب کر دے گا۔ بہت بڑا حصّہ کلام خسرو کا تصحیح و مقابلہ کی منازل سے گزر کر تنقید و تقریظ کے مقام تک آچکا ہے۔ جس وقت خسرو کا کلام ناظرین کے سامنے ہوگا اُس وقت یہ فیصلہ خود بخود ہو جائے گا کہ بیشک خسرو میں مجتہدانہ قابلیت موجود تھی۔ آپ کی مثنوی تغلق نامہ، خضر خاں و دیول دیبی اور مثنوی نہ سپہر آپ کی جدّت و جودت آفریں طبیعت پر گواہ ہیں یہ تینوں تاریخی مثنویاں ہیں۔ واقعات ایسی صحت سے لکھے گئے ہیں کہ اُس عہد کی بہترین تاریخ یہی مثنویاں ہیں تاریخی بحث ایک خشک مضمون ہے لیکن خسرو نے اپنی جادو بیانی سے ایسا رنگین اُسے کر دیا ہے کہ تاریخ اپنی صحت کے ساتھ باقی رہی اور مضمون میں دلکشی و دل آویزی پیدا ہو گئی۔ نہ سپہر کی ترتیب بھی ایک جدّت رکھتی ہے۔ اس مثنوی کے نو باب ہیں ہر باب کو سپہر سے تعبیر کیا ہے۔ پھر ابتدا نویں آسمان سے کی ہے اُس کے بعد آٹھواں پھر ساتواں اسی طرح پہلے سپہر پر خاتمہ ہے۔ ہر سپہر کا عنوان آخر میں ہوتا ہے اور ہر سپہر کی بحر ایک نئی بحر ہوتی ہے۔ اس طرح یہ مثنوی نو بحروں پر مشتمل ہے خسرو کی اس مثنوی کا جواب آج تک نہ ہو سکا۔ بعضوں نے سبحۃ الابرار جامی کے متعلق یہ لکھ دیا کہ

یہ مثنوی نہ سپہر کے ہم رنگ ہے۔ بغیر کتاب دیکھے جو اجتہاد و قیاس کیا جاتا ہے وہ ایسا ہی غلط ہوتا ہے
لیکن خمسہ میں خسرو نے اپنی روش چھوڑ کر حضرت نظامی کی روش اختیار کی ہے اور یہ
ثابت کر دیا کہ اس روش میں بھی مثنوی کہہ سکتا ہوں۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

میخواست بسے دلِ ہوس باز — کز سحرِ قدیم نو کنم ساز
پے بر پئے او چناں کہ دانم — گفتم قدمے زدن توانم
از شیوۂ خود رمیدہ گشتم — تسلیمِ ہماں جریدہ گشتم
چیدم بقلم نمونۂ پیش — بردم زمیاں تکلفِ خویش
زاں کردہ ام ایں نوائے خوش ساز — تا گوشِ زمانہ را کنم باز
ذوقے کہ دریں دمِ حیات ست — ہمشیرۂ اوّلیں نبات ست

خسرو علیہ الرحمۃ اپنی مثنوی مجنوں لیلیٰ کے متعلق آخر شعر میں فرماتے ہیں کہ یہ کتاب اوّلیں
نبات (یعنی لیلیٰ مجنونِ نظامی) کی ہمشیرہ ہے۔ جس طرح کہ یہ مثنوی مجنوں لیلیٰ کے متعلق دعوے
کیا گیا ہے دیگر مثنویوں کے متعلق بھی کیا جا سکتا ہے خود اسی مثنوی ہشت بہشت کو بخیال
نکتہ چینی اوّل سے آخر تک اُٹھا کر پڑھ جائے۔ کسی جگہ اور کسی موقع پر کسی قسم کا مضمون
آپ ایسا نہ پائیں گے کہ اُس کو آپ کسی مضمون کی نقل خیال کر سکیں یا پیش رو اور پیرو
کا فرق محسوس ہوا گرچہ وہی قصہ ہے وہی داستان وہی عالم ہے وہی جہان۔
جیسے متاخرین اہلِ کمال نے جو امام فن مسلم ہو چکے ہیں جب کسی متقدم کی غزل پر غزل
[illegible] توجہ [illegible] اشعار میں بھی وہ اسے نقصان کو پوشیدہ نہ کر سکے اور یہاں دفتر کے دفتر

موجود ہیں مگر ممکن نہیں کہ کوئی منصف شخص یہ کہہ سکے کہ یہ نقل ہے اور وہ اصل یا یہ اصل ہے اور وہ نقل۔

نظامی و خسرو کا مقابلہ | نہایت تفصیل سے مثنوی میں مولانا نظامی کا کمال ابھی ہم بیان کر چکے ہیں لاریب مولانا کی مثنویاں باوجود بیشمار جوابوں کے بھی آج تک لاجواب رہیں۔ خود امیر خسرو کی بے نظیر انصاف پسندی بار بار مولانا کے کمال کا اعتراف کرتی ہے۔ مثنوی مجنوں لیلیٰ میں اُن لوگوں کو جو خسرو پر نظامی کا نام لے کر طعن کیا کرتے تھے مخاطب بنا کر فرماتے ہیں ؎

گر ماز ہنر تہی میانیم — بارے تو بگوی تا بدانیم

از دعویِ این خیال سنجی — ناگفتہ ملاف تا نہ رنجی

بنود چو فسانۂ تو نامی — بیہودہ چہ لافی از نظامی

گفتی دم اوست مُردہ راز یست — آں زانِ ولیست زانِ تو چیست

گر زاں قدح آری آبخوردم — بے گفتِ تو اعتراف کردم

یہ واقعہ ہے کہ مولانا نظامی نے بغیر کسی نمونہ کے صنف مثنوی کو ایسا آراستہ و پیراستہ کیا کہ سو برس تک تو کسی کی ہمت مثنوی لکھنے کی نہ ہوئی۔ اور بعد سو برس کے جنھوں نے مثنویاں لکھیں تو وہ نظامی جیسی کوئی نمایاں ترقی نہ کر سکے۔ اس لئے کہ وہ اس مرتبہ کمال تک مولانا کے پُرزور قلم سے پہنچ چکی تھی جو انسان کی قوۃ فکریہ کی انتہائی منزل ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ مولانا نظامی جس روش کے موجد ہونے کا فخر رکھتے ہیں

اُس کے مکمل ہونے کا بھی سہرہ اُنھیں کے سر ہے۔ یہ دو کمال یعنی ایجاد و تکمیل مولانا کے ایسے ہیں جن میں کوئی اُن کا ہمسر نہیں خسرو کا نظامی سے جب مقابلہ کیا جائے گا تو یہ حیثیت ضرور ملحوظ ہو گی۔

نظامی کی فارغ البالی خسرو علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ مولانا نظامی یک فنی تھے طبیعت کا سارا زور مثنوی پر ختم کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کا فراغ عطا فرمایا تھا مولانا کو نہ کوئی دوسرا خیال تھا نہ طبیعت پر کسی طرح کا بار۔ اطمینان و سکون سے کلام میں کمال پیدا کرتے رہے۔ خسرو کے وہ اشعار یہ ہیں ؎

اوزان ہمہ فکرِ گوہر آمائے	نہ نہاد زیکے وش بروں پائے
وانگہ زجہاں فراغ جستہ	وزشغلِ زمانہ دست شستہ
بارے نہ بدل مگر ہمیں یار	کارے نہ دگر مگر ہمیں کار
کوشش ہمہ در سخن سگالی	خاطر زہر التفات خالی

اس کے بعد اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ میں مسکین ہوں بندگی سے چارہ نہیں پیٹ کے لئے مزدوری کرتا ہوں صبح سے شام تک اپنے ہی جیسے انسان کے آگے پاؤں پر کھڑا رہتا ہوں۔ اس محنت و ملازمت کا جب صلہ دیتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حق محنت و مزد نہیں دیتے بلکہ احسان کر رہے ہیں۔ خود خسرو کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مسکین منِ مستمندِ بیہوش	از سوختگی چو دیگ در جوش

شب تا سحر از صباح تا شام — درگوشۂ غم نگیرم آرام

با شمع زبرائے نفسِ خود درائے — پیشِ چو خودے ستادہ برپائے

تا خوے نرود زپائے تا سر — دستم نشود زآبِ کس تر

مرد کہ دہند منتِ داد — واں رنج کہ من برم ہمہ باد

چوں خرکہ علف کشد بزاری — ریزند جوش ولے بخواری

باوجود اس کے خسرو کا یہ کتنا بڑا کمال ہے کہ خمسہ نظامی کے بعد انھیں کا خمسہ جگہ پاسکا۔ حالانکہ جلال فراہانی، خواجو کرمانی، عماد فقیہ کرمانی۔ مولانا کاتبی۔ ہاتفی وغیرہ وغیرہ سبھوں نے طبع آزمائیاں کیں لیکن اہلِ زبان ہونے پر بھی خسرو کے مقابل نہ ہو سکے۔ اس پر بھی اگر کسی کو خسرو کا کمال نہ دکھائی دے تو اس کا کیا علاج۔ خسرو علیہ الرحمۃ نے مثنوی قران السعدین میں اس کا بہت ہی اچھا فیصلہ کر دیا ہے

باز کسے را کہ حسد رہ زند — زخمہ دریں رہ نہ یکے۔ دہ زند

جس کی راہ حسد نے مار رکھی ہو — وہ ایک چھوڑ دس اعتراض کرے گا

گر بمثل صد ہنر آرم زغیب — ہیچ نگاہے نکند۔ جز بہ عیب

مثلاً اگر میں سو ہنر کی باتیں پیدا کروں — تاہم حاسد عیب کی ہی طرف نظر کرے گا

صد سخنِ راست نگیرد بہ ہیچ — یک رقم کژ کند انگشت پیچ

سو اچھے شعر اس کے نزدیک بے قدر ہیں — لیکن سقم ایک بھی ہو تو اسے انگشت نما بنائے گا

گر بہ ازیں بیت گہر سفتنش — عیب بود عیبِ کساں گفتنش

اگر اُس کی سخن طرازی مجھ سے بہتر ہے — تو دوسروں کی عیب چینی خود اُس کے لیے عیب ہے

ورکم ازیں مایہ رسیدش زغیب — طفلِ رہِ ماست زطفلاں چہ عیب

اور اگر اس کا کلام مجھ سے پست — تو وہ ابھی اس راہ میں بچہ ہی ہے بچوں کے کہے کا بُرا ماننا کیا

الحمدللہ کہ اُن مضامین سے فرصت ملی جن کی ترتیب علاوہ تنقید ہشت بہشت کے فقیر کے متعلق کی گئی تھی مولیٰ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اُس جناب کا اسے مقبول وپسندیدہ فرمائے جس کے کلام وکمال کا نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

آخر میں اُس بزرگ ومخلص کی دُعا کا خواستگار ہوں جس کی پیہم سرگرمیوں نے مجھ جیسے کاہل وناکارہ کو بھی معطل نہ چھوڑا۔ فجزاہ اللہ عنی خیر الجزاء۔

مثنوی ہشت بہشت

مثنوی کی بنا اور اُس کے ادوار

باخبرہ روان علم سے یہ امر مخفی نہیں کہ رودکی نے سب سے پہلے مثنوی کی بنیا و رکھی۔ فردوسی نے اوس پر ایک شان دار عمارت قائم کی۔ مولانا نظامی رحمہ نے اوس محل کو آراستہ اور نقش و نگار سے پیراستہ کیا۔ امیر خسرو علیہ الرحمۃ نے سو برس بعد اوس پر ایسی نظر افروز قلعی چڑھائی جسے دیکھکر ان سے بعد آنے والے شعرا اپنی طبیعت کو قابو میں نہ رکھ سکے اور ہر ایک نے اپنے اپنے عہد میں اس بات کی کوشش کی کہ اس محل دلکشا میں کہیں میرا کمال بھی آویزاں ہو جاے۔ لیکن اہل معانی و سخن شناس با انصاف جانتے ہیں کہ اُن اہل کمال کی تمنائیں کہاں تک سرسبز ہوئیں ؎

المنۃ للہ کہ حق بیں ہیں یہ آنکھیں   احسان خدا کا کہ یہ دل گھر ہے خدا کا

مثنوی ہشت بہشت

اس وقت پیش نظر امیر علیہ الرحمۃ کی مثنوی ہشت بہشت ہی جو آپ کے خمسہ میں باعتبار ترتیب تصنیف سب سے آخر دور کی پر جوش صہباے عرفان کا پیمانہ ہی۔ جیسا کہ خود اِس کتاب میں ہم نشین علی کی زبان سے فرماتے ہیں ؎

چوں بعنوانِ پنجم آمد حرف   تا چہ گنجینہ کرد خواہی صرف

امیر صاحب نے اس مثنوی کو ۷۰۱ھ میں تحریر فرمایا ہی۔ اوس وقت

آپ کی عمر اکیاون سال کی تھی۔ کل اشعار اِس کے تین ہزار تین سو پچاس ہیں جیسا کہ اِن اشعار سے ظاہر ہی ؎

ہمہ بیتش بگاہ عرض شمار سہ صد و پنجہ آمد و سہ ہزار

سال ہجری یکے و ہفصد بود کیں بنا بر دسر بچرخ کبود

بحر اس کی خفیف مسدس مخبون مقصور ہے۔ یعنی فاعلاتن مفاعلن فعلات یوں تو شاعر کے آخر عمر کا کلام سابق کے کلام سے پختگی و برجستگی صفائی و استواری میں بڑھ کر ہوتا ہی ہے لیکن امیر صاحب نے کوشش بھی کی ہی کہ اس کتاب میں شاعری حد کمال تک پہونچ جائے۔ فرماتے ہیں ؎

کوش کیں خط چناں نگاری چست کہ فزوں آید از چہار نخست

کاولیں نکتہ گرچہ چست بود آخریں بہتر از نخست بود

چنانچہ جب یہ مثنوی تمام ہوچکی تو امیر صاحب نے اوس کو ویسا ہی بہتر و برتر پایا جیسا کہ اون کی تمنا تھی۔ اپنی اِس کامیابی کی طرف بھی اشارہ فرماتے ہیں ؎

گر بود نا قدِ خزانہ راز داند اندیشۂ مرا پرواز

مثنوی بمقابلہ دیگر اصناف نظم کے

اِن جزئیات کے بعد دو باتوں کا بیان کر دینا نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ اوّل یہ کہ شاعر مثنوی لکھنے کے قابل کب ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ کون سے محاسن ہیں جن سے مثنوی کی آرائش تمام ہوتی ہے۔ امر اوّل کے متعلق ارباب تحقیق کی یہ رائے ہے کہ شاعر مثنوی اس وقت

لکھتا ہے جب کلام پر اوس کو پوری قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ کسی واقعہ کو نظم میں بیان کرنا وزن و قافیہ کا سبنھالے رکھنا شاعرانہ تخیل کو ہاتھ سے ندینا برائے بیت الفاظ کا داخل نہونا اور ربط کلام پر خیال رکھکر مسلسل واقعات کا بیان کرنا نہایت ہی اہم و معرکۃ الآرا رہے۔ اسلئے مثنوی نظم نگاری میں اعلیٰ درجہ کا فن شمار کیا جاتا ہے۔ امر دوم کے متعلق سخن سنجوں کی یہ راے سدید ہی کہ چھ باتیں ہیں جو مثنوی کے لئے ستّۂ ضروریہ کہی جاسکتی ہیں (۱) آداب سخن کی پاسداری و نگہداشت (۲) قافیہ کا ردیف کے ساتھ دست و گریبان ہونا اور صحت قوافی کا لحاظ (۳) شاعرانہ علم کلام اور قیاس شعری کی قوت (۴) کسی خاص مضمون کو طرق مختلفہ سے بیان کرنا۔ مثلاً آفتاب کا طلوع و غروب صبح و شام کی جلوہ آرائی۔ گلوں کے قہقہے۔ بلبلوں کے چہچہے۔ معشوقوں کے سراپا کے مرقعے۔ عشاق کی مہجوری و حرماں نصیبی کے نقشے۔ ہمکناری کے شوق۔ ہم آغوشی کے ذوق وغیرہ وغیرہ (۵) صنایع و بدائع لفظی و معنوی و مراعات النظائر (۶) سب سے آخر مگر سب سے اہم تسلسل ہے۔ یعنی واقعات کے سلسلہ کی کوئی کڑی نکلنے نہ پائے جس شخص کا بیان ہو اوس کی حیثیت و شان کا لحاظ ابتدا سے انتہا تک قایم رہے۔ شعرا نے مثنوی کے لئے جو بحریں اختیار کی ہیں وہ سب چھوٹی بحریں ہیں قافیہ چھوڑکر دو تین لفظوں میں مصرعہ پورا ہو جاتا ہے اب شاعر کا کمال یہ ہے کہ اونھیں دو تین لفظوں میں واقعہ نگاری۔ سخن آفرینی اور

کلام کی سلاست و روانی کا جوہر دکھا دے۔

مثنوی ہشت بہشت کا درجہ

امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی مثنوی ہشت بہشت اس وقت پیش نظر ہو۔ ان نکات کو خوب سمجھے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ زباندان ہو کر جب کسی اہل زباں کے پہلو بہ پہلو چلتے ہیں تو کتنے اہل زبان ہیں جنکو اپنے دامن کی ہوا بھی پانے نہیں دیتے۔ آپ کی مثنوی ہشت بہشت تمام اُن محاسن سے آراستہ ہے جو مثنوی کے زیور قرار دیے جائیں۔ لیکن واقعات کے تسلسل اور استقصاے جزئیات میں ایسی کامل ہے کہ بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس وصف خاص میں کوئی مثنوی اس کی ہمسری کا دعویٰ کر نہیں سکتی چاہے متقدمین کی ہو یا متاخرین کی۔ یہ مثنوی بھی اپنی سابق کی چار مثنویوں کی طرح سلطان علاء الدین خلجی کے نام سے معنون ہے۔ فلسفہ تاریخ سے آشنا جب عہد علائی پر ایک گہری نظر ڈالتا ہے اور پھر اس مثنوی کو پڑھتا ہے تو نصیحت گری کا یہ انوکھا طرز اور تنبیہ و بیداری کا جدید پر لطف سبق دیکھکر بے اختیار کہہ اوٹھتا ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں — گفتہ آید در حدیث دیگراں

اس تمہید کے بعد مقصود یہ ہے کہ مثنوی کے جن محاسن کا بیان مجملاً ہوا۔ اور جنکے متعلق ہشت بہشت میں پایا جانا کہا گیا اُن امور کی تفصیل و تمثیل مثنوی ہشت بہشت کے اشعار لیکر کر دیجاسے۔ ہر چند مثنوی ہفت پیکر مولانا نظامی کے ساتھ ساتھ اگر اشعار کی خوبی بیان کی جاتی تو لطف مزید حاصل ہوتا۔ لیکن یہاں صرف خسرو

کی شاعری کا کمال دکھانا ہے کہ اِس کتاب میں آپ نے کہاں تک قادر الکلامی کی داد دی ہے اور مثنوی کا حق کس حد تک ادا کیا۔ رہا حضرت نظامی کی ہفت پیکر سے مقابلہ اُس کا بیان آیندہ آئیگا اگرچہ خسرو جیسے باکمال وجامع شاعر کے کمال شاعری کا اظہار مجھ جیسے بے بضاعت کے لئے درخورِ حوصلہ نہیں ہوسکتا ؎

دامانِ نگہ تنگ وگل حسنِ تو بسیار　　گلچینِ بہار تو ز داماں گلہ دارد

مگر محض بخیال امتثال امر جابجا سے گلہائے مضامین لیکر ایک گلدستہ طیار کیا جاتا ہے خدا اسے مقبولیت عطا فرمائے ؎

الٰہی رنگِ تاثیرے کرامت کن فغانم را　　بموجِ اشکِ بلبل آب دِہ تیغ زبانم را

مثنوی ہشت بہشت کے قصّے

جو قصہ کہ اِس مثنوی میں منظوم ہوا ہے وہ بہرام گور (شاہ ایران) کی عیش پرستی کا ہے مولنا نظامی نے بھی اسی داستان کو ہفت پیکر میں بیان کیا ہے۔ بہرام گور کے متعلق تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس نے دیار عرب میں تربیت پائی تھی اور عربوں ہی کی گود میں اس کا نشو ونما ہوا تھا۔ بہادر تھا شجاع تھا صید وشکار کا شوقین تھا لیکن طبیعت عیّاشانہ پائی تھی جس پر ایران کی آب ہوا سے بہار رچھا گئی تھی۔ اہل روم سے اُس کے کئی معرکہ ہوئے۔ میدان مصاف کی بارہا گرما گرمی نے اُس کے جوہر شجاعت کو اور بھی چمکا دیا تھا۔ ہندوستان سے اُس کا تعلق تھا

چنانچہ ہندوستان کی ایک عورت اُس کے پاس تھی جس کے شمع حسن کا وہ پروانہ تھا۔ یہی عورت اُس کے ساتھ صید و شکار میں بھی رہتی تھی اور غالباً یہی دلارام ہے۔ شکار کا شوقین تو تھا ہی اتفاقاً ایک روز کسی گورخر کا تعاقب کرتے ہوئے ایک کوئیں میں آرہا اور اوسی جگہہ خود موت کا شکار ہو گیا۔ تاریخ میں بہرام کے متعلق جو کچھ ہے اوس کا خلاصہ اسی قدر ہے۔

مولانا نظامی نے ہفت پیکر میں چند ابواب خسرو سے زیادہ قائم کئے ہیں جن میں خاقان چین سے بہرام کی جنگ و فتح کا ذکر ہے۔ کہیں اُس کے شیر مارنے کی تعریف کہیں اُس کے اژدہا مارنے میں بہادری کا تذکرہ۔ کچھ وہ واقعات ہیں جو اُسے مالک تخت و تاج ہونے میں پیش آئے ہیں۔ غرض چھوٹے چھوٹے پندرہ بیس عنوان انہیں جزئیات میں ہیں۔ پھر اُن کے ذیل میں کہیں کوئی حکایت آجاتی ہے اور کہیں کوئی تمثیل۔ ان عنوانوں کے علاوہ وہ سارے ابواب ہفت پیکر میں موجود ہیں جو ہشت بہشت میں ہیں صرف مدح شیخ کا ایک عنوان (جیسا کہ عموماً خسرو کی مثنویوں میں ہوا کرتا ہے) اس مثنوی میں بھی موجود ہے ہفت پیکر میں نصیحت کا مخاطب بیٹا ہے اور ہشت بہشت میں بیٹی باقی تمام بیان ایک ہیں خسرو کی کتاب ہشت بہشت میں حسب ذیل اکیس ابواب ہیں۔

حمد[۱]۔ نعت[۲]۔ معراج[۳]۔ تعریف[۴] بادشاہ۔ خطاب[۵] بسوے بادشاہ۔ سبب[۶] تالیف نصیحت[۷] بدختر۔ صفت[۸] دلارام و شکار[۹] بہرام۔ رنجیدن[۱۰] بہرام و گذاشتن دلارام

آراستہ[11] شدن محل بہرام۔ گنبد[12] مشکیں۔ گنبد[13] زعفرانی۔ گنبد[14] ریحانی۔ گنبد گلناری[15] گنبد[16] بنفشجی۔ گنبد صندلی[17]۔ گنبد[18] کافوری۔ وفات[19] بہرام۔ خاتمہ[20]۔ شکر[21] گزاری حق تعالیٰ۔ خسرو علیہ الرحمۃ بہرام گور کی داستان اِس طرح شروع فرماتے ہیں کہ بہرام کو گورخر کے شکار کا بہت ہی شوق تھا سوائے اُس کی ران کے اور کسی طرح کا گوشت پسند نہیں کرتا تھا۔ بغیر شکار گورخر اُسے چین نہیں پڑتا تھا۔

دلارام اوس کی معشوقہ ساتھ ہوتی تھی ایک روز کسی خلاف طبع امر پر خفا ہو کر بہرام نے اوس کو جنگل میں چھوڑ دیا۔ دلارام ایک گاؤں میں پہونچکر نغمہ سرائی سیکھتی ہے اور اوس کمال کی وساطت سے پھر بہرام کی معشوقہ بنتی ہے۔

بہرام کے وزیر دانا نے جب بہرام کا انہماک صید و شکار میں حد سے زیادہ دیکھا تو اوس نے اوس کے لئے ایک قصر عالیشان بنوایا۔ جس میں سات گنبد تھے گنبد کی رونق کا سامان یہ کیا کہ ہفت اقلیم کے بادشاہوں کے پاس عاقل و مدبّر اشخاص شاہانہ تحائف کے ساتھ بھیجے اور اون سلاطین سے بہرام کے لئے اون کی لڑکیوں کی استدعا کی۔ قاصد کامیاب واپس آئے۔ ہر اقلیم کی شاہزادی ساتھ ساتھ لائے۔

وزیر نے ایک ایک گنبد میں ایک ایک شاہزادی کو جگہہ دی۔ بہرام ہر رات ایک شاہزادی کے ساتھ ہم خواب ہوتا ہے۔ نیند آنے کے لئے شاہزادی سے کسی قصّہ کی فرمایش کرتا ہے وہ شاہزادی معذرت کرتے ہوئے پہلے

بہرام کو دعائیں دیتی ہے پھر قصہ شروع کرتی ہے اِس طرح اس میں سات قصے ہیں۔

ہر گنبد کا رنگ جداگانہ ہے جو شاہزادی جس گنبد میں ہے اوس کا لباس بھی گنبد ہی کے رنگ کا ہے۔ خود بہرام کا لباس بھی گنبد کی رعایت سے ہر شب نئے رنگ کا ہوتا ہے۔

جس روز جس گنبد میں جاتا ہے اوس میں ستارہ کے رنگ کا بھی لحاظ ہے اہل نجوم کے یہاں سبع سیّارگان اپنا اپنا رنگ خاص رکھتے ہیں۔ کوئی سیاہ ہے کوئی سرخ۔ کوئی سبز اور ہفتہ کے ہر سات ایام یعنی شنبہ، یکشنبہ وغیرہ اونھیں سیّاروں سے اپنا اپنا علاقہ رکھتے ہیں۔ غرض گنبد کے رنگ کی مناسبت کہیں نہیں چھوڑی گئی ہے آخر کار بہرام کا گورخر کے شکار میں ایک کوئیں میں گر کر مر جانا ہے اور داستان کا خاتمہ ہے۔

مولنٰنا نظامی نے بھی ان سارے واقعات کو بعینہ بیان فرمایا ہے لیکن وہ سات قصے جو شاہزادیوں نے کہے ہیں وہ دونوں کتابوں میں جداجدا ہیں۔

خسرو کے قصص سب اون کی قوت متخیلہ کے نتیجے ہیں۔ قصے فرضی ہیں لیکن اسلوب بیان ایسا ہے جس سے فرضی واقعی معلوم ہوتا ہے برخلاف اسکے مولنٰنا نظامی کے یہاں اسرائیلیات بھی داخل ہیں جن کے ہونے سے نہونا اچھا تھا۔

مولانا نظامی کے یہاں اثنائے قصے میں نصائح کا سلسلہ بھی آجاتا ہے جس
سے کہیں کہیں داستان کا تسلسل جاتا رہتا ہے لیکن خسرو کے یہاں کوئی
ایسا مضمون بیچ میں نہیں آتا ہے جس سے تسلسل میں کہیں بھی ربط جاتا رہے

داستان گوئی بجائے خود ایک بڑا فن ہے لیکن ہر عہد میں اس کا خاص
طریقہ رہا ہے اوس زمانے میں اکثر قصے طلسم و جادو و دیگر وہمیات سے کامل
ہوا کرتے تھے۔ اس زمانے میں قصہ و داستان کا جو مذاق ہے اوس کو اب
سے چھ سو برس قبل تلاش کرنا فضول ہے یہ تو اپنے اپنے زمانے کا مذاق ہے
اوس عہد اور اوس دور ایّام میں قصص جسقدر محال و دور از عقل ہوتے سامع
کی دلچسپی اوسی قدر زیادہ ہوتی۔

ہفت پیکر کے قصص اسرائیلیات کے سوا جو ہیں اوس عہد کی قصہ خوانی
کے وہ صحیح نمونے ہیں خسرو علیہ الرحمۃ نے ہشت بہشت کے قصص کو دائرہ امکان
میں لانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ قصے ایسے دلچسپ لکھے ہیں اور جزئی
سے جزئی باتوں کو بھی اس تفصیل سے بیان کیا ہے کہ یہ قصے جیسے کہ خسرو
کے زمانے میں دلچسپ تھے آج بھی اون کی وہی دلچسپی ہے۔

ہشت بہشت کے بعض قصے مغرب کے داستان نگاروں نے بھی پسند
کئے اور اون کا ترجمہ انگریزی میں شائع کیا مثلاً بہشت دوم کا جو قصہ ہے
وہ انگریزی فسانوں میں بھی موجود ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح

خسرو کی شاعری بلند پایہ رکھتی ہے اوسی طرح داستان نگاری اور اُنکی تکمیل و ترتیب میں بھی اونھیں کمال ہے۔

حمد باری تعالیٰ کی حمد میں شاعر عموماً اسماے حسنیٰ اور صفات الٰہیہ کی توضیح کیا کرتا ہے۔ اپنی قوت شاعری سے مضمون کو پھیلا کر اور طرح طرح کے نکات بیان کرکے دادِ سخن دیتا ہے۔ اب خوبی و کمال اس میں یہ ہے کہ حمد کا مضمون صفائی و چستی کے ساتھ اِس طرح بیان کیا جائے کہ قریب الفہم ہو اور سخن گذاری کا پیرایہ موثر ہو۔ ساتھ ہی اس کے کوئی تلمیح یا نکتہ تعبیہ کرکے اہل علم کے لیے ضیافت کا خوان بچھایا جائے تو نورٌ علیٰ نور۔

قدرت کا بیان

اِس وقت مثنوی مذکور کی حمد میں سے اسی قسم کے چند اشعار لیکر اون کی توضیح کی جاتی ہے۔ خسرو اوس قادرِ مطلق کی قدرت کاملہ کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

هر چہ نتواں ز پادشاهی کرد — کردی و مسکنی و خواهی کرد

سطوت و جلالت قوت و طاقت شاہی سب کو معلوم ہے۔ ان چیزوں کا ایک ناقص و ادنیٰ نمونہ جب چند دنوں کے لئے کسی کو سلطان ذیجاہ بناتا ہے تو تنک ظرفی کے سبب کاسۂ پرغرور میں ایسا سودا سماجاتا ہے کہ دائرہ امکان و حدوث سے قدم باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ دیگر ابناے آدم اپنے ضعف و کمزوری سے اوس کے غرور و پندار کو امر واقعی تسلیم کرکے اوس خیال باطل کو اور بھی راسخ

کر دیتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے اور واقعات اِس وقت تک اوس کی تصدیق کرتے ہیں کہ تھوڑیسی قوت و قدرت جہاں انسان کو عطا ہوئی بس اوس نے خدائی کا دعویٰ کرکے اَنَا رَبُّکُمُ الاَعلیٰ کا علم بلند کیا۔ رعایا و برایا اپنی بدعقلی و کم فہمی کا ثبوت دیتے ہوے اوس کی خدائی کا اقرار کرنے والے بھی ہوئی۔

عہدِ عتیق میں نمرود کا حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے مناظرہ کرنا اس کو اچھی طرح واضح کرتا ہے۔ احیا و امانت کی حقیقت سے ناآشنا و جاہل اپنے زعم باطل کے بموجب کہہ ہی اوٹھا کہ اَنَا اُحْیِی وَاُمِیْتُ حضرت ابراہیم خلیل نے بحث کا پہلو بدلکر یوں تقریر فرمائی اِنَّ اللّٰہَ یَأْتِی بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ یعنی اللہ تعالیٰ سورج کو پورب سے نکالا کرتا ہے تو اوسے پچھم سے نکال۔ اِس کا معارضہ وہ نہ کرسکا اور مبہوت ہوکر رہگیا۔

اگر خسرو اللہ تعالیٰ کے اوصاف بادشاہی کو پورے زور کے ساتھ چند ابیات میں بیان بھی کرتے تو یہ شان ظاہر نہوسکتی تھی اور منکر کو بھی کج بحثی کا موقع رہ سکتا تھا اب اس ایک شعر کی بلاغت قابل ہزار داد ہے۔ کس خوبی سے نمرود کے پورے واقعہ کی تلمیح موجود ہے اور کیسی مُسکت دلیل سے مخلوق پرستوں کی لب بندی کی ہی سلطنت کی قوت و قدرت تسلیم کرتے ہوے اوس کی بیمقداری اور ایک محدود دائرہ تک محدود زمانہ کے لئے اوس کا اثر کس طرح ثابت کیا ہے۔ اوس پر ایک چھوٹے سے مصرعہ "کردی و میکنی و خواہی کرد" نے ازمنہ ثلثہ کا احاطہ کرکے ازل سے ابد

تک اوس کی قدرت کا اظہار کر دیا جس کا دعویٰ تو کسی سے ہو بھی نہیں سکتا۔

کمال صنعت

حرفِ انگشت چوں زنست بمشت　　　　کس بحرفِ تو چوں نہد انگشت

وسوسہ شیطانی منکر اللہ سے صنعت باری میں عیب جوئی کرانا چاہتا ہے۔ خسرو نے ایک ہی دلپذیر شعر میں یہ بتا دیا ہے کہ جن قوا و اعضا سے کہ تم اس بے ادبی کا ارتکاب کیا چاہتے ہو وہ بھی اوسی کی مخلوق ہے۔ اُسی کے حکم نے ایک مدّت معینہ تک اون کو تمہارا مطیع بنا رکھا ہے جن انگلیوں سے اپنے زعم باطل میں تم اوس کے عیوب کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہو آخر یہ تمہاری مخلوق و پیدا کردہ تو ہیں نہیں ان میں احساس و حرکت کی قوت تمہاری خلق کردہ تو ہے نہیں پھر ایسا کرنا کیا سخت کفران نعمت نہ ہو گا۔ کمال صنعت الٰہی کے بیان کرنے کا کیسا موثر پیرایہ ہے۔

ایجاد و انعدام

تو نگاری ز خاک صورت پاک　　　　تو توانیش باز کردن خاک

صانع کا کمال یہ ہے کہ جس طرح بنانے پر قادر ہو اوسی طرح بگاڑنے پر بھی قدرت رکھتا ہو۔ یوں تو اس عالم کون و فساد میں پہاڑ سورج چاند وغیرہ بہت سی بڑی بڑی چیزیں ہیں جن کے متعلق قدرت کا اظہار کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ان چیزوں کا نیست کرنا جب ہو گا تب ہو گا۔ یہ چیزیں کن کن عناصر سے مرکب ہو کر رونق

بخش عالم ہوئی ہیں یہ تحقیق جب ہوگی تب ہوگی۔ مگر خاک سے پاکیزہ صورتوں کا
پیدا ہونا اور چند روز تک اپنی بہار دکھا کر ایک غیر محسوس طریق پر نسیت ہوجانا تو
رات دن کا مشاہدہ ہے اور یہ عبرت کے لئے زود اثر ہے باعتبار دور کی چیزوں
کے۔ اپنے اور اپنے سے قریب کی چیزوں میں غور و فکر کرنا زیادہ مناسب ہے ؎

احسان مانو حسن خداداد کا بتو ۔۔۔ پتھر تھے تم کو شیشے سے نازک بنا دیا

وفی انفسکم افلا تبصرون انسان کی پیدایش خاک سے ہے۔ گل بوٹے بھی خاک
ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ سے کچھ ہو کر پھر خاک ہوجاتے ہیں۔ قیاس خطابی کا
ایک عظیم دفتر صرف ایک شعر میں موجود ہے۔ نبات حیوان انسان ان کی
بدایۃ ونہایۃ ان کا عروج۔ ونزول ان کا عود الی المرجع ذرا چشم بصیرت سے اگر
مطالعہ کیا جاے اور پھر یہ شعر پڑھا جاے تو شاعر کی قادر الکلامی کا پورا لطف حاصل ہو

ترغیب طاعت اور انعام الٰہی

بندگان از بندگی شب و روز ۔۔۔ خواجگی بخش و بندگی آموز

بندگی سے خواجگی کیونکر حاصل ہوسکتی ہے اس کو تو وہی سمجھیگا جس نے عبودیت
کا مزہ چکھا ہوگا ؎

دو کار ست با فرو فرخندگی ۔۔۔ خداوندی از تو زما بندگی

خسرو نے اِس شعر میں بندگی و عبادت کی ترغیب جس دل آویز پیرایہ میں
بیان کی ہے اوس کا لطف تو ارباب ذوق سلیم ہی پا سکتے ہیں۔ لیکن الفاظ

جہاں تک مدد کر سکتے ہیں وہ گزارش ہے۔ غور کیجئے وہ کونسا دل ہے جس میں خواجگی و سرداری کی تمنا نہیں۔ انسان تمام عمر جس کے حاصل کرنے میں سرگرداں وپریشان رہتا ہے وہ یہی خواجگی ہے اور غلط راہ روی کے سبب سے اکثر وبیشتر فرزند آدم صحیح معنوں میں خواجگی پانے سے محروم رہے اور رہتے ہیں پس امیر صاحب کا حمد میں یہ فرمانا کہ یہ بھی تیری شان کریمی کا صدقہ ہے جو بندوں کو بندگی سکھا کر تو خواجگی بخشتا ہے جہاں ایک پاکیزہ الفاظ میں حمد الٰہی و ذکر نعمت جلیلہ ہے اوسی کے ضمن میں بندوں کو بندگی کی رغبت اور صحیح راہ خواجگی کی طرف رہبری بھی ہے ؎

خلاص حافظ از آں زلف تابدار مباد — کہ بستگان کمند تو رستگارانند

نعت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت شریف میں شعرا نے عجیب وغریب لطائف پیدا کئے ہیں۔ آپ کے معجزات آپ کے فضائل وکمالات کا شاعرانہ انداز سے بیان کرنا ہر ایک سخنور کے لئے تاج کرامت رہا ہے۔ لیکن خسرو علیہ الرحمۃ نے اس میں بھی جو جدّت پیدا کی ہے وہ تمام متاخرین کے گلدستہ نعت میں گل سرسبد ہے۔ چند اشعار اس کے ملاحظہ ہوں۔

میم کا نکتہ

میم احمدؐ کہ در احد غرق ست — کمرِ خدمت از پئے فرق ست

احمدؐ اندر احد کمر بندست — یعنی ایں بندہ آں خداوندست

احمدؐ یا محمدؐ صلی اللہ وآلہ وسلم کی میم سے شاعروں نے بعد امیر خسرو علیہ الرحمۃ کے طرح طرح کے نکات پیدا کئے۔ جامی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

محمدؐ کش قلم چون نامور ساخت　　ز میمش حلقۂ طوق و کمر ساخت

خود امیر صاحب دوسری جگہ ایک اور طرز سے نکتہ سرا ہوئے ہیں ؎

میم احمد را گزیدہ بعد ازاں　　خاتمِ مُہرِ نبوّت ساختہ

ان سب نکات سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سرداری و سروری کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے لیکن یہ نکتہ کہ آپ بندہ ہیں اس کی طرف یہ میم کیونکر اشارہ کرتی ہے اس کو امیر صاحب نے دکھایا ؎

تہی دست سلطان پشمینہ پوش　　گدائی خرو بادشائی فروش

جس طرح خسرو سے پیشتر کسی شاعر نے میم کے نکتہ کو بیان نہ کیا۔ اوسی طرح امیر صاحب سے بعد کے شعرا اس سے بہتر یا اس کے برابر نکتہ پیدا نہ کر سکے۔

انا من نور اللہ والخلق کلھم من نوری

پایۂ قدرش آسمان پیوند　　سایۂ نورش آفتاب بلند

ایک حدیث شریف میں وارد ہے لَمْ یَکُنْ لَہٗ ظِلٌّ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ نہ تھا۔ دوسری حدیث حضرت جابر سے یوں منقول ہے یَا جَابِرُ اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ نُورَ نَبِیِّکَ مِنْ نُورِہٖ قَبْلَ کُلِّ الْاَشْیَاءِ یعنی مرتبہ ایجاد میں اولیت نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے۔ اور تیسری حدیث اَنَا مِنْ نُورِ اللّٰہِ وَالْخَلْقُ کُلُّھُمْ مِنْ

نوری یعنی میں نورالٰہی سے منوّر ہوں اور تمام مخلوق میرے نور سے مستنیر ہے ان حدیثوں کی تلمیح اس شعر میں جس طرح واقع ہوئی ہے وہ امیر صاحب کے صاحب فن ہونے کی دلیل ہے۔ مطلب شعر کا نہایت واضح ہے کہ آفتاب وغیرہ جتنی منور اشیا ہیں سب آپ کی ذات پرانوار سے اکتساب ضیا کرتے ہیں ؎

صبح زخورشید بود نوریاب اوست خور و صبح ولیست آفتاب

اس بنا بر آفتاب آپ کے نور کا سایہ ٹھیرا۔ تو جب سایہ آفتاب کے نور سے پیدا ہوتا ہے اور آفتاب خود سایہ آپ کے نور کا ہے تو آپ کا سایہ کہاں سے آئے آفتاب بلند میں ایک لطیفہ یہ بھی ہے کہ ہر چیز کا سایہ زمین پر گرتا ہے لیکن آپ کا سایہ اوپر ہے پس اوس کو کوئی زمین پر کیونکر دیکھے۔ اس سے ایک لطیف اشارہ علو مرتبۂ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی ہے یعنی اگر آپ کا سایہ دیکھنا چاہتے ہو تو نظر کو بلند کرو۔ جب فلک چہارم تک نظر کی رسائی ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ دیکھنے میں آئے۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ آفتاب باوجود اس کے کہ فلک چہارم پر ہے لیکن اپنی روشنی و گرمی سے عالم سفلی کو فیض پہونچا رہا ہے۔ اسی طرح وہ ذات گرامی باوجود اوس شان و عظمت کے جو خالق نے اوسے عطا فرمائی ہے تمام عالم علوی و سفلی کو جو اوس سے بدرجہا ادون و پست ہیں نعمتوں سے مالا مال فرما رہی ہے۔

بقا فی الفنا

ہستی از وے علم برآوردہ ... او تفاخر بہ نیستی کردہ

نعت میں اس شعر کا خسرو علیہ الرحمۃ کے قلم سے نکلنا مبدء فیاض کے فیض خاص کا نتیجہ ہے۔ فی الحقیقت کمال بندگی یہی ہے کہ بندہ اپنے کو معبود حقیقی کے مقابل میں نیست سمجھے۔

ع باوجودت زمن آواز نیامد کہ منم۔ اور کمال عشق بھی یہی ہے کہ عاشق معشوق کے مقابل میں فنا ہو جائے ع زندہ معشوق ست عاشق مردۂ۔ پس بفحوائے لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ اگرچہ باعث وجود کل کائنات آپ ہی ٹھیرے لیکن چونکہ آپ کا دنیا میں تشریف لانا رشتۂ عبدیت و معبودیت کو صحیح اور سچے طریقہ سے جوڑنا تھا اور عبدیت اوس وقت تک کامل نہیں ہوتی جب تک فنائے کلی کا مرتبہ حاصل نہو۔ ان باتوں کا لحاظ کرتے ہوے امیر صاحب کا نعت میں یہ فرمانا کہ "او تفاخر بہ نیستی کردہ" کیسا بلیغ و پر معنی مصرعہ ہے۔ صاحب معرفت کے لئے دوسرا نکتہ یہ بھی ہے کہ اعلیٰ مرتبہ اوسی وقت حاصل ہوتا ہے جبکہ مرتبہ ادنیٰ فنا ہو جاے۔ مثلاً علقہ یعنی وہ کیڑا جس سے انسان پیدا ہوتا ہے اوس کی اپنی صورت نوعیہ جب فنا ہوئی تو اوس سے ایک اعلیٰ صورت انسانی کا اوسپر فیضان ہوا۔ طفل شیر خوار کا ہر روزہ نمو اسی کا مشعر ہے کہ ادون کے فنا سے اعلیٰ کا حصول ہے

پس درآور کارگہ یعنی عدم ... تا بہ بینی صنع و صانع را بہم۔

اس لئے وجہ تفاخر ظاہر۔ لیکن یہ ایک صوفیانہ رمز ہے۔ اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جسے شیخ نے فنا کے مراتب طے کرا کے نیست و نیستی کی لذت سے آشنا کیا ہو فتدبر و تشکر۔

منقبت اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین

دوستانِ دگر گزاں جمعند صبح را نور و شام را شمعند

صبح کی روشنی آفتاب سے ہے۔ اس لئے اصحاب رضی اللہ عنہم آفتاب ٹھیرے۔ صبح کے لئے نور اور شام کے لئے شمع مناسب رعایت ہے اس منقبت میں نکتہ یہ ہے کہ دن کا وقت کاروبار کے لئے ہے اور رات کا وقت عبادت کے لئے زیادہ مناسب کیونکہ یکسوئی خوب ہوتی ہے۔ پس امت دن کو کاروبار میں اور رات کو عبادت میں اون سے ہدایت پاتی ہے۔ دین و دنیا کے لئے اصحاب کا مقتدا ہونا رات دن کی رونق بلکہ اُن کے بقاے وجود کا سبب اون نفوس قدسیہ کے فیضان کو قرار دینا اصحاب کی عظمت اور تعلیم محمدیؐ کی جامعیت و اہمیت کو بتاتا ہے۔ صرف ایک شعر میں اصحاب کرام کی سیر کن منقبت لکھنا امیر صاحب ہی کا کام ہے۔

مدح شیخ طریقت

حضرت امیر خسرو علیہ الرحمۃ میں جو حق شناسی و سپاس گذاری کا جوہر ودیعت کیا گیا تھا اوس کی چمک آپ کی تصانیف میں لعلِ شب چراغ ہے اسی بنا پر آپ کی مثنویوں میں ایک عنوان مستقل مدح شیخ طریقت کا ہر مثنوی نگار سے زیادہ ہے جس سے مقصود اظہار امتنان

وتشکر ہے۔

پیر کی مدح میں فرط محبت دائرہ اعتدال سے اکثر کو باہر کر دیتی ہے۔ مناقب و مدائح کا مطالعہ کرو تو اکثر ایسا پاؤگے کہ اگر ممدوح کا نام نہ لیا جاے تو مناقب کبھی تو نعت سے اور کبھی حمد سے ٹکرا جاتے ہیں بادشاہوں کی مدح میں رؤسا و اراکین دولت کی شان میں جو قصائد لکھے گئے ہیں اور خاصکر متاخرین کے قصائد ان میں اسی سقم نے کلام کو بے جان کر دیا ہے لیکن خسرو علیہ الرحمۃ میں یہ کمال ہے کہ اون کی طبع سلیم سرمو دائرہ ادب سے تجاوز نہیں کرتی جیساکہ حمد نعت منقبت ہر ایک کے لئے الفاظ خاص ہیں اور ہر ایک کے مراتب خاص ویسا ہی اس کا نمایاں فرق کلام خسرو کی ممتاز خصوصیت ہے اور یہی بیان کا کمال ہے ورنہ اگر خصوصیت اوٹھا دی جاے تو پھر کیا باقی رہ جاتا ہے۔ غرض شیخ طریقت کی مدح میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ حفظ مراتب کا بے مثل درس ہے اور کمال ولایت کا اظہار جن اوصاف سے کیا ہے وہ ولی شناسی کا حقیقی وصحیح معیار۔ تمہید منقبت کو دیکھو کس طرح ادب سے مزین ہے ؎

چوں من از خوانِ نعتِ خواجۂ خویش	نعمتِ تازہ یافتم در پیش
زلہ کردم ازاں رقاقے چند	تا کنم توشۂ ابد پیوند
گندمی بود زلہ آدم را	خوانچہ نیز پورِ مریم را
زلۂ کز رسولِ والا بود	نہ کم از آدم و مسیحا بود

کنم اکنوں ازاں نعیمِ جلال　　خوانچہ مدحِ شیخ مالا مال

تمہید میں پاس ادب دیکھ چکے۔ اب بیان مدح میں ایک ولی کی کس کمال پر مدح ہو سکتی ہے اس کو ان مدحیہ اشعار میں دیکھو۔

رہنما کی تعریف اور وصی کی شناخت

غوث عالم نظام ملّت و دیں　　قطب ہفت آسمان و ہفت زمیں

رہبرِ پیش ہیں محمد نام　　زدہ پے بر پئے محمد گام

پاک روح اللہی بدینِ قوی　　زندہ دار شریعت نبوی

سبحان اللہ وجزاہ اللہ اپنے قلم میں وہ قوت کہاں سے لاؤں جس سے ان اشعار کی خوبی اس طرح صفحہ قرطاس پر کھنچ جائے کہ محاسن کا ہر خط و خال سامنے آجائے بہرحال دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ کمال رہبری کا کیسا اظہار کرتا ہے ارباب عقل کا یہ فیصلہ ہے کہ رہبر کی تین قسمیں ہیں ایک وہ باکمال جسے منزل مقصود کی راہیں معلوم دشواریوں پر اطلاع خطرات و مہالک سے واقفیت اون تدابیر کا عالم جن سے خطرات و موانع کا اثر نہ آنے پائے ایسا رہبر اپنے علم و بصیرت سے رہبری کرتا ہوا خطرات و مہالک سے بچاتا ہوا موانع کو ہٹاتا ہوا اپنے پیچھے آنے والوں کو سلامتی کے ساتھ اونکے مقاصد تک پہونچا دیتا ہے۔ جیسا ایک ماہر ناخدا کہ وہ سمندر کی راہوں سے واقف مقام خطر سے آگاہ مہالک سے بچ کر نکل جانے کی ادے سبیل معلوم۔

دوسرا وہ ناقص رہبر جسے نہ راہ معلوم نہ خطرات کا علم لیکن ہر طرح کے خطرات پر غالب آنے کی قوت اوسے حاصل۔

تیسرا وہ مدعی باطل کہ نہ راہ کی خبر نہ دشواریوں کا علم نہ اون کے اندفاع کی قدرت نہ مقصد کا تعین۔

ان اقسام ثلثہ کو مدنظر رکھتے ہوے اس مصرعہ کو پھر پڑھو ع

رہبر پیش بیں محمدنام

رہبر کی صفت پیش بیں کیسی واقع ہوئی ہے اور منازل سلوک طے کرانے پر اوس کی کیسی قوت کا اظہار ہے اب دوسرا مصرعہ پڑھو جس سے یہ معلوم ہوجائے گا کہ یہ صفت اوس رہبر کو کیونکر حاصل ہوئی اور اوس کی رہبری حتمی منزلِ رساں کیوں ہے۔ ع

زن پے بر پے محمد گام

جس کا قدم خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر ہو اوس کی رہبری حتمی منزل رساں کیوں نہو۔

اب تیسرے شعر کو دیکھیے جس حدیث کی تلمیح ہے اوس کے بیان کا کہاں موقع ہاں یہ قابل لحاظ ہے کہ حقیقی تصوف اور صحیح فقر مغز شریعت سے لذت آشنا ہونا اور سنن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک پیکر مجسم بن جانا ہے اُمت کا کمال ہی یہ ہے کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اوس کا شعار و دثار

بن جائے جسقدر امت کا اتّباع کامل اوسی قدر اوس کی توحید مضبوط مفہوم الوہیت صحیح عرفان کامل۔ حق جل مجدہ کی محبت سچی و واقعی قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔

مثنوی نگار کا یہ کمال ہے کہ جس شے کی تعریف کر رہا ہو اُس کے بیان صفت کے لئے ایسے الفاظ لائے جو اوس کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہوں اور یہ اوس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک بیان کرنے والے کا علم خود اوس کے تمام رموز و نکات سے آشنا نہو۔

یہ کمال خسرو علیہ الرحمتہ کے بیان میں ہر جگہہ نمایاں پاؤ گے جس کی ایک کھُلی مثال اشعار مذکورہ ہیں۔

کیمیا سنجِ کورۂ مقصود کردہ حل جملہ نقدہائے وجود

دلش از عشق خون و دیدہ پُرآب این ست کبریتِ احمر آں سیماب

کمال عشق اور قوت تکمیل

سالک کا سلوک ابتدا میں لازم ہوتا ہے پھر ایک مقام و وقت ایسا آتا ہے جہاں پہونچکر وہ اپنے منازل عروج بھی طے کرتا رہتا ہے اور دوسروں کی بھی دستگیری و رہبری کرتا ہے یعنی اپنی ذات سے کامل اور دوسروں کے لئے مکمل۔ جیسا کہ علوم متداولہ پڑھنے والے ابتدا میں پڑھنا شروع کرتے ہیں اور پھر ایک خاص استعداد علمیہ جسے فراغ تحصیل سے تعبیر کیا جاتا ہے جب انھیں

حاصل ہو جاتی ہے تو اپنی تحصیل و ترقی کے ساتھ دوسروں کے جہل مٹانے اور اُنپر نقش علم جمانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

ان اشعار میں شیخ کے وجود کو کامل و مکمل جن بلیغ استعاروں میں کہا ہے اوس پر غور کرو تو لذت عشق مزہ دے جائے گی۔ کورۂ مقصود کا کیمیا سنج کہنا کیسا نادر نکتہ ہے۔ کیمیا گر کیا کرتا ہے مس یعنی تانبا لیتا ہے اوس کو صاف کرتا اور گلاتا ہے۔ جب اوس کے کثیف وردی اجزا گل کر خاکستر ہو جاتے ہیں اور قابلیت طلا کی طرف مستحل ہونے کی پیدا ہو جاتی ہے تو اُس وقت اجزائے کیمیاوی ڈال کر کندن بنا دیتا ہے۔

خسرو علیہ الرحمۃ اپنے پیر دستگیر شیخ طریقت (رضی اللہ عنی بحرمتہ) کے کامل و مکمل ہونے کو اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ مقاصد میں جو اغراض فاسدہ و ہوائے نفسانیہ کی آمیزش ہو گئی ہے جس سے حقیقی مقصد نہاں ہو گیا ہے اور جس تک پہونچنا اصل کمال ہے یہ مجسمۂ کمال و تکمیل پہلے اوسے غل وغش سے پاک کرتا ہے یہاں تک کہ مقصد حقیقی کی دلکش تصویر متعین و مشہود ہو جاتی ہے۔ اب کہ اوس میں قابلیت پیدا ہو جاتی ہے تو اجزائے کیمیاوی کبریت احمر اور سیماب جو اوس کے پاس ہیں اون کا ایک ذرہ اوس میں ڈالکر خالص طلا بنا دیتا ہے۔

اِس کیمیا سنجی کے لئے جسے اجزائے کیمیاوی قرار دیا ہے اوس کی خوبی ایک

اہل دل ہی سمجھ سکتا ہے کبریت احمر یعنی گوگرد سرخ طلا کے لئے اکسیر ہے اسی طرح عشق حقیقی عاشق کی روحی ترقیات کے لئے اکسیر ہے علاوہ اس کے عشق کی آگ مشہور ہے خود گوگرد بھی آتش انگیز چیز ہے پس جو دل کہ عشق کے باعث خون ہو گیا ہی اوس کی تشبیہ بہ رعایت صوری و معنوی کبریت احمر کے ساتھ نہایت نادر تشبیہ ہے۔ دوسری تشبیہ اس شعر میں اشک کی سیماب سے ہے اشک کو قرار نہیں ہوتا رو کو تو رُک نہیں سکتا ع

ابھی روکا تھا ان اشکوں کو پھر باہر نکل آئے

سیماب کی بے قراری ضرب المثل ہے نیز کشتۂ سیماب اکسیر ہے عشق کی رعایت سے اوس کے سب لوازم جمع ہو گئے کیمیاگری کا بھی نسخہ ہاتھ آگیا۔ عشق الٰہی سے دلکو سوختہ کرو کیمیا کا یہ بے خطا نسخہ ہے ؎

سیماب کشتہ ہوئے تو مس کو طلا کرے　　دل جس کا کشتہ ہو وہ خدا جانے کیا کرے

برادرانِ طریقت کی مدح

داں مریدانِ رہروانِ یقیں　　ہر یکے والئ ولایتِ دیں
ہمہ شیطاں کش و فرشتہ خدم　　در رہش بر ہوا نہادہ قدم
زندہ دار شب از دمِ تسبیح　　غلغل افگندہ در رواقِ مسیح
ہر سوار شینِ شرع ساختہ تاج　　دلِ شاں عرش و سجدہ شاں معراج

ان اشعار میں اپنے برادران طریقت کی خسرو علیہ الرحمۃ نے مدح فرمائی ہی جو بالواسطہ

شیخ کی ہی مدح ہے۔ مرید کا کمال شیخ کے اثر فیض کا نتیجہ ہے پھر جس کمال کا اظہار ہے وہ وہی عبودیت، شریعت کی پابندی، راتوں کی بیداری سجدہ میں نیازمندی وخاکساری۔ آخر شعر میں ان دو حدیثوں کی تلمیح کہ قلب المومن عرش اللہ اور الصّلوٰۃ معراج المومنین۔

شیخ کی مدح ختم ہوئی خاتمہ پر جس تذلل وعجز کا اظہار مخلصانہ دعا میں فرمایا ہے وہ خاکساری وشکستگی، باہمی مودت واتحاد قلبی کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

دعا اور باہمی اتحاد

ملکِ وحدت بنامِ ایشان ست — بندہ خسرو غلامِ ایشان ست

نامِ من زاں ستودہ کیشان باد — حشرِ من درمیانِ ایشاں باد

نصیحت بسلطان علاء الدین خلجی

شعرا نے اپنے اپنے بادشاہ وقت کو نصیحت کی ہے خسرو نے بھی نصیحت کی ہے لیکن علاوہ اور نصیحتوں کے امیر خسرو نے بادشاہ وقت کو خود اس کے نفس سے ڈرایا ہے اور یہ ایک عجیب جامع و نادر نصیحت ہے شعرا عموماً بادشاہوں کو دشمنوں کے غلبہ سے مظلوموں کی آہ سے پرہیزگاروں کی بد دعا سے غرور وتکبر کے نتائج بد اور ازیں قبیل اور بلاؤں سے ڈراتے ہیں۔ شاہان سلف کے حالات سے عبرت گیری کی نصیحت کرتے ہیں لیکن یہ نصیحت کہ محافظ وپاسبان تو روپے کے بندے ہیں تم ہوشیاری کو اپنا پاسبان بناؤ اور آپ اپنے محافظ رہو کہ یہی بہترین حفاظت ہے۔ تمہاری

غفلت سے بڑھ کر کوئی تمہارا دشمن نہیں۔ اس کو وضاحت کے ساتھ خسروؒ نے بیان کیا ہے۔ امیر خسرو نے دیکھا کہ عیش و تنعم میں پڑ کر جو غفلت پیدا ہوتی ہے یہی بدترین دشمن زوال سلطنت کا اصل باعث ہے۔ بادشاہ اگر غافل نہ ہو تو پھر نہ مظلوموں کی آہ ہے نہ ابرار کی بددعا۔ اِس لئے بادشاہ کو اس اہم نکتہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں ؎

ور چہ کس نیست دشمنِ تنِ تو　　　غفلتِ تو بس ست دشمنِ تو

ور چہ صد پاسباں بود از پس　　　پاسِ تو بہ ز تو ندارد کس

بر چنیں پایہ کاستواریِ تست　　　پاسبانِ تو ہوشیاریِ تست

پاسبانیکہ بہر مزد بود　　　پاسبان نے کہ سیم دزد بود

بادشاہ میں اگر دو صفتیں ہوں تو قیام سلطنت کے لئے کافی ہیں یعنی عدل اور شجاعت۔ عدل کو تو جیسا چاہیئے اوروں نے بھی بیان کیا ہے لیکن بزدلی کے نتیجہ کو دکھا کر شجاعت کی ترغیب امیر خسرو جس خوش اسلوبی سے دیتے ہیں ملاحظہ ہو ؎

چوں در آئی بصفِ تیغ زناں　　　از تزلزل کشیدہ دار عناں

لشکرے کز عدو فرار کند　　　چوں بسلطاں رسد قرار کند

لیکن ار شہ نعوذ باللہ تافت　　　کے فراہم شود صفے کہ شگافت

شاہ کوہے بود بسنگِ وقار　　　جنبشِ او قیامت آرد بار

آخر شعر میں اس نکتہ کو بھی ملاحظہ کیجئے کہ بادشاہ جب کوہ ہے اور میدان
جنگ سے اوس کا بھاگنا قیامت تو قیامت کے روز جو کوہ کا حال ہوگا وہ
معلوم ہے۔ جو نصیحتیں کہ خسرو نے علاءالدین کو کی ہیں اور جس بے جگری سے
کی ہیں وہ خسرو کی حقانیت کا عجیب نمونہ ہیں علاءالدین خلجی کا عہد تاریخ میں
پڑھو تو تمہیں معلوم ہو کہ کس جبروت کی یہ سلطنت کرتا تھا۔ یہ خسرو ہی کا کام ہے
جنھوں نے ہر مثنوی میں نصیحت کی ہے اور اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ علاءالدین
کی بدمستی کا ایک نمونہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔
مغلوں کی شکست اور ظفر خاں کی موت علاءالدین کے لئے بہت ہی ازدیاد
مسرّت کا باعث ہوئی۔ مزید برآں مہمات ملکی تو بر تو بادشاہ کے حسب مراد
ہونے لگیں جس سے علاءالدین آپے میں نہ رہا دیکھتا تھا کہ اقبال بڑھ بڑھ کر
اوس کے قدم لے رہا ہے ہر طرف سے فتح نامے آ رہے ہیں ہر سال دو تین بیٹے
مشکوے معلّی میں پیدا ہوتے ہیں سارے مصالح ملکی دل کے حسب خواہش
سرانجام پا رہے ہیں خزانے ہیں کہ پے در پے پہونچ رہے ہیں روزانہ جواہر
و مروارید طبلوں میں بھرے جا رہے ہیں فیل خانوں میں ہاتھی کھڑے جھوم رہے
ہیں ستّر ہزار گھوڑے شہر کی پائے گاہ میں بندھے ہنہنا رہے ہیں ایک
چھوڑ دو دو تین تین اقلیمیں زیر قدم ہیں۔
بادشاہ اس جاہ و حشم کو دیکھ دیکھ مست ہو رہا تھا۔ دور دور کی سوجھنے لگی تھی

اور نئی نئی تمنائیں بےچین کرنے لگی تھیں۔ ایسے ایسے سودے پکانے لگا جو کبھی کسی سلطان کے دماغ میں ہرگز نہ سمائے تھے۔ نہایت مستی و بےخبری و غایت رعونت و غفلت اور کثرت جہل و بلادت سے دست و پا گم کرکے ناممکنات و محالات میں اندیشہ کرنے لگا ؎

دیکھنا کثرت بلا نوشی ۔۔۔ کاسۂ آسماں ہے جام مرا

بےعلم تو تھا ہی نہ لکھنا جانے نہ پڑھنا۔ مزاج کا بھی بدخو۔ طبیعت کا بھی سخت دل کا بھی قسی جون جون دنیا زیادہ ملتی جاتی تھی اور مقصد برآتے تھے وہ اور بھی بےخبر اور مدہوش ہوتا جاتا تھا خدا اور رسول سب کو بھول بیٹھا ؎

بامِ فلک پہ آدم خاکی کو لے اُڑا ۔۔۔ آیا کبھی جو ران تلے بادپائے عیش

اپنی مجلسوں میں باربار کہنے لگا کہ مجھے دو مہمیں پیش آئی ہیں اون کی اودھیڑبن میں لگا ہوا ہوں اوّل یہ کہ خداوند تعالیٰ نے جس طور سے اپنے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو چار یار دیے تھے کہ اون کی قوت و شوکت سے وہ دین و شریعت جاری ہوئی جس سے آپ کا نام نامی قیامت تک باقی رہے گا۔ اور آپ کے بعد جو شخص اپنے کو مسلمان کہتا اور سمجھتا ہے وہ اپنے کو آپ کی اُمّت و ملّت میں تصوّر کرتا ہے اوسی طور سے اللہ تعالیٰ نے مجھکو بھی چار یار دیے ہیں ایک الغ خاں دوسرا ظفر خاں، تیسرا نصرت خاں، چوتھا الپ خاں۔ ان کو میری دولت سے بادشاہوں جیسی قوت و شوکت میسر ہوئی ہے اور یہ ایسے ہیں کہ اگر میں چاہوں

ان چاروں کی قوت سے ایک دوسرا دین و مذہب جاری کر سکتا ہوں اور میری اور میرے یاروں کی تلوار کے زور سے خلق وہ راہ و روش جس کو میں جاری کروں اختیار کر سکتی ہے۔ اور اس دین و مذہب سے میرے اور میرے یاروں کے نام جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے یاروں کے نام قیامت تک رہینگے رہ سکتے ہیں۔ پھر کیوں نہیں میں بھی ایک دین و مذہب نیا قایم کروں۔ غرض قیامت تک اپنا نام باقی رکھنے کے لئے اسی طرح کے خیالات کفریہ اسکے دماغ میں چکر لگاتے اور حضار مجلس سے پوچھا کرتا کہ کس طرح سے ایسی بات کروں جس سے میرا نام قیامت تک رہ جائے اور جس چیز کو میں جاری کر جاؤں میرے بعد بھی خلق اس پر عمل پیرا رہے دوسری مہم اس کی یہ تھی کہ سکندر وار جہانگیری کروں اور ربع مسکوں کو اپنے تصرف میں لے آؤں ؎

وہ بات کر جو کبھی آسماں سے ہو نہ سکے ستم کیا تو بڑا تو نے افتخار کیا

دوسری مہم کا دیباچہ تو شروع بھی کر دیا تھا اپنے کو خطبہ و سکہ میں سکندر ثانی لکھوانے لگا تھا ؎

بخت پر نخوت نہ کر اس کا نہیں کچھ اعتبار چار دن مہماں ہے دورِ قسمت ناپائندنی

اب ناظرین خود بھی غور کر لیں کہ ایسے بادشاہ کو دینداری، مسکیں نوازی، ضعفا پروری، عدل گستری کی نصیحت کرنی خدا کا خوف دلانا، قیامت کی بازپرس کی طرف متوجہ کرنا کیا آسان ہے؟ اور طرفہ یہ کہ اسی بادشاہ کی سرکار میں جب کہ بحیثیت ملازم ہوں لیکن بادشاہوں کو نصیحت کرنی جس قدر خطرناک ہے وہ ظاہر ہے۔ ایاز قدر خود بشناس۔ اس لیے آخر میں فرماتے ہیں ؎

من کیم کت زنم ز پند نفس ٭ دولت و بخت پند گوئے تو بس

ہست بیدار کردنِ بیدار — ہمچو باراں بروے دریا بار

نشر در جیب کردنِ بادام — نہ حلاوت بشیرہ دادن ام

لیکن آرد بحضرتِ شاہی — ہر کسے قدرِ خود ہوا خواہی

گر پذیری فراحت احسان ست — ور گزاری خود از در آسان ست

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ آپ کو نصیحت کرنی حکمت بہ لقمان آموختن ہے۔ لیکن خیر خواہی سلطنت کی راہ سے میں نے اپنی عقل کے مطابق تحفۂ ناچیز پیش کیا ہے۔ آپ کریم ہیں قبول فرمائیں۔ نصیحت کے وقت مخاطب کے اوصاف کا بھی اعتراف کرنا اور یہ کہنا کہ آپ خود عاقل و فرزانہ ہیں۔ ہماری نصیحت کی ضرورت نہیں۔ میں تو ایک محقر تحفہ پیش کرتا ہوں یہ آپ کا کرم ہی کرم ہے کہ اسے شرف قبول بخشیں۔ دلدہی اور قبول نصیحت کے لیے اس سے زیادہ موثر پیرایہ نہیں ہو سکتا۔
قطع نظر اُس سلاست و بلاغت اور حق گوئی کے جو ان اشعار میں ہے رموز سلطنت و فراخدلی سلاطین میں امیر صاحب کا کیسا کمال ثابت ہوتا ہے یہ نصایح صاف بتا رہے ہیں کہ امیر صاحب کی مصاحبت سے سلاطین کو وہی فیض پہنچتا تھا جو سکندر کو ارسطو جیسے وزیر سے حاصل تھا۔ خوش نصیب تھے وہ سلاطین جن کے دربار کی رونق ایسے امیر سے تھی۔

نصیحت بدختر نیک اختر

شعرائے سلف کی تصنیف صرف شاعری کا آب و رنگ نہیں ہے۔ بلکہ گوناگوں افادات کا ایک خزانہ ہے جسے بجوز قوافی سے مخفی کر دیا گیا ہے تاکہ اہل اسے ہٹا کر اگلوں کی کمائی سے مالا مال ہوں اور نا اہل کا ہاتھ اس کے پانے سے محروم رہ جائے اُنہیں مقاصد کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسے کلمات جو عموماً سامع کو خوشگوار نہ گزرتے اُن کے لیے اُن پاک نفسوں نے ایک باب نصیحتِ فرزند کا قایم کیا۔

خسرو کی جدت اور ایک دلچسپ بحث

باپ اپنے بیٹے کو سب کچھ کہہ سکتا ہے اور ہر لب ولہجہ میں کہہ سکتا ہے لیکن خسرو علیہ الرحمۃ کی جدت طبع یہاں بھی اپنا جوہر دکھاتی ہے یعنی بجائے اس کے کہ نصیحت کا مخاطب اولادِ ذکور کو قرار دیتے اس کتاب میں آپ نے دخترِ نیک اختر کو مخاطب فرما کر کچھ نصیحتیں کی ہیں جس سے بہت بڑا سبق تعلیم و تربیت کا طبقۂ اناث کے لئے حاصل ہوتا ہے اور ایک شریف بہو بیٹی کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کون سے ہنر و سلیقہ کے زیور ایسے ہیں جو فی الحقیقت شریف عورت کو مزین کر دیتے ہیں اس طرح یہ صنف نازک بھی خزانۂ خسروی کے عطیات سے محروم نہ رہی۔

نصیحت سے پہلے ایک عجیب دلکش مباحثہ ہے جس کا ممنون طبقۂ اناث ہمیشہ رہیگا۔ یعنی اس امر پر کہ لڑکی بھی فرزند ہے اور شفقتِ پدری کی اُسی قدر یہ بھی مستحق ہے جسقدر کہ فرزند نرینہ دلائل قایم کیئے ہیں اور پھر جس شاعرانہ قوت سے یہ ثابت کیا ہے کہ نعمائے الہیہ میں سے ایک بہت بڑی نعمت لڑکی کا وجود ہے وہ آپکے قیاس شعری کی قوت اور قوت محاکات کا زبردست ثبوت ہے۔

محاسن بیان میں صنعتِ التفات جس طرح کہ متکلّم کے کمال کا ثبوت ہے اُسی طرح شاعر کی نظموں میں اس نوعیت کے صنایع حسنِ نظم کو اوچار چاند لگانے والے ہیں۔

خسرو علیہ الرحمۃ اس صنعت کا نمونہ جس زور بیان اور حسن اسلوب سے اس جگہ پیش فرماتے ہیں وہ دلکش اور سراپا اثر ہونے میں اپنی نظیر آپ ہے۔

عام طبیعتیں ولادتِ دختر سے نفور رہتی ہیں اور لڑکوں کی ولادت کی متمنّی و آرزومند۔ اُسی کراہت کا نتیجہ ہے کہ بہت سے ملکوں میں لڑکیوں کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا جاتا اور میراثِ پدری سے بالکل بےنصیب کر دی جاتی ہیں۔

بدقسمتی سے بہت سی آبادیاں ایسی آج بھی موجود ہیں جن میں خود مسلمان اسی مہلک مرض میں

مبتلا ہیں ہادیِ مطلق اُنھیں ایمان کامل عطا فرمائے تاکہ وہ اپنی میراث کتاب اللہ کے موافق تقسیم کریں۔ خیر یہ تو ایک جُداگانہ بحث ہے جس کا یہ موقع نہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ لڑکی جہاں پیدا ہوئی بس والدین پر خجالت و تاسف کا ایسا ہجوم ہوتا ہے کہ چہرے کا رنگ متغیر جب صاحب اولاد ہونے کی مسرت کا فور اکثر دلوں کا ملال زبانوں تک آجاتا ہے کہ لڑکی پیدا ہوئی گھر خالی ہوا۔

خسرو علیہ الرحمۃ اس خیال باطل کا اس انداز خاص سے رد فرماتے ہیں کہ سطحی نظر رکھنے والوں کو یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ حضرت امیر بھی اونھیں میں سے ہیں لیکن نظم کے صنائع و بدائع سے جو واقف ہے وہ بیان کی خوبی دیکھتا ہے اور لطف سخن سے سر دھنتا ہے۔ داد دیتا ہے لیکن اُس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ دیکھو۔ قبل اس کے کہ اصلاح کی باتیں شروع کریں اپنے کلام کو زیادہ موثر کرنے کے لئے پہلے اپنے آپ کو عوام الناس کی سلک میں منسلک کرتے ہیں اور ٹھیک اوسی طرح جیسا کہ ایک عامی ولادت دختر سے دل تنگ ہو جاتا ہے خسرو علیہ الرحمۃ بھی کراہت کا اظہار کرتے ہیں اور اس مبالغے سے اس داستانِ الم کا نقشہ ایک شعر میں کھینچتے ہیں کہ جس سے زیادہ متصور ہو نہیں سکتا۔

فلسفہ جذبات اور شکسپیر کے ڈرامے سے مثال

اس مقام و کلام کا لطف وہی سمجھ سکتا ہے جس نے فلسفہ جذبات کا محققانہ مطالعہ کیا ہوگا۔ ایسی حالت میں جبکہ ایک مجمعِ مخالف کے سامنے اون کے خیال باطل کا رد مقصود ہو تو اونھیں راہ صواب پر لانے کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ اون کے

جذبہ فاسد سے فساد کا اندفاع اور اونھیں امر حق کی طرف متوجہ کرنے کا زیادہ موثر پیرایہ کون سا ہی؟ اپنے کو پہلے اون کا ہمدرد ثابت کرنا یا اختلاف کا ابتدا ہی سے اظہار؟

انگریزی خواں اصحاب جنھوں نے شکسپیر کے ڈرامے عموماً اور جولیس سیزر کا خصوصاً مطالعہ کیا ہوگا، اونھیں یہ نکتہ یاد ہوگا کہ سیزر کے قتل کے بعد اوس کا دوست انٹنی جب بلوائیوں کے سامنے پہونچتا ہے تو کس انداز سے تقریر کا افتتاح کرتا ہے۔ بروٹس کے افعال کا کس طرح ذکر کرتا ہے۔ تھوڑی تھوڑی تقریر کے بعد یہ بھی کہتا جاتا ہے کہ بروٹس ایک شریف آدمی ہے۔ حاضرین آہستہ آہستہ اپنی غلطی اور بروٹس کی شرارت کا احساس کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ جوش سے مجمع لبریز ہو جاتا ہے اور انیٹنی کا مدعا اُنھیں بلوائیوں کے ہاتھوں سے پورا ہوتا ہے۔ شاعر کی اسی صنعت و کمال کو اشعار ذیل میں دیکھو۔

خسرو اور زبان عوام کی ترجمانی

اے زعفّت فگندہ برقعِ نور ۔۔۔ ہم عفیفہ بنام ہم مستور

ماہت از ہفت بر نرفتہ ہنوز ۔۔۔ روشنی چوں مہ چہاردہ روز

کاش ماہِ تو ہم بچہ بودی ۔۔۔ دررحم طفل ہشت مہ بودی

فی الحقیقت کمال شاعری یہ ہے کہ فطرت انسانی پر فلسفیانہ نظر ڈال کر جذبات انسانی کا ایسا نقشہ کھینچا جاے جسے لوگ حیرت زدہ ہو کر نقوش و خطوط کے

فوٹو میں ہو بہو دیکھیں۔ پہلا اور دوسرا شعر فطری جذباتِ پدری کا نقشہ پیش کرتا ہے اور تیسرا شعر اوس جذبے کا پتہ دیتا ہے جو دوں ہمتی و خیال فاسد نے پیدا کر دیا ہے۔ اس لطف کو دیکھو۔

بیٹی کا وجود اگرچہ جاہلانہ و پست خیالات سے مکروہ و قابل نفرت معلوم ہوتا ہے لیکن جوشِ خون و علاقہ جزئیت کچھ دلی میلان کا بھی سراغ دیتا ہے۔ اوّل و دوم اشعار میں اوسی شفقت پدری کا اظہار فرماتے ہیں اوس کے نورانی چہرے کو دیکھتے ہیں اپنی اولاد ہے اس سے اوس کی صورت ایسی پیاری اور حسین معلوم ہوتی ہے کہ چودھویں رات کا چاند اوس کے مقابل میں ماند ہے یہ سب کچھ ہے لیکن بیٹی ہے جب یہ خیال آتا ہے تو باپ کہتا ہے کہ کاش تو پیدا ہوتی۔ داغ لاولدی اس داغ سے بہتر تھا۔ اور اگر تیرا استقرار حمل میں ہو گیا تھا تو اٹھوانسی ہوتی یعنی آٹھ مہینے بعد پیدا ہوتی تاکہ جلد مر جاتی یہ ایک مشہور تجربہ ہے کہ آٹھ مہینے کا بچہ بچا نہیں کرتا اسی لئے ہندوستان کی عورتیں آٹھواں مہینہ زبان پر لانا بھی پسند نہیں کرتی ہیں اور اسے منحوس و شگون بد سمجھتی ہیں اس کا اظہار ان گنا کہہ کر کیا جاتا ہے۔ دیکھو ایک طرف تو اون جذبات کا اظہار ہے جو باپ میں بحیثیت باپ ہونے کے پایا جاتا ہے دوسری طرف اوس کراہت و نفرت کا نقشہ ہے جو جہالت و تاریکی دماغ کا نتیجہ ہے۔

یہاں تک شاعر نے عوام کی زبان بن کر اون کے دونوں جذبات کی تصویر کشی

کی۔ اب اوس کی التفات کروٹ لیتی ہے اور ایسی تدریجی حرکت کرتی ہے کہ
اوس کی ہر جنبش میں سابق سے زیادہ قوت کا اظہار نمایاں ہوتا ہے۔

صلاح عوام اور صنعت التفات

لیک چوں دادۂ خداے رواست — باخداوادگان ستیزہ خطاست
من پذیرفتم انچہ یزداں داد — کانچہ او داد باز نتواں داد
شکر گویم بہر چہ از دراوست — کان دہد بندہ راکہ درخوراوست
ہر چہ او داد بس پسندیدہ است — ہم دراوّل صلاح او دیدہ است

اشعار مذکورہ بالا میں صلاح عوام میں ترقی جس آہستگی سے کی گئی ہے اور اوس
کراہت کا جس طرح آہستہ آہستہ اندفاع کیا گیا ہے وہ کس قدر دلپذیر و پرتاثیر ہے۔
شاعر پہلے شعر میں یہ کہتا ہے کہ بیٹی کی ولادت ناگوار و مکروہ سہی لیکن کیا
کیا جاے خدا کی دی ہوئی چیز میں بندہ ستیزہ کرے یہ تو بڑی غلطی ہے پھر دوسرے
شعر میں یہ کہتا ہے عطاے الٰہی رد نہیں کی جاسکتی بلکہ قبول کی جاتی ہے پس میں نے
بھی قبول کیا۔ تیسرے شعر میں اسے نعمت سمجھتے ہوے اظہار تشکّر و امتنان ہے
چوتھے میں انتہاے پسندیدگی کی صدا ہے۔ سلسلۂ کلام پر غور کرو۔
پہلے ستیزہ پر تعجب پھر اوس کی قبولیت۔ اس کے بعد شکریہ آخر میں
انتہاے پسندیدگی۔ اس قدر کہہ لینے کے بعد شاعر کا بیان ایک اور
پہلو بدلتا ہے۔

گراں بہا دلائل سے صنفِ نازک کی اہمیت

پدرم ہم زما درست آخر — مادرم نیز دختر ست آخر
گر نہ بر در صدف نقاب شدے — قطرۂ آب باز آب شدے
دانہ بے کشت کے بہار آید — آسماں بے زمیں چہ کار آید
بے پدر ممکن ست شد معلوم — ق چوں مسیحا ز مریم معصوم
لیک بے مادر خجستہ وجود — ولدے رانگفتہ کس مولود

عورتوں کے وجود کی اہمیت اور صنف نازک کا بقاے۔ بنی آدم میں عنصر قوی و غالب ہونا جس طرح کہ ان اشعار میں ثابت کیا گیا ہے فقیر کی نظر سے کوئی نظم یا نثر اس زور و قوت کے ساتھ دیکھنے میں نہیں آئی۔ بالخصوص آخری شعر جس میں قیاس تمثیل سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور مولود کہے گئے لیکن آج تک بغیر ماں کے کسی کو مولود نہیں کہا جا سکا۔ اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ بغیر ماں کے مولود کا پایا جانا غیر ممکن اور بغیر باپ کے ممکن تو ماں یعنی عورت کا وجود افزایش بنی آدم میں باپ یعنی مرد سے زیادہ اہم و ضروری۔
اگر مردوں کا وجود تمھیں عزیز ہے تو ان کی افزایش بغیر افزایش اناث ناممکن ہے دوسرے شعر میں یہ کہتے ہیں کہ اگر پانی کو سیپ نہ ملے تو پانی پانی ہے لیکن سیپ جو بمنزلہ ماں کے ہے وہ چند دنوں میں اوس کی حقیقت بدل کر اوس مرتبہ کمال پر پہونچاتی ہے جہاں پہونچکر تاج شاہانہ کی زینت اوس سے کی جاتی ہے۔ اسی

طرح ایک کیڑا بصورت علقہ یعنی جونک مادۂ منویہ کے ساتھ باپ کی صلب سے
جدا ہوتا ہے اور رحم مادر کی بدولت اشرف المخلوقات اور تمام کائنات پر تصرّف
کرنے والا اون سے خدمت لینے والا ہوجاتا ہے پس انسان کو کرامت انسانی
جس کی بدولت نصیب ہوتی ہے کیا اوس کا وجود قابل نفرت وکراہت ہے؟
کیا یہ ناسپاسی منعم ومربی کے حق میں جائز ہوسکتی ہے۔ نہیں کبھی نہیں ہرگز نہیں

نصیحت کا شفقت آمیز حصّہ

ان دلائل کے بعد خسرو علیہ الرحمۃ بیٹی کو ایسے شفقت بھرے الفاظ سے خطاب
کرتے ہیں جس کا ایک ایک لفظ محبت والفت پدری میں ڈوبا ہوا ہے۔ جس طرح
ایک وہ باپ خطاب کرتا ہو جس کے ہر رگ وپے میں اسلامی تعلیم سرایت
کرگئی ہو اور اپنے پیغمبر کا اسوۂ حسنہ اوس کے دل پر نقش نگیں بن گیا ہو حقوق
اولاد سے واقف ہو اور شفقت پدرانہ اپنے اوپر فرحت بخش وروح افزا
فرض جانتا ہو۔

اے تنت را بجانِ من پیوند — کہ ہم مادری وہم فرزند
تو بدیں مایہ کز قضا داری — گر نہی پا بدیدہ جا داری
سر برآر از مبارک اختر خویش — کہ مبارک تری ز جوہر خویش
انچہ نقش تو با صلاح من ست — چوں تو خون منی صلاح من ست

یہاں پہونچکر یہ بیش بہا مضمون ختم ہوتا ہے لیکن اس تائید میں کہ خسرو علیہ الرحمۃ

کے وجود سے اندوہگین نہ تھے اوران باتوں سے اپنے دل کی تسلی
کر رہے ہیں بلکہ اصلاح عوام مقصود ہے۔ اگراس موقع پر وہ اشعار جو خمسہ کی
مثنوی مطلع الانوار میں موجود ہیں نقل کر دیے جائیں تو ناموزوں نہو گا۔

مطلع الانوار سے تائید مزید

اے رخِ تو چشم وچراغ دلم	خوب تریں میوہ زباغ دلم
گرچہ کہ اخواں چو تو نیک اختر اند	نے زتو در دیدۂ من بہتر اند
گاہِ تماشا بدلِ باغباں	سرو ہماں باشد و سوسن ہماں
دختر اگر نیست پسر کے شود	بے صدفِ تازہ گہر کے شود
بخت کہ فالِ تو ہمایوں نہاد	نام تو مستورۂ میموں نہاد

شعار مطلع الانوار میں کہیں نام ونشان بھی اوس نفرت کا نہیں ہے اسلئے
محض اپنی لڑکی کو نصیحت مقصود ہے۔ ابتداہی اس شفقت سے فرماتے
میرے آنکھوں کی نور دل کا سرور باغ دل کا اچھے سے اچھا میوہ ہے
مائی بھی گو نیک اختر اور میرے جگر کے پیوند ہیں لیکن میری نگاہوں میں
بتر نہیں ہیں۔ اور ایسا کیوں نہو۔ باغبان جب اپنے ہرے بھرے لہلہاتے
بنا ہے تو سرو وسوسن دونوں کی تازگی اوس کے لئے یکساں نظرا فروزو
ہوتی ہے۔

ی تفصیل کے بعد بھی کوئی یہ کہے کہ نہیں خسرو علیہ الرحمۃ بھی مثل عوام

تنگ حوصلۂ تیرہ خیال اشخاص کے ولادت دختر سے دل تنگ ہوئے اور ناقد
کی تقریر شاعر کے شعر کی تاویل ہے تو اس سخن فہمی کا کیا جواب۔
اِس شاندار و مرصع تمہید کے ختم ہونے پر نصائح کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جسمیں
کمال نکتہ سنجی سے ایسی سود مند نصیحتیں کی ہیں کہ ہر نصیحت بجائے خود ایک نور ہے۔
ارباب دانش سے یہ مراد پوشیدہ نہیں کہ نصیحت کرنے کے لئے تو ہر شخص
آمادہ ہو جاتا ہے لیکن جو نصیحت کا حق ہے وہ ہر ایک سے ادا نہیں ہوتا۔ اس
میں چند نکات بمنزلۂ اصول ہیں جنھیں معمولی نگاہیں پا نہیں سکتیں۔ مثلاً

خسرو اور نکات نصیحت

مخاطب کی ضروریات کا اوس کی شان وحیثیت کے موافق لحاظ رکھنا افراط
وتفریط سے نصیحت کا بری رہنا، وہ نصایح ایسے اصول پر مبنی نہوں جو ناصح کے
خود تراشیدہ ہوں بلکہ اون کی بنیاد ایسے اصول پر ہو جو محقق ومسلم ہو چکے
ہوں خطاب کے وقت اگرچہ ایک ہی فرد واحد مخاطب ہو لیکن نصیحت میں ایسی
جامعیت ہو جو کل اجناس کے لئے یکساں مفید ہو۔
خسرو علیہ الرحمۃ کو جہاں دیوان فطرت سے بہت سی نعمتیں عطا ہوئی تھیں وہاں
نصیحت گری کا سلیقہ بھی بہ تمام وکمال عطا ہوا تھا۔ یہاں چونکہ نصیحت کی مخاطب
بیٹی ہے اِسلئے جو نصیحتیں کی ہیں اون میں طبقۂ اُناث کی بہبود وصلاح کا کامل
لحاظ کر لیا ہے۔ ایک شریف بہو بیٹی کے مخصوص فرائض کیا ہیں۔ وہ کون سی صفات

ہیں کہ اگر کسی عورت میں نہ پائی جائیں تو وہ اپنی صفات سے خالی و عاری سمجھی جاے گی اس کو واضح طور پر دکھایا ہے۔

عصمت و عفت کی تاکید

ان نصائح کی بنیاد ایسی مضبوط چٹانوں پر ہے جنھیں فرضی و ملمع تہذیب کے طوفان جنبش نہیں دے سکتے۔خسرو کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

گرچہ خردی کنوں و بے تمیز — روزے آخر بزرگ گردی نیز

تا بود در بزرگیت دستور — خردۂ چند گویمت مستور

از عروسی شوی چو بر سر تخت — عصمتت خواہم اوّل آنگہ بخت

خلاصہ یہ کہ اے بیٹی اگرچہ اس وقت تو کم عمر اور چھوٹی ہے اور اپنے بھلے برے کی تجھے تمیز بھی نہیں لیکن آخر ایک روز جوان ہوگی پھولے گی پھلے گی اوس وقت کے لحاظ سے میں چند نادر باتیں کہتا ہوں تاکہ وہی باتیں تیری اوس زندگی میں دستور العمل ہوں۔

اے بیٹی خدا تجھے جب عروس بنائے تو اوس وقت کے لئے خدا سے میری یہی دعا ہے کہ بخت و اقبال سے پہلے عصمت کی دولت سے وہ تجھے مالا مال فرمائے۔

عصمت و عفت اگرچہ مرد کے لئے بھی ضروری ہے لیکن عورت کے لئے اوس سے بہت زیادہ ضروری۔شریعت میں بے عصمتی کی سزا گو مرد و زن دونوں کے لئے یکساں و مساوی ہے لیکن عورت کی بے عصمتی سے خاندان و قبیلہ

پر جو مصیبت نازل ہوتی ہے اوس کا اندازہ ہر شریف کر سکتا ہے۔

طاعت و عبادت

ازمن ایں آنچہ اوّلیں پندست ‏ ‏ ‏ جہد بر طاعتِ خداوندست

تا توانی خدا پرستی کن ‏ ‏ ‏ وزنیاز خدائے مستی کن

بچوّں کا پہلا مدرسہ جس کی تعلیم بہت ہی اثر کرنے والی ہے وہ ماں کی آغوش شفقت ہے اگر ماں خدا ترس و عبادت گذار ہے تو اولاد میں اللہ کی عظمت، عبادت کی رغبت بچپن ہی سے راسخ ہو جائے گی اور جوان ہو کر اپنے لئے، قوم کے لئے، ملک کے لئے اون کا وجود رحمت ہوگا۔ یہ امر محتاج بیان نہیں کہ بغیر دینداری و خداشناسی ایک انسان انسان نہیں ہوتا بلکہ حیوانی زندگی بسر کرتا ہے۔

حیا و پردہ

پا بدامانِ عافیت در کن ‏ ‏ ‏ رو بدیوار و پشت بر در کن

راہِ در کم کن از درونِ سرائے ‏ ‏ ‏ ور مثل خضر در زند مکشائے

زن کہ در کوچہا بہ تگ باشد ‏ ‏ ‏ زن نباشد کہ مادہ سگ باشد

عورتوں کے لئے حیا و شرم بہترین زیور ہے۔ اگر عورت میں حیا نہیں تو کچھ نہیں سیر و تفریح اور در بدر مارے پھرنا شریف زادیوں کو زیب نہیں دیتا ایسی باتیں گو ابتدا میں معمولی معلوم ہوتی ہیں لیکن انتہا میں اون کا نتیجہ حیا سوز نکلتا ہے یہ سب بری عادتیں ہیں۔

جھولا اور سرود

بادپیچ و دف کہ لعب زن ست | بروے ایں چنبرست و آں رسن ست
دف شاں بی ہراس دشمن دوست | فتنہ را بانگ می زند در پوست
آنکہ اوّل سرود سادہ بود | درنہایت صلاے بادہ بود

شریف بہو بیٹیوں کے لئے جھولا جھولنا۔ طبلہ بجانا۔ نغمات و سرود سے جی خوش کرنا عیب ہے۔ ابتدا میں یہ تفریح طبع کا سامان ہے لیکن انتہا اس کی شرافت کی بربادی ہے

حد سے زیادہ بناؤ سنوار

درزن آرد دو فتنہ رسوائی | سیم پاشی و پیکر آرائی
بس عروساں کہ فتنہ جوے شدند | از سفیدہ سیاہ روے شدند
چوں شدی بہر ہفت و نہ دررنج | نقد عصمت فتاد در شش و پنج
ایں ہمہ فتنہا کہ ہست وبال | با رضاے حلال ہست حلال

بناؤ سنوار، زیبائش و آرائش اوسی انداز سے چاہیئے جتنا کہ اوس کے شوہر کو پسندیدہ ہو اور شرافت کی حدود میں ہو۔ ہر وقت پوڈر و غازہ ملنا ہمہ دم اپنی آرائش میں محو رہنا چاہے گھر بنے یا غارت ہو سخت عیب ہے۔ شریف عورتوں کی تزئین بھی ایک امتیازی شرافت رکھتی ہے۔ شریف زادیاں صاف ستھری رہتی ہیں، اچھے کپڑے پہنتی ہیں، آرائش بھی کرتی ہیں لیکن ان کی ہر ایک شان آبرو باختہ عورتوں سے صاف امتیاز رکھتی ہے۔

خانہ داری وکفایت شعاری

از عروساں خزینہ داری بہ　　راست گوئی وراست کاری بہ
مرد اگر یک قراضہ کار کند　　زن بکد بانوی ہزار کند
دل نگہبان رخت باید داشت　　گرہ خویش سخت باید داشت
چوں ز شو خرچ زن فزوں باشد　　حال سامانِ خانہ چوں باشد

عورت کا کمال یہ ہے کہ گھر داری میں ایسا سلیقہ پیدا کرے کہ ایک روپے میں ہزار روپے جیسی عافیت و فراغت شوہر و بچوں کو پہونچے بغیر مرضی شوہر ایک حبہ بھی خرچ نہ کرے عورت کے لئے سخاوت ہنر نہیں ہے بلکہ شوہر کی کمائی اور اوس کی دولت اوسی کے مطابقِ مرضی صرف کرنا عورت کا کمال ہے۔

ہنر و دستکاری

گرچہ زر باشدت فراخ نہ تنگ　　تا نداری ز دوک و سوزن ننگ
دوک و سوزن گذاشتن نہ فن ست　　کالت پردہ پوشی بدن ست

عورتوں کا خاص ہنر چرخہ کاتنا اور کپڑا سینا ہے۔ خبردار اس ہنر خاص سے غفلت نہونے پائے چاہے خدا تجھے اپنے فضل سے مالا مال کر دے لیکن ہنرمندی سے بے پروائی نہو۔

ہر ایک نصیحت کو پڑھو اور اس پر غور کرو کہ خسرو یہ نصائح اپنی بیٹی کو فرما رہے ہیں اولاد سے زیادہ محبت کس کے ساتھ ہو گی جب ایک ایسا جلیل الشان باپ اپنی

بیٹی کے لئے ان اوصاف سے متصف ہونا پسند کرتا ہے تو وہ دوسری عورتوں میں بھی ضرور انھیں اوصاف کو ڈھونڈھے گا۔

امرا کا اثر متوسط و غربا پر

تجربہ اس پر گواہ ہے کہ افراد ہوں یا اقوام جہاں ان میں تمول آیا بس کاہلی و بے پروائی پیدا ہوئی جس کا نتیجہ ادبار و نکبت ہے۔ خسرو اسی لئے بیٹی سے یہہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ رزق میں کشایش فرمائے اور فراخی دولت تجھے نصیب ہو تو اوس وقت بھی اون ہنروں سے غفلت نکرنا جو شعار عورتوں کا ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ امرا و اہل دول کا اثر آہستہ آہستہ اوسط و ادنیٰ طبقہ پر بھی پڑتا جاتا ہے پس جب امرا کا گھر ایسا ہو کہ جہاں نہ گانا ہے نہ بجانا، نہ جھولا ہے نہ راگ راگنیاں نہ بناؤ سنوار ہے نہ بیہودہ اسراف بلکہ خانہ داری کا انتظام ہے اور بی بی کی سرگرمی۔ خود بی بی ہر طرح کا سلیقہ رکھتی ہو اپنے فرائض و ذمہ داریوں کو محسوس کرتی ہو۔ علی الصباح اوٹھ کر دوگانہ فریضہ ادا کرکے تلاوت سے جب فارغ ہوئی ہو تو بچوں کے کپڑے درست کرتی ہو یا اپنا لباس بناتی ہو غرض خود کام کرتی ہو اور کام کرنے والوں پر نظر رکھتی ہو۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود اوس گھر کا ساز و سامان درست ہوگا۔ اور اوس کا اثر اوسط و ادنیٰ پر یہ ہوگا کہ وہ کام اپنے ہاتھ سے کرنے کو عار نہ سمجھیں گے بلکہ بڑائی کی علامت خیال کریں گے۔ رفتہ رفتہ قوم کی قوم میں قوت عملیہ کو ایسی جنبش ہوگی کہ ہر جنس اور اوس کا ہر فرد اپنے اپنے

فرائض میں مصروف ہوگا۔

اس زمانے کے خوش حال طبقہ میں اپنا کسی طرح کا کام اپنے ہاتھ سے کرنا عیب سمجھا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ غربا و مساکین کا شعار ہے۔ عورتیں ہیں کہ ہنر و خانہ داری سے ہاتھ اوٹھا بیٹھی ہیں اوس کا ادنیٰ نتیجہ یہ ہے کہ شوہر روپیہ کماتے کماتے تھکا جاتا ہے لیکن گھر میں کسی کو آسایش نصیب نہیں۔ شاید خسرو کے عہد میں بھی امرا کے گھرانوں کا انھیں لغویات و باطل خیالات کی طرف میلان شروع ہوگیا ہوگا۔

نئی تہذیب کا اعتراض

بہرحال اس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ نصیحتیں اسی قابل ہیں کہ ہر شریف بہو بیٹی انھیں اپنا دستور العمل بنائے۔ لیکن ہزار افسوس کہ اس دور تہذیب کے روشن خیال حضرات خسرو کی ایسی بیش بہا نصائح پر کہہ اوٹھے کہ "اوس زمانے میں عورتوں کی حالت نہایت پست تھی امیر خسرو اس قدر صاحب دولت و ثروت تھے لیکن بیٹی سے کہتے ہیں کہ خبردار چرخہ کاتنا نہ چھوڑنا اور کبھی موکھے کے پاس بیٹھ کر ادھر اُدھر نہ جھانکنا"۔ میرے دوستو۔ جوشِ تہذیب میں آکر اسلام کے مایۂ ناز بزرگوں کو اپنے مطاعن کا ہدف نہ بناؤ۔

ناصح کی شان کا علو

ذرا اس کو سوچو کہ یہ نصائح کس نے کئے ہیں۔ کس زمانے میں کئے ہیں نصیحت

کرنے والا کس دل و دماغ کا شخص تھا۔ اس کی خاندانی وجاہت کیا رتبہ رکھتی تھی علاوہ علم و فضل کے کیسی آب و ہوا میں یہ زندگی بسر کرتا تھا۔ انقلابات ایّام کے کیا تجارب اس کے پاس تھے۔ اوس وقت مسلمانوں کی ذی علم جماعت دنیا میں کیا وقار و وقعت رکھتی تھی۔ اگر تم انصاف سے ان امور پر ایک سرسری نظر بھی ڈالو گے تو تم اپنے اس فیصلے پر قائم نہ رہو گے کہ عورتوں کی اوس وقت ایسی ذلیل و پست حالت تھی جو اون کو ایسی نصیحتیں کی گئیں۔

امیر خسرو اوس باکمال و بلند حوصلہ باپ کے فرزند ہیں جس نے ترکستان سے جب ہندوستان کا ارادہ کیا تو خاک ہند نے کس کس طرح اپنے مہمان عزیز کی میزبانی کی۔ بادشاہ نے جاگیر دی۔ عہدہ دیا۔ منصب کا پایہ بلند کیا یہاں تک کہ امرائے سلطنت کی سلک میں منسلک ہو گئے۔

امیر خسرو کی ماں اوس جلیل الشان با خدا رئیس کی بیٹی تھیں جنھیں دینی دولت کے علاوہ ہندوستان میں عماد الملک کا لقب حاصل تھا اگر والدین کی شرافت اُن کے حوصلہ کی بلندی ہمّت کی فراخی اولاد کے حق میں کچھ بھی مفید ہو تی ہے اور والدین کا خون اگر کچھ بھی اثر رکھتا ہے تو پھر اسے خسرو کے حق میں ماننے سے کیوں دریغ کیا جائے خود امیر خسرو کی ذات گوناگوں کمالات کی جامع تھی علوم و فنون میں اونھیں جو پایۂ بلند حاصل تھی اوس کی شہادت اون کی تصانیف ہیں تزکیہ باطن کے لئے محبوب الٰہی کا محبوب ہونا کفایت کرتا ہے۔ تمول کے لیے لفظ امیر کافی ہے انقلاب دہر کا تجربہ اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ گیارہ سلاطینِ با آئین ان کے وقت میں گذرے

جن میں سے سات بادشاہوں کے تقرب کا انھیں پورا موقع ملا۔ موقع شناسی اور دماغ میں سلجھاؤ اس سے ظاہر ہے کہ سلاطین کا تغیرِ سلطنت کا نظام الٹ دیا کرتا تھا۔ لیکن امیر خسرو ہر عہد میں ممتاز و باوقار رہے۔

ایّام سلف کی برکات

وہ زمانہ مسلمانوں کی ایسی اعلیٰ تہذیب کا تھا جس نے ہندوستان جیسے متعصب ملک میں اپنی تہذیب گھر گھر پہونچا دی تھی۔ مسلمانوں کے قوائے عملیہ سست و کاہل نہ تھے اس لئے محض بیکار رہنا موجب عار سمجھا جاتا تھا۔ اس میں کوئی تخصیص مرد و عورت کی نہ تھی تعلیمات اسلامی کا یہ اثر تھا کہ سلاطین تک شریعت کے فتوے سے کانپ اوٹھتے تھے۔ اوس وقت علما و مشایخ کی ایسی جماعت ہندوستان میں تھی اور روز افزوں ہو رہی تھی جن کی تصانیف آج شریعت و علوم اسلامیہ کی ضامن ہیں۔

دنیا کے مختلف گوشے مسلمانوں کے سیف و قلم سے مفتوح ہو چکے تھے ان کی سطوت و جلالت اکناف عالم پر چھائی ہوئی تھی۔ پس اوس عہد میں جبکہ ملک اپنے زیر نگیں تھا فاتحانہ و ملوکانہ جذبات دل و دماغ میں تھے۔ سیاست کی تلوار اور شریعت کا تازیانہ ہر طرح کی محافظت کر سکتا تھا۔ اولیاے کرام و علماے عظام کی پاک صحبتیں خیالات فاسدہ کی بیخ کنی کیا کرتی تھیں فتوحات کے فراخ دروازے بے زری و تنگ دستی کے مفہوم کو مٹا رہے تھے۔ خسرو جیسا عالی دماغ ولی کامل

امیر کبیر آزمودہ کار اپنی بیٹی کو جو کچھ کہہ رہا ہے وہ اگر منافئ شرافت نہیں ہے تو پھر اس عہد کے مسلمان جن کی حالت ہر پہلو سے زبوں ہے ان کی بات پایۂ اعتبار رکھنے کی کیونکر مستحق ہو سکتی ہے۔ اوس عہد کی ماؤں کی بلندی تو اسی سے ظاہر ہے کہ اون کی اولادیں دنیا میں ہر طرح کی یادگاریں چھوڑ گئیں۔ علم، عمل دولت، سلطنت، جرأت، شجاعت کیا کچھ فضائل انسانی کے بیش بہا خزائن نہ تھے جو اسلاف نہ چھوڑ گئے۔ لیکن اون کے جانشین ایسی ہی بلند حوصلہ و عالی ہمت پیدا ہوئے جنھوں نے نہایت بدسلیقگی سے اون بیش بہا خزائن کا مالک اغیار کو کر دیا اور خود دست نگر ہونے کا بھی شعور کھو بیٹھے۔

حاصل جواب

وہ شریفانہ معاشرت کہاں گئی۔ جبکہ عورتوں کے کپڑے غیر محرم دیکھ بھی نہ سکتے تھے چہ جائیکہ اون کا سینا اور دھونا۔ تم چرخہ چلانے یا سلائی کا ہنر جاننے پر طعن کرتے ہو یہ تو ویسا ہی ہوا جیسا کہ ناعاقبت اندیش اہل دول لڑکوں کو تعلیم سے محروم اس بنا پر رکھتے ہیں کہ علم غربا کے لئے ہے، ہماری اولاد کو کیا دفاتر میں نوکری یا اسکولوں میں معلمی کرنی ہے۔

ہاں یہ اعتراض کہ کمالات علمیہ اور دیگر فضائل انسانی کی طرف اس بلند آہنگی سے کیوں توجہ نہ دلائی گئی جس قدر کہ امور خانہ داری پر زور دیا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی خسرو کا ایک کمال ہے کہ جہاں نصیحت کا مخاطب بیٹی کو فرمایا ہے

تو اوس وقت ایسی نصائح جو مابہ الامتیاز مرد و زن ہیں اونھیں کو غالب رکھا ہے اور جہاں بیٹا مخاطب ہے تو اوس سے وہی باتیں کہی ہیں جن کا سزاوار مرد ہی ہو سکتا ہے۔ اگر عام پند اور مابہ الاشتراک نصایح سے خطاب فرماتے جو مخصوص فرائض اناث نہیں بلکہ فرائض انسان و اسلام ہیں تو پھر یہ معلوم ہوتا کہ خطاب دختر کی اس میں تخصیص کیا ہے۔

خطیب کا یہ بھی ایک کمال ہے کہ مخاطب کا صحیح اندازہ کر کے اوس کو ایسی نصیحتیں کرے جو اوسی سے مخصوص ہوں ورنہ عام نصیحت کے لئے خصوصیت و تشخص بیکار ہے اوس کے لئے پھر خطاب عام چاہئے۔ بہر حال خسرو کے تمام نصائح کو پڑھ جاؤ اوس کے بعد ایک ایسی ذات کا جو ان اوصاف سے متصف ہو تصور کرو تمھیں ایک رحمت الٰہی مجسم نظر آئیگی۔ افسوس ہے کہ یہ مضمون اندازہ سے بہت زیادہ پھیل گیا لیکن خسرو علیہ الرحمۃ پر جبکہ ایسا قلم معترضانہ رواں ہو جسے اون کے کلام کا صحیح مفہوم لکھنا چاہئے تھا تو پھر اُس کی اصلاح اس سے کم میں ناممکن تھی۔ اس دَور کے ارباب قلم کی غلطی تسلیم کرنا اس سے کہیں زیادہ سہل ہے کہ خسرو علیہ الرحمۃ پر ایک بے بنیاد الزام کا اثبات زبردستی کیا جائے۔ ناظرین مجھے معاف فرمائیں میں سلف کا دلدادہ و شیفتہ ہوں ؎

فتنۂ گفت گوے ایشانم   مستِ لاے سبوے ایشانم

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا وہ ایسے مضامین تھے جو آغاز مقصد سے قبل مثنوی میں عموماً

خسرو لکھا کرتے ہیں۔ اب اصل قصہ سے اقتباس کرکے حسن کلام کا نمونہ دکھایا جاتا ہے۔

بیان حسن کنیز چینی

برچو ناریخ نو بشاخ درخت	سخت رستہ ز صحبت دل سخت

رگ نمودہ بروں ز لطف بدن	ہمچو رشتہ درونِ درعدن

شوخی و عاشقانہ انداز کے ساتھ پہلے شعر میں سختی کی جو وجہ بیان کی گئی ہے وہ بالکل نرالی ہے اور اچھوتا تخیل ہے لیکن معقول۔ دوسرے شعر میں گورے گورے بدن میں سے رگوں کا پھوٹ کر ایک دل فریب رنگ پیدا کرنا کیسا نادر خیال ہے۔ جس کسی نے سلک مروارید کو دیکھا ہوگا اس تشبیہ کے لطف کو وہی سمجھ سکتا ہے کہ کیسی لطیف تشبیہ ہے۔

قدر اندازی بہرام

آہن تیر چوں محک کردے	خط گوراں ز پشت حک کردے

ور ز آہو بدے نشانہ او	موے بشگافتے ز شانۂ او

ور شدے بر نشانہ سخت انداز	رخنہ در نافِ کوہ کردے باز

صرف تین اشعار میں تمام شعبہائے تیر اندازی کے کمال کو جس صفائی و سلاست سے آپ نے بیان کیا ہے اس سے کلام کی پختگی و چستی ظاہر ہے۔ یعنی جس طرح چاہتا تھا تیر چلاتا تھا۔ کبھی تو گورخروں کی پشت پر جو خطوط ہوتے تھے اونھیں تیر سے اڑا دیتا

کبھی ہرن کے بالوں کی موشگافی کرتا - اور شکار کو کچھ بھی آسیب و آزار نہ پہونچتا
اور جو زخم پہونچانا چاہتا تو ایسی قوت و طاقت سے تیر بیٹھتا کہ گورخر کا تو کیا ذکر
پہاڑ میں بھی سوراخ ہو جاتا۔ خسرو علیہ الرحمۃ ہشت بہشت کی بنیاد رکھتے ہوئے فرماتے ہیں؎

پس نوشتم بکلک مشک سرشت　　　نام ایں ہشت خانہ ہشت بہشت
تا کسے کاندرو گذر یابد　　　بے قیامت بہشت در یابد

اب اس بہشت کا جسے لطف حاصل کرنا ہو اوس کو ایک سرسری نظر سے پوری کتاب
مطالعہ کرنا ضرور ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اشعار کہاں کہاں سے لئے گئے ہیں اور باہم
ربط و مناسبت اونمیں کس طرح ہے۔

گنبد مشکیں بہشت دوم

بہرام کے وزیر با تدبیر نے صید و شکار سے جب بہرام کو باز رکھنا چاہا ہے تو اوس نے
سات گنبد عجیب و غریب نادر و حسین طیار کرائے ہیں۔ ہر گنبد کا رنگ مختلف ہے
ہر ایک میں ایک شاہزادی ایک ایک اقلیم کی رونق بخش ہے۔ بہرام ہر ایک
شاہزادی کے گنبد میں ایک ایک شب جاتا ہے اور کسی قصہ کی فرمایش کرتا ہے۔
شاہزادی قصہ بیان کرتی ہے۔ اس طرح اس میں سات قصے امیر خسرو نے نظم
فرمائے ہیں۔ خسرو کی شاعرانہ قوت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ
ایک بہشت کا بیان شروع کرتے ہیں تو اوس کے رنگ کو بیان کرتے ہوئے ابتداء
قصے سے آخر قصے تک اوسی رنگ کی رنگینی معلوم ہوتی ہے۔ جو بات نکلتی ہے اوسی

رنگ میں ڈوبی ہوئی نکلتی ہے۔ پھر اوس رنگ کے فلسفے کو بیان کرکے اپنی رنگینی طبع کا عجیب رنگین ثبوت دیتے ہیں۔ مثلاً گنبد مشکیں کی تمہید میں فرماتے ہیں ؎

روز شنبہ کہ باد مشک انگیز — شد بدامانِ صبح غالیہ ریز

شہ بگنبد سرائے مشکیں شد — خانہ زو ہمچو نافۂ چیں شد

جامہ را ہم برنگِ کیوانی — داد ترتیبِ عنبر افشانی

ان اشعار میں قطع نظر اون صنائع لفظی کے جو امیر صاحب کا روزمرّہ ہے گنبد کا رنگ چونکہ سیاہ تھا اس لیے بہرام کا اوس میں داخل ہونا بھی بروز شنبہ رکھا گیا۔ اور ستارہ شنبہ یعنی زحل کا رنگ سیاہ ہے۔ بہرام خود سیاہ پوش ہے شہزادی کا لباس بھی گنبد مشکیں کی طرح سیاہ ہے۔ اس کا التزام مثنوی کے ہر قصہ میں ہے کہ جس طرح ہر گنبد کا رنگ مختلف ہے اُسی کی رعایت سے شاہزادیوں کا لباس بھی مختلف رنگ کا ہے۔

ہر یکے ہم برنگ مسکنِ خویش — جامہ را رنگ داد برتنِ خویش

اگرچہ کمال شاعری و لطف سخن کو ان باتوں سے سروکار نہیں لیکن اس قسم کی رعایتوں سے ایک دل فریب تخیل پیدا ہوتا ہے اور ساری کتاب کو پڑھ جانے سے ایک ایسی مینا کاری معلوم ہوتی ہے جو ہشت بہشت کو اسم بامسمیٰ بنا دیتی ہے۔

گنبد مشکیں یعنی بہشت دوم میں سیاہ رنگ کی رعایت مقصود ہے۔ اسلئے امیر صاحب اوس وقت کو جبکہ تینوں شاہزادے غریب الوطنی ورہ نوردی کے بعد باپ کے

پاس آتے ہیں اور باپ خوش خوش بڑے لڑکے کو سلطنت حوالہ کرتا ہے یوں بیاں فرماتے ہیں ؎

پدر پیر شادمانی یافت | بار دیگر ز سر جوانی یافت
بسکہ از خوش دلی بہ تمکیں گشت | موے کافور گونش مشکیں گشت
کردہ روشن بہ مہتریں پسراں | بالش مشک وام تاجوراں
چتر مشکینش داد با ہمہ چیز | دیگراں را لواے مشکیں نیز

لیکن اس خیال سے کہ سیاہ رنگ عموماً نشان ماتم ہے اس کو عیش و نشاط، فرحت و انبساط سے کیا علاقہ۔ اِس لئے امیر صاحب ختم قصّے پر اس فلسفہ کو بیان کرتے ہیں کہ سیاہ رنگ بھی اپنے موقع و مناسبت سے دل آویز و نظرا فروز ہوا کرتا ہے ؎

رنگ مشکیں شعار عبّاسی ست | زیور آراے چرخ شمّاسی ست
ظلمت شب کہ مشک فام بود | بہر آسایش تمام بود
خون تر در میانِ نافہ خشک | تا نگردد سیہ نباشد مشک
خط و خالیکہ دلستاں دارد | مشک رنگ ست زیب ازاں دارد

بیان وجوہ میں بتدریج ترقی قوت بھی ملحوظ خاطر ہے۔ قصہ ختم ہوتا ہے۔ بہرام ہم آغوش ہو کر خواب سے راحت پذیر ہوتا ہے۔ اوس عیش کے وقت کو یوں بیان فرماتے ہیں ؎

شاہ کز نازنین مشکیں موے | ایں فسانہ شنید روے بروے

خفت در خواب گاہ حور العین   گل در آغوش و مشک بر بالیں

واقعہ نگاری اور تسلسل

سبحان اللہ ایک رنگ سیاہ نے کتنے خوش آیند خیالات پیدا کر دیے ہیں جس سے
شاعر کی قوت متخیلہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ اوس کے
تمام اجزا اس طرح بیان کیے جائیں کہ تسلسل مضامین کی کوئی کڑی چھوٹنے نہ پاے
اس کے ساتھ ہی اس کا بھی لحاظ رہے کہ غیر ضروری بات مذکور نہ ہونے پاے بعض
مقام ایسے ہوتے ہیں کہ وہاں کنایہ تصریح سے زیادہ صراحت کرتا ہے اور کلام کی
بلاغت اوسی کی مقتضی ہوتی ہے۔ کسی جگہ تصریح و تشریح کے بغیر بلاغت کا حق ادا نہیں
ہوتا۔ مثنوی نگار اگر اس کا لحاظ نہیں کرتا ہے تو اوس کی خامی و کم مائگی سمجھی جاتی ہے
خسرو علیہ الرحمۃ کی شاعری اس کمال میں بھی کامل ہے۔ ہر ایک قصہ میں اس تفصیل
سے جزئیات کو بیان فرماتے ہیں کہ ایک بات سے دوسری بات خود نکلتی آتی ہے
اوس پر زبان کی صفائی اور بندش کی چستی کا یہ حال ہے کہ اوس سے کم عبارت میں
اگر اوسی مضمون کو بیان کیا جاے تو لطف ادا کو کھوے بغیر ہو نہیں سکتا۔ اور اگر طول
دی جاے تو حشو و زوائد میں شمار ہو۔ اوس کا اصلی لطف تو اوسی کو حاصل ہو سکتا ہے
جو پوری کتاب پڑھ جاے۔ لیکن دو ایک نمونہ جستہ جستہ پیش کرتا ہوں۔

پہلی مثال بہشت دوم کی شاہزادی نے جو قصہ بیان کیا ہے اوس میں تین غریب الوطن
شاہزادوں کی فراست اور علم بالآثار کا ذکر ہے۔ اوس وقت جبکہ شاہزادے ایک

بادشاہ کے مہمان ہیں اور اون کی ضیافت میں شراب وکباب مہیا کیا گیا ہے۔ ایک نے شراب میں آدمی کے خون کا لگاؤ بتلایا۔ دوسرے نے کباب کو کتے کا قرار دیا۔ تیسرے نے بادشاہ کو باورچی کا لڑکا کہا۔ بادشاہ پشت دیوار سے اون کی گفتگو سن رہا تھا۔ اپنے متعلق ایسا ہوش ربا حکم سن کر تحقیق شروع کرتا ہے۔ پہلے دونوں حکم صادق آتے ہیں۔ اس سے تیسرا حکم جو خود اوس کے متعلق ہے اوس کے صدق کا پلہ غالب آتا ہے۔ ماں کے پاس جاتا ہے اوس کے غضبناک انکار پر قتل کی دھمکی دیتا ہے۔ آخر ماں کو جب اپنی موت کا یقین آجاتا ہے تو مجبور ہو کر اقرار کرتی ہے۔ بادشاہ اپنے مہمانوں کے پاس آتا ہے اور اون کی فراست کی داد دینا چاہتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تم لوگوں نے کیونکر یہ پہچان لیا۔ وہ وجہ بتلاتے ہیں۔ امیر صاحب کا قلم اس طرح اوس کی تصویر کشی کرتا ہے ؎

شہ چو بشنید راز ما درخویش — سرفگند از خجالت اندر پیش
رفت درخود فرو و حیراں گشت — وز چناں پرسشے پشیماں گشت
جست بیروں ز کاخ شرمندہ — وز تحیر نہ زندہ نے مردہ
شد بخلوت سرائے مہماناں — بے زباں گشت زاں زباں داناں
چوں گذشت از شراب دورے چند — راز را بر گرفت مستی بند
گفت کانچہ از شما شنیدم راز — ہمچناں یافتم چو جستم باز

ایسے خجلت انگیز راز کے افشاء نے بادشاہ کی جو حالت کر دی ہو گی اوس کا نقشہ

امیر صاحب کے قلم نے کس خوبی سے کھینچا ہے۔ ایک ایک شعر کو پڑھئے اور ہزاروں داد دیجئے۔ بادشاہ کا ہکا بکا ہو جانا ایک فطری بات ہے لیکن تسلسل بیان اس کا مقتضی ہے کہ بادشاہ خود اپنے منہ سے اس شرمناک راز کی تصدیق کرے تکمیل قصہ کے لئے اوس کے منہ سے اقرار کرانا ضروری تھا۔ اس لئے بیچ میں شراب کو ڈالا۔ اس سے عمدہ ذریعہ اقرار کا ہو نہیں سکتا تھا۔

دوسری مثال اسی طرح بہشت ہفتم کے بیان میں شاہزادہ جب طلسمی سرمہ آنکھوں میں لگا کر وزیر کے دربار میں نظر سے غائب ہوتا ہے اور اپنے موکل دیو کو اشارہ کرتا ہے کہ بدکار وزیر کو دھول لگائے اس کا بیان بس ہو بہو فوٹو ہے ؎

کرد اشارت بدیو تا برخاست — دست خود کرد بہر سیلی راست

زد قفائے بخواجۂ دیواں — کہ بلرزید زاں طراق ایواں

کارداراں زجائے برجستند — سرآں حال راہمے جستند

ہمدریں گفتگوئے بُد ہر کس — کاہرمن باز در رسید زپس

زد چناں سیلیِ دگر ناگاہ — کز سر خواجہ برفتاد کلاہ

کُلہ گرد خوردہ رازاں گرد — تا ستاند قفائے دیگر خورد

حیرتے درمیانِ خلق افتاد — دوست آزردہ گشت دشمن شاد

مردماں از خجالتِ دستور — دُور گشتند یک بیک زحضور

ایں زسودائے سیلیش خنداں — واں دگر پشتِ دست برنداں

خواجہ جست از خجالتِ سیلی   بارخِ زرد گردنِ نیلی

ان ابیات میں جس تفصیل سے دیو کا ہاتھ اوٹھانا اور دہول مارنے کے لئے اوس کو سنبھالنا اور پھر ایک دہول لگا کر ڈھیر جانا لوگوں کا متحیّر ہونا اور آپس میں تحقیق کی نظر سے گفتگو کرنا۔ اس اثنا میں دوسری دہول کا رسید ہونا وغیرہ وغیرہ جس شرح و بسط سے بیان کیا ہے اوس کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے سچ پوچھئے تو واقعہ مذکورہ کی تصویر اس سے زیادہ روشن و دل آویز کیا کھینچی جا سکتی تھی۔

ان دو نمونوں سے یہ دکھلانا تھا کہ امیر صاحب جہاں صنائع و بدایع اور محاسن لفظی و معنوی کے خسرو ہیں وہاں بیان واقعات میں بھی اوسی قدر رفیع و اعلیٰ پایہ رکھتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ امیر صاحب مثنوی لکھنے کا حق رکھتے تھے اور صحیح معنوں میں آپ نے مثنوی کا حق ادا کیا۔

حیثیت شخصی کا لحاظ

مثنوی نگاری میں یہ حصہ شاعر کے لئے نہایت ہی معرکۃ الآرا رہا ہے ایک ہی حالت ہوتی ہی مگر اوس کا اثر باعتبار اشخاص مختلف ہوتا ہے اب اگر شاعر حالت کے ساتھ شخص کا لحاظ نہیں رکھتا ہے تو اوس کے بیان کا یہ پہلو کمزور رہ جائے گا۔ مثلاً فرض کرو ایک نبرد آزما ہے جس نے مختلف میدانہا کارزار میں اپنے شجاعت کا جوہر دکھایا ہے۔ وہ کسی ایسے ناز پروردہ کا ہم سفر ہے جس نے تنعم کے سایہ سے کبھی قدم

باہر نہیں نکالا۔ اتفاقاً کسی موقع پر رہزنوں کی جماعت حملہ آور ہوتی ہے تو اوس وقت اوس تجربہ کار سپاہی اور نازپروردہ رفیق کے دل پر جو اثر ہوگا وہ ایک دوسرے سے بالکل مغائر ہوگا۔

سپاہی آزمودہ کار کے حواس درست ہوں گے دست و بازو میں قوت موجود ہوگی رگوں میں شجاعت کا خون دوڑتا ہوگا۔ چہرہ جوشِ بہادری سے تمتا رہا ہوگا۔ برخلاف اس کے نازپروردہ کے چہرے پر ہوائیاں چھوٹ رہی ہوں گی بدن پر لرزہ طاری ہوگا۔ ہوش برجا نہوں گے۔

اس مثال سے یہ غرض ہے کہ جب کسی واقعہ یا حالت کا بیان ہو تو جس شخص سے اوس کا تعلق ہے اوس کا لحاظ بھی ضروری ہے۔ خسرو علیہ الرحمۃ کے اس کمال کے بھی نمونے ملاحظہ ہوں۔

مثال اوّل۔ بہرام شکارگاہ میں خفا ہوکر دلارام کو گھوڑے سے اوتار دیتا ہے اور خود گھوڑے کی باگ موڑ کر روانہ ہوجاتا ہے۔ دلارام دشت پرخار میں تنہا رہ جاتی ہے اوس وقت اوس کے دل پر کیا گذری اور اوس نے کیا کیا اور کیونکر کیا اس کی ہو بہو تصویر ان اشعار میں دیکھیے یہ یاد رہے کہ دلارام بہرام کی معشوقہ جاں نواز ہے عیش و عشرت ناز و تنعم میں نشو و نما پایا ہے۔ دل کی کلی ہمیشہ کھلتی رہی ہے یہ کوئی معمولی حیثیت کی عورت نہیں ہے اس پر جو یہ مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تو اس کی حالت بھی معمولی حیثیت کی عورت سے مغائر ہوگئی خسرو اسی کو بیان کرتے ہیں۔

ماند بیخویشتن صنم تا دیر   تشنہ و غرق آب و از جاں سیر

پس بصد خستگی ز جا برخاست   راہ صحرا گرفت و می شد راست

بسکہ منزل بدشت ویراں داشت   سایۂ خویش دیو می پنداشت

بسکہ رہ بر سنان تیزش بود   موزہ غربال خاک بیزش بود

از کفِ پائے خارہائے چو تیر   میگذشتش چو سوزنے ز حریر

پا کہ از برگ گل فگار بود   چوں شود چوں بروئے خار شود

کس نہ ہمراہ و رہنماش مگر   سایہ در زیر و آفتاب زبر

می نمود اندراں پریشانی   گفتہ و کردہ را پشیمانی

زاں بساط ددان آہو خوارے   کردہ بیم ددانش آہو پائے

بیم بودش کہ پا شود بطواف   چوں سمِ آہو از میانہ شگاف

کس خوبی سے خسرو علیہ الرحمۃ نے اوس کی کیفیت کا نقشہ کھینچا ہے ملاحظہ ہو
پہلا اثر تو اس ناگہانی آفت کا یہ ہوا کہ وہ ایسی متحیر و ششدر ہو گئی کہ تھوڑی
دیر تک یہ بھی سمجھ نہ سکی کہ واقعہ کیا گذرا جب آہستہ آہستہ اوس کے حواس اپنا صحیح
فعل کرنے لگے تو اوسے اپنی اس نازک حالت کا اندازہ ہوا۔ زبان سوکھ کر کانٹا
ہو رہی ہے جسم ہے کہ پسینہ میں شرابور ہے۔ جینا وبال ہو رہا ہے۔ دیکھئے پہلا شعر
ان سب کیفیات پر کس طرح حاوی ہے ؎

ماند بیخویشتن صنم تا دیر   تشنہ و غرق آب و از جاں سیر

کچھ سوچ سمجھکر اوٹھتی ہے تو جسم میں طاقت نہیں بدن ہے کہ رنج و غم سے چور چور ہے بصد خرابی اوٹھی اور ایک سمت کا رخ کیا۔ اس کیفیت کو دوسرے شعر میں دیکھیئے

پس بصد خستگی ز جا برخاست　　　راہ صحرا گرفت و می شد راست

ایک صحرائے لق و دق مہیب و وحشتناک ہے۔ غولان بیابانی کا نشیمن ہے۔ تنہائی و بیکسی نے ایسا متوحش کر دیا ہے کہ اپنے سایہ کو بھی وہ بھوت سمجھتی ہی انتہائی اضطراب و گھبراہٹ خوف و وحشت میں جو حالت کہ طاری ہوتی ہے اوس کا صحیح نقشہ یہی ہے جو اس شعر میں ہے ؎

بسکہ منزل بدشتِ دیواں داشت　　　سایۂ خویش دیو می پنداشت

اوس کی نزاکت و لطافت کے ساتھ صحرائے پرخار نے کیا سلوک کیا اوس کو اس شعر میں دیکھیئے ؎

بسکہ رہ بر سنانِ تیزش بود　　　موزہ غربال خاک بیزش بود

اسی طرح ہر شعر ایک خاص حالت و کیفیت کا نمونہ ہے۔

دوسری مثال۔ بہشت دوم کے قصے میں بادشاہ نے جبکہ بیٹوں سے تخت و تاج کا مالک بننے کے لئے کہا ہے تو اوس وقت ہر ایک بیٹے نے جو جواب دیا ہے وہ قابل لحاظ ہے مثلاً بڑا بیٹا یہ جواب دیتا ہے ؎

پور دانا بخاک سود کلاہ　　　گفت جاوید باد دولت شاہ

کی روا باشد از ہوا خواہی　　　کہ زنم پیش شہ دم شاہی

ناتوئی ملک بر کسے نہ سزاست | بے تو خود زیستن برائے چراست
تخت ما ولے چوں منے نبود | جائے تو جائے چوں منے نبود
مور با آنکہ بر سریر بود | کی سلیمان و تخت گیر بود

بیٹے کی سعادت مندی اسی کی مقتضی تھی کہ باپ کے رہتے ہوئے بیٹا ہوس سلطانی نہ رکھے لیکن ضمن جواب میں اس امر کی ناموزونی جو آخر شعر میں بیان کی گئی ہے وہ حسن التعلیل کے ساتھ عجب ادب آموز نکتہ ہے ؎

مور با آنکہ بر سریر بود | کی سلیمان و تخت گیر بود

اس شعر پر جتنا غور کروگے اتنا ہی لطف آئیگا۔

اب بادشاہ منجھلے بیٹے کو بلاتا ہے اور اوس کے سامنے تخت و سلطنت پیش کرتا ہے منجھلے کا جواب سنئے ؎

گفت مارا بجان و بینائی | کردنی شد ہر انچہ فرمائی
لیک پیشت حدیث تاج و سریر | عیب باشد ز بندہ عیب مگیر
گر بود در سرت کہ افسر خویش | خود مزین کنی بگوہر خویش
مہترے ہست آخر از من خورد | بار سر چز بدوش نتواں برد
بر بزرگاں رواست ایں معراج | لولوے خورد نیست درخور تاج

اگر منجھلا بیٹا صرف اسی قدر جواب پر اکتفا کرتا کہ آپ کا فرمان سر آنکھوں پر لیکن تاج و سریر کا ذکر آپ کے سامنے کرنا بڑے عیب کی بات ہے اگر اس میں حکم

عدولی ہو تو بندہ کو نافرمان نہ خیال کیا جاے تو بڑے اور منجھلے کی خصوصیت نمایاں نہو تی۔ اس لئے اوس نے اپنے جواب میں اس قدر اور اضافہ کیا کہ اگر آپ کی یہی خواہش ہے کہ آپ اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں تاج شاہی سے مزین فرمائیں تو بسم اللہ بڑا بھائی موجود ہے یہ حق اوس کا ہے اور آپ کے بعد اوسی کو زیب دیتا ہی اُس کی دلیل یہ ہے کہ سر سے بوجھ اوتار کر کاندھے پر رکھنے کا دستور ہے۔ اب جواب کامل ہوگیا۔ بڑے اور منجھلی کا فرق بھی نمایاں ہوگیا۔ باپ کی موجودگی میں سلطنت سے دست برداری بھی ظاہر کردی اور اوسی کے ساتھ بڑے بھائی کا ادب و حق ملحوظ رکھتے ہوے فرق مراتب باپ اور بڑے بھائی کا بھی "بار سر جز بدوش نتواں برد" کہہ کر قائم کردیا۔

تیسری مثال۔ بہشت ششم کے قصّے میں جسوقت سوداگر زادہ طلسمی حمام سے ایک سال بعد آمد ہوا ہی اُس وقت اوس کے غلاموں کو جو مسرت ہوئی ہے اور جس طرح اونھوں نے اپنی خوشی کا اظہار ولی نعمت سے کیا ہے، اوس فرط جوش و محبّت میں بھی اون کی غلامانہ حیثیت پوری طرح ملحوظ ہے ؎

چوں بدیدند روے منعم خویش ۔۔۔ در دویدند خواجہ را در پیش
ہر یک از بندگاں بہ آزادی ۔۔۔ گریہ میکرد لیکن از شادی
بندہ وارش بپا در افتادند ۔۔۔ بوسہ بر دست و پاش میدادند

جذبات عاشق و معشوق اور اُن کے لوازم | سرسری نگاہ میں عاشق کی

نیازمندی معشوق کی بے نیازی ایک معمولی مضمون ہے جسے ہر سخنور بیان کرتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ منزل عشق کی راہیں جس طرح عمل میں دشوار گزار ہیں اوسی طرح اون کا بیان بھی خاص اہمیت رکھتا ہے اس میں ایسے ایسے لطیف نکات ہیں جنھیں ہر ناظم کی قوت فکریہ پا نہیں سکتی ؎

ہزار آیت خوبی ست در مطالعۂ رو   نہ ہر کہ خط بشناسد مفسری داند

پہلی مثال۔ عاشق جب مژدۂ وصل پاتا ہے تو اس روح پرور خبر سے اوس پر ایک عالم وجد طاری ہو جاتا ہے لیکن اگر کسی عاشق کے لئے معشوق کا وصال بہت ہی دشوار ہو۔ کوشش وسعی کی راہیں مسدود ہوں۔ ہجوم یاس نے اوسے بالکل ہی وا رفتہ و از خود رفتہ کر دیا ہو اوس بیخودی کے عالم میں اوسے مژدۂ وصل پہونچے تو پھر اوس کے وجد و طرب کا ایک اور ہی عالم ہوگا۔ خسرو علیہ الرحمۃ بہشت پنجم میں اوس غریب الوطن شاہ زادے کا قصہ جو ملکہ ملتان کی سنگی تصویر دیکھہ کر دل ہاتھ سے دے چکا ہے وصل سے مایوس ہو کر پاگل ہو رہا ہے اوسکے پاس جس وقت مژدۂ وصل پہونچا ہے تو اوس کی کیا حالت ہوئی اوس کو بیان کرتے ہیں ؎

سوئے عاشق دویدیارے زود   بردش از دوست مژدۂ مقصود
چوں بگوش وے ایں سخن در شد   بے خبر بود بے خبر تر شد
ماند حیراں دراں حکایت نغز   جوشے از دل درا وفتاد بمغز

خاست چوں بیدلاں جاں داده　　دل دیوانہ را عناں داده
پاے کوباں بوجد و حال آمد　　در نہاں خانۂ وصال آمد

دوسری مثال بہشت ششم میں سوداگرزادہ جبکہ ایک طلسم سے نکل کر ایک طلسمی گاؤں میں پہونچا ہے اور وہاں ایک بوڑھی عورت نے اوسے مہمان بنایا ہے تو اوس پیرزن کی حسینہ وجمیلہ لڑکی سے مہمان کی آنکھ لڑتی ہے تیرعشق دل کے پار ہوجاتا ہے اور وہ محبوبہ اپنی اداے معشوقانہ سے اوسے بسمل بنا دیتی ہے

زال را بود دخترے عیّار　　دل فریبے چو صد ہزار نگار
دزد دلہا دو چشم پُرفن او　　خون صد بیگنہ بگردن او
گشت چوں یک دگر نظرہا گرم　　نازنیں سر فرو فگند ز شرم
روے پوشید و کرد آں سو پشت　　میہماں را بہ یک کرشمہ بکشت

معشوقہ کا سر جھکا لینا مُنہ کا چھپا لینا جہاں مقتضاے شرم وحیا ہے وہاں ایک ناز دلربایانہ بھی ہے لیکن شاعر کا کمال اس نکتہ کے ادا کرنے میں ہے جو اس جملہ میں مضمر ہے (کرد آں سو پشت) جس سے اس کا اظہار مقصود ہے کہ جس طرح میرا چہرہ روشن اور آنکھیں پُرفن ہیں پیٹھ بھی ویسی ہی محرابی ہے پیٹھ پھیرنے سے مقصود اظہار اون خوبیوں کا ہے جو پشت پھیرنے سے ہی نمایاں ہوتی ہیں۔

تیسری مثال۔ اسی بہشت ششم میں اوس موقع پر جبکہ سوداگرزادہ طلسمات طے کرتا ہوا آخر طلسم میں مبتلا ہوا ہے اوس وقت اوس کی حیثیت شاہانہ ہے ایک

ملک کا خود مختار بادشاہ ہے عجب عیش و عشرت سے ایام بسر ہو رہے ہیں خاص کر جب رات ہوتی ہے تو ایک گلبدن نازک اندام ایک گلدستہ پیش کرتی ہے اور تمام شب بادشاہ لذت و سرور میں بسر کرتا ہے آخر نوبت اوس معشوقہ کی پہونچتی ہے جس کا وصال طلسم کا خاتمہ ہے۔

یہ نازنین ایسی ماہ طلعت و پری پیکر ہے کہ سارے طلسمات میں ایسی دلکش صورت اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی بادشاہ بیتاب ہوکر اوس سے ہم آغوش ہوا چاہتا ہے وہ اوس وقت اپنی نزاکت جس پیرایہ میں بیان کرتی ہے اوس سے یہ نکتہ حل ہوتا ہے کہ حسن کی سرکار ایسا بلند پایہ رکھتی ہے جہاں شاہانہ جاہ و تجمل اور ملوکانہ آرایش بھی ہیچ ہے ملاحظہ ہو ؎

ترک جادوگر فریب انگیز　　گفت آبے بزن بر آتش تیز

گرد میدان بارگہ بر تست　　تن شاہانہ را بباید شست

تا نگردد چو گیرمت بکنار　　نازک اندام من ز گرد فگار

کہ مرا نام مردم دیدہ است　　گرد بر دیدہ ناپسندیدہ است

لیل و نہار

شاعر کا یہ بھی کمال ہے کہ اگر اوسے ایک ہی مضمون بار بار کہنا ہو تو ہر مرتبہ اوسے ایک جدید پہلو سے کہے مثلاً آفتاب کا طلوع وغروب جب عالم شاعری میں ہو تو ایک نئے انداز سے ہو اسی کے ساتھ استعارے ایسے ہوں جو اون واقعات سے جن کا تعلق اوس لیل و نہار سے ہے

مناسبت رکھتے ہوں اس کی مثالیں اس مثنوی میں بشیار موجود ہیں یہاں صرف چار شعروں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

صبح

(۱) بامداداں کہ صبح جامہ سفید — پردہ برداشت از رخ خورشید
(۲) گنبد آسماں چو شد بیدود — گشت روشن جہانِ زراندود
(۳) آسماں چوں زچشمۂ خورشید — کرد پیراہن زمانہ سفید
(۴) شاہ انجم برسمِ ہر روزہ — چوں برآمد بہ تخت فیروزہ

شب

(۱) شب چو دریائے چرخ برزد رنگ — چشمۂ مہر شد بکام نہنگ
(۲) چوں جہاں رخ نمود در پرِ زاغ — شد فلک پر زصد ہزار چراغ
(۳) در پرِ زاغ چوں نہاں شد مہر — پرِ طاؤس باز کرد سپہر
(۴) چرخ چوں زلف شب فگند بدوش — ماہ گشت از ستارہ زیور پوش

ہر شعر کا استعارہ کیا لطف پیدا کرتا ہے اوس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے اصل قصہ پڑھنا ضرور ہے یہ کل اشعار ہشت شششم سے لئے گئے ہیں ناظرین اگر چاہیں تو صرف ایک ہی قصہ پڑھ کر شاعر کی طبع روشن کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

وصل و وصال | بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا اظہار نہایت ہی مشکل ہوتا ہے کہیں آداب و تہذیب کا قانون زبان کی مقراض بننے کو

تیار ہوتا ہے اور کہیں حیا گلو گیر ہوتی ہے لیکن ایک قادر البیان چند الفاظ کے ایر پھیر میں سب کچھ اس صفائی سے کہہ جاتا ہے کہ مخاطب صحیح سمجھ جاتا ہے اور مقنن منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

خلوت کی باتیں عاشق جانے یا معشوق۔ زبان اوس کا افشا کیوں کر کرے لیکن جس کے قلم میں زور ہے وہ حسن بیان کا پردہ ڈال کر یوں کہتا ہے۔

پہلی مثال

خویش را کردہ بود لعبتِ سیم　　بمرادِ حریف خود تسلیم

او بدنداں عقیق رامی سُفت　　قدمی خست وانگبیں میرفت

زاں لب لعل می کشید شراب　　نقل ہم پستہ بود ہم عناب

دوسری مثال

در برآورد یار زیبا را　　کرد خوش جان ناشکیبا را

یافت آں آرزو کہ در سر داشت　　کام دل دید و کام دل برداشت

ہمہ شب بابتِ بہشتی خویش　　راند در جوئے شیر کشتی خویش

تیسری مثال

عاشقانہ بپائے یار فتاد　　کار با بوس و با کنار فتاد

اود رآویخت در دو زلف چو شست　　گردن خود بطوق مشکیں بست

روے بر رو نہاد دوش بدوش　　خرمنِ گل کشید در آغوش

بردغارت بدرج مروارید　　　　این ہمی چید او ہمی بارید

ایک ہی معنی کو گوناگوں رنگیں لباس اور نئے شان اور نئی ادا سے آراستہ کرنا خسرو کا حصہ ہے۔

جزئیات داستان نگاری

داستان نگاری کے ذیل میں بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ایسی آئی جاتی ہیں جن کا کوئی خاص مرتبہ تو نہیں ہوتا لیکن اون کا بیان اس کا ضرور مقتضی ہوتا ہے کہ اس انداز سے کہی جائیں کہ خالی از لطف نہوں۔ مثلاً باغ و راغ کوہ و صحرا یا معشوقوں کا سراپا وغیرہ اثنائے قصہ میں اگر ان کے بیان میں طوالت کی جای تو تسلسل میں خلل پڑتا ہے اور اگر انہیں معمولی الفاظ میں کہا جاے، تو لطف بیان جاتا ہے۔ بدیں وجہ ایک باکمال شاعر ہمیشہ ایسے مواقع پر پھولوں کا ایک چمن کھلاتا ہوا بلبلوں کے چہچہے سناتا ہوا کسی پری جمال کی ایک جھلک دکھاتا ہوا ناظرین کو اصل داستان کی طرف بڑھائے جاتا ہے خسرو علیہ الرحمۃ بھی اس مثنوی میں ایسے مقام کا کم سے کم ایک، اور زیادہ سے زیادہ تین شعروں میں حق ادا کرتے ہوئے داستان کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں ؎

وصف معشوقہ

رخ بزیبائی از گل افزوں داشت　　　　پاے تا سر لباس گلگوں داشت

سینہ دید آفتاب درفش　　　　شقہ بر تن از حریر بنفش

دید کامد میانۂ بازار　　شاہدے ہمچو صد ہزار نگار
زلفِ مرغول عنبر آلودہ　　ہندوآسا بگل برآمودہ
نرگسش از کرشمہ شور انگیز　　کشتہ عشاق را بغمزۂ تیز

باغ و صحرا

لالہ برکف گرفتہ جامِ شراب　　نرگس از مستی اوفتادہ بخواب
گشتہ باد از شگوفہ عنبر بوے　　سبزۂ نو دمیدہ برلبِ جوے
سو بسو از درخت میوہ قطار　　شاخ سر بر زمیں فتادہ زبار
دید در پیشِ غار صحرائے　　لالہ و گل دمیدہ ہر جائے
کشت در کشت روضۂ چو بہشت　　جوے بر جوے برکنارۂ کشت
بر سر سبزہائے مینا رنگ　　نائے کنجشک پُر ز نغمۂ چنگ

اسی طرح کی بہت سی جزئی باتیں ہیں جن کا احاطہ تمثیل و تحریر سے ناممکن ہے ایک وہ شخص جس نے داستان گوئی و داستان نویسی کے فلسفہ کو سمجھا ہے وہی خسرو علیہ الرحمۃ کی واقعہ نگاری کی داد دے سکتا ہے ہشت بہشت و ہفت پیکر کے قصص اگر اس نگاہ سے کوئی مطالعہ کرے تو اسے خسرو علیہ الرحمۃ

کی برتری صاف دکھائی دے گی۔

تشبیہ و استعارے

نظم ہو یا نثر، حالت فرحت و انبساط ہو یا رنج و اضمحلال تشبیہ و استعارے سے کلام بہت کم خالی ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات بیخواستہ جذبات کا اظہار تشبیہ و استعارے میں ہو جاتا ہے مثلاً حالت غم و اندوہ میں اظہار غمنا کی اس طرح کرتے ہیں کمر ٹوٹ گئی چھاتی پھٹ گئی دل خون ہو گیا۔ حالانکہ ایک غم زدہ مصیبت کا مارا تصنّع و تکلّف کر نہیں سکتا یہ تو جذبات کا زور ہے جو اس کے منہ سے کلمات استعارے میں نکل رہے ہیں۔ اب ایک ایسی چیز جو اس قدر عام ہو سلسلۂ نظم میں کس قدر ندرت و لطافت چاہے گی۔ شاعر کا اس صنف صنعت میں یہ کمال ہے کہ اوس کے استعارے و تشبیہ ایسی روانی و سلاست سے نظم ہوے ہوں جس میں تکلّف و تصنّع کا شائبہ تک نہو۔ ایسی جدّت و ندرت اوس تشبیہ و استعارے میں ہو کہ اوسے سنکر سامع میں شگفتگی پیدا ہو جاے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ اوس میں پیچیدگی نہو جدّت ہو زور ہو لیکن سامع کو سمجھنے میں تکلّف نہو۔

اب ہم جا بجا سے ایسے اشعار التقاط کر کے لکھتے ہیں جن کے طرز ادا اور حسن بیان میں ندرت تشبیہ یا جدّت استعارہ یا کوئی دوسری خوبی ایسی پائی جاتی ہے جو مثنوی کے لئے زیور ہے۔ ایسے اشعار کے مواقع سمجھنے کے لیے قصوں کو ضرور پڑھ جانا چاہیے۔ یہاں تو صرف کلام کی خوشنمائی و دل فریبی کا بیان مقصود ہے۔

بہشت سوم

زاں طلسمے کہ گرد مردِ دلیر مہ ز برشد عطارد آمد زیر

یہ وہ موقع ہے کہ حسن زر گر اپنی حکیمانہ چال سے اُس قید خانہ بلند سے رہائی پاتا ہے اور اس کی بی بی جس نے افشائے راز کیا تھا وہ اوپر پہنچکر قید ہو جاتی ہے۔ عطارد کی منزل چاند سے اوپر ہے۔ یہاں معاملہ برعکس ہو گیا۔ اس لیے خوبی مصرعہ ظاہر۔

بہشت چہارم

جانِ شیریں بداں شکر خا داد خضرے را دمِ مسیحا داد

بادشاہ ہرن کے کالبد کو چھوڑ کر طوطی کے قالب میں آیا ہے طوطی ہند کی شکر گفتاری مشہور ہے اس موقع پر اُس کو مسیحا دم بتانا اور رنگ سبز کی باعث خضر سے جنھیں حیات جاوید حاصل ہے تشبیہ دینا قابل لحاظ ہے۔

ایضاً

در زماں مرغ را بہ خنجر کشت کشتہ را بیں کہ باز دیگر کشت

وزیر نابکار کالبد شاہی کو چھوڑ کر مرغ کے مردہ جسم میں آیا ہے۔ لطیفہ یہ ہے کہ کوئی ایک بار

مرتا ہی یہ بدشعار دو زیر دو بار مرا - ایک تو جب اپنے قالب کو رہا کرکے قالب شاہی میں آیا - اور ایک جب مُرغ کے قالب میں آکر ذبح ہو گیا -

بہشت پنجم

بان نوشدن نشاط فرماید   خسپد و خیزد و فرود آید

جس طرح ایک موصوف کے لیے کئی صفات پے در پے ذکر کرنا صنعتِ تنسیق الصفات ہی اسی طرح چند افعال کا پے در پے ایک فاعل کے لیے بیان یہ بھی صنعت ہی -

بادشاہ کی بادہ پیمائی، معشوقہ دل نواز سے طرب انگیزی، خواب شیریں کا لطف اور سحر کے وقت بالاخانہ سے اتر کر باہر آنا یہ سب کس اختصار کے ساتھ ایک شعر میں آگیا ہی -

ایضاً

کردہ رہ تا بجا یگاہ رسید   زیر زیر زمیں بماہ رسید

جائے گاہ بمعنی منزل گاہ - زیرِ زمیں چل کر ماہ تک پہونچنے کا لطیفہ کیسا نادر ہی -

ایضاً

شاہ را کامد آں صنم در پیش   گم شد اوّل در و پس از خویش

بادشاہ ملکہ کو دیکھکر پہلے اس کے حسن و جمال سے متحیر و ششدر ہو جاتا ہی - پھر اس کی صورت بعینہ اپنی معشوقہ بادشاہ بیگم سے مشابہ پاکر دریائے حیرت میں غرق ہو جاتا ہی -

آگے یہ ماجرا کیا ہی - غیر کا مکان - غریب الوطن میزبان اُس کے گھر بادشاہ بیگم ساقی کی خدمت

کیونکر انجام دے سکتی ہی۔ اس جلسہ میں اُس کا آنا اور اس بے حجابی سے محفل میں حاضرین،
کو ادائے محبوبانہ سے والہ و شیدا بنانا کیونکر ممکن ہی ع

گم شد اوّل در دو پس اندر خویش

میں اختصار و وضاحت کو جس طرح جمع کیا ہی وہ قابل ہزار داد ہی۔

ہشت ششم

دید کامد بروں ز گوشۂ باغ — آفتابے بکف گرفتہ چراغ

مہ جبیناں ستارہ گرد و پیش — خود چو خورشید و شمع اندر پیش

یہ وہ سماں ہی کہ پریوں کی ملکہ پچھلی شب کو چراغ ہاتھ میں لیے باغ میں آتی ہی اور پریاں
تاروں کی طرح اس کو حلقہ کیے ہوئے ہیں۔ شاعرانہ انداز بیان کا لطف قابل دید ہی۔

ایضاً

شمع را پیش برد قبلۂ حور — او چو پروانہ در حوالی نور

یہ وہ موقع ہی کہ پریوں کی ملکہ کی کنیز سوداگر زادہ کو بلا کر لے جاتی ہی۔ خود شمع لیے
ہوئے آگے آگے جا رہی ہی اور سوداگر زادہ اُس کی روشنی میں پیچھے پیچھے جا رہا
ہی۔ پروانوں کا قاعدہ ہی کہ جہاں شمع ہوگی وہاں اُڑ کر آئینگے اور جمع ہونگے۔ اب
شمع کو جہاں لے جاؤ وہ اُس کے ساتھ ساتھ ہیں سوداگر زادہ جس لطف و کیف میں کہ
اُس کنیز کے پیچھے پیچھے جا رہا ہی الفاظ میں اُس کی بہتر تصویر کشی اس سے اور کیا زیادہ
ہو سکتی ہی۔

ایضاً

بر دغارت دُرجِ مروارید　　او ہمی چید ایں ہمی بارید

لطف بوسہ بازی کی یہ ایک اچھوتی تشبیہ ہے۔ جس انداز سے امیر صاحب نے اس مضمون کو بیان کیا ہے یہ اُنھیں کا حصّہ ہے۔ دوسرے کسی شاعر کے کلام میں اس لطف کے ساتھ یہ مضمون نہیں دیکھا گیا۔

ایضاً

صُبح چوں کرد جیبِ ظُلمت چاک　　سایۂ خاک رفت ہم در خاک

تاریکی شب زمین کا سایہ ہے۔ جب صُبح ہوتی ہے تو سایہ جہاں سے نکلا تھا اُسی جگہ پوشیدہ بھی ہو جاتا ہے۔ بیان کا یہ طرز اپنی جدّت میں کیا شان رکھتا ہے۔

بہشت ہفتم

مو پریشان و روخراشیدہ　　سمن از برگ گل تراشیدہ

ملکہ نے حنائی انگلیوں سے اپنے چہرہ کو جو نوچا ہے اُس کی کیسی پیاری تشبیہ ہے۔ پھر ایک ہی شعر میں الفاظ پریشان و خراشیدہ و تراشیدہ اظہار رنج و غم کے لیے کس قدر موزوں و جامع ہیں۔ اِس کتاب کی شعر و شاعری کے متعلق جن لطائف کا نمونہ پیش کرنا تھا جستہ جستہ اُن کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔

اب دوسری حیثیت سے اس کتاب پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ محاسن شعری کے علاوہ قصّوں کے ساتھ ساتھ کوئی سبق اخلاق کا بھی ملتا ہے

یا نہیں۔ ان داستانوں سے اصلاحِ نفس و حصولِ عزت بھی ممکن ہی یا نہیں۔ قصص کے ذیل میں تدبّر و تفکر کا نتیجہ اور اُس کی ترغیب پائی جاتی ہی یا نہیں۔ مصنف نے تصنیف کے وقت ان باتوں کا خیال رکھا تھا یا نہیں، ناقد کو اس سے کوئی بحث نہیں ہاں اگر مصنّف کا خیال بھی کسی طرح معلوم ہو جائے تو یہ ایک اضافہ اُس مصنّف کے کمال میں ہوگا۔ لیکن نقد کے لیے صاحبِ تصنیف کے خیال کی جستجو ایک عبث شئے ہی۔

الف لیلہ کب لکھی گئی اور آج یورپ اُس پر اپنے نوٹ چڑھاتا ہی جس سے تاریخی معلومات پیدا ہوتے ہیں حالانکہ لکھنے والے کا خیال بھی اس طرف نہیں گیا ہوگا کہ یہ داستان الف لیلہ کسی وقت اُن بیش بہا معلوماتِ تاریخی کا سُراغ بتائیگی۔ مصر کا تمدن بہت قدیم تھا۔ اُس وقت کی لکھی کوئی تاریخ ڈھونڈو تو نہ ملیگی۔ لیکن اُس کے کھنڈروں میں پھر پھرا کر اور قدیم آثار میں غور و فکر پیدا کر کے عہدِ قدیم مصر کی ایک تاریخ درست کر دی گئی جس پر بہت کچھ اعتماد کیا جا سکتا ہی۔ ایک سُراغ سے اتنے نہانی سراغوں کا پتہ لگا ہی کہ عقل متحیّر ہو جاتی ہی۔

انگریزی میں شیکسپیر کے ڈرامے مشہور ہیں۔ لیکن اب اُن ڈراموں کی شارحین نے وہ بال کی کھال کھینچی ہی اور نکات بیان کیے ہیں کہ شاید شیکسپیر کا وہم بھی وہاں تک نہ پہنچا ہوگا۔ غرض اس سے یہ ہی کہ ناقد کو یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ جس نکتہ کو وہ بیان کرنا چاہتا ہی مصنّف کا ذہن بھی اُس طرف منتقل ہوا تھا یا نہیں۔ اُس کو کامل اختیار حاصل ہی کہ مُفید یا غیر مفید جیسا کچھ بھی وہ نتیجہ حاصل کرے اُسے بیان کر دے۔ لیکن امیر علیہ الرحمۃ

میں یہ کمال ہی کہ جس طرح نظم کی قوت اُن میں وسیع ہی اسی طرح اخلاق کا دامن بھی اُن کا
طویل الذیل ہی۔ وہ صرف شاعری نہیں کرتے بلکہ امراضِ روحانی کے لیے تیر بہدف نسخے
لکھتے ہیں۔ ادویات کی تلخی کو قصص و حکایات کی شوخی و شاعرانہ تخیل سے خوش گوار
زود ہضم بناتے ہیں۔ اگرچہ اس کتاب میں قصے تو عیش و عیاشی کے ہیں لیکن ؎

ہر کہ افسانہ بخواند افسانہ است   ہر کہ دیدش نقد خود مردانہ است

اگر ذرا تعمقِ نگاہ سے کام لیا جائے تو بشیار فواید معاشرت و اخلاق اور تمدن وغیرہ کے
انھیں قصّوں سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً بہشت دوم میں جو قصہ ہی اُس میں شاہزادوں نے
جس طرح آثار و علامات کو دیکھکر حکم لگائے ہیں۔ اُسی سے معلوم ہوتا ہی کہ کائنات کا ہر ذرہ
گوناگوں علوم و معارف کا دفتر اپنی ذات میں پنہاں رکھتا ہی۔ صحیفہ عالم کے مطالعہ کرنے
والے انھیں پیش پا اُفتادہ چیزوں سے معلومات کے زر و جواہر رول لیتے ہیں۔
ایک غافل وہاں سے بے خبر گذر کر اُن بیش بہا جواہر سے محروم رہ جاتا ہی۔ کائنات
کی طرف امعان نظر سے دیکھنا اور اُس میں تفکر و تدبر پیدا کرنا بڑے بڑے نہانی اسرار
کا انکشاف کر سکتا ہی جو تزائد عقل، اصلاحِ نفس و ترقی تمدن کے باعث ہو سکتے ہیں انگریزی
میں اس طرح کے غور و فکر کو (Observation) آبزرویشن کہتے ہیں
فلسفہ طبیعات میں اس کی صد ہا تماشا ہیں۔ بہشت سوم میں حسن زرگر کے قصہ سے
یہ نصیحت حاصل ہوتی ہی کہ اپنے راز کی حفاظت ضروری امر ہی۔ خاص کر عورتوں سے
اس کا اظہار بسا اوقات خطرات سے دوچار کر دیتا ہی۔ طبقہ اناث کی خلقت کمزور ہی

اور عقل بھی ناقص۔ حسن زرگر نے اپنے راز کو بیوی سے ظاہر کر دیا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ نے ایک بہت ہی بلند منارہ پر اُس کو مقید کر دیا۔ اسی قصہ سے دوسری نصیحت یہ حاصل ہوتی ہے کہ مصیبت کے وقت اگر دامن صبر ہاتھوں سے نہ چھوٹے تو مخلصی آسان ہے۔ جیسا کہ حسنِ زرگر نے قید ہو کر اپنی عقل کو پراگندگی سے بچایا۔ اور پھر عقل سے کام لیکر اپنے آپ کو رہا اور مفتشیٔ راز کو قید کر دیا۔ یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اہلِ کمال اگر بخت و اتفاق سے مصائب میں مبتلا ہو جائیں۔ اور حسّاد و اعدا کا وار اُن پر چل بھی جائے پھر بھی کمال آخر میں اُنھیں مرتبۂ اعلیٰ تک پہنچا ہی دیتا ہے۔ جس طرح کہ حسن زرگر بادشاہ کی خدمت میں بلند منصب تک پہنچا۔ اس کی طرف امیر صاحب بھی اشارہ فرماتے ہیں؎

از خرد کارش آں روائی یافت — کز ملک شغل کدخدائی یافت

تا بدانی کہ ہر کرا خرد ست — آرزوہاش در کنار خود ست

اِن دو شعروں سے یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ خسرو کا مقصد قصہ خوانی نہیں ہے بلکہ تلقین و نصیحت کا یہ ایک پیرایہ ہے۔ ہاں یہ سوال ایک سطحی نظر کا شخص کر سکتا ہے کہ نصیحت کسی ایسے قصہ سے بھی بیان کی جاسکتی تھی جس میں اس طرح کے مضامین خلاف تقدس نہوتے۔ لیکن ارباب فن جو اپنے پہلو میں ایک دردمند دل رکھتے ہیں وہی خوب سمجھ سکتے ہیں کہ نصائح کے محتاج وہی بیچارے گنہگار ہیں جن کا حاسہ اخلاق اسقدر مردہ و بے حس ہو گیا ہے کہ نیکی و کمال کے محاسن سنکر اُن کے حاسہ اخلاق میں جنبش تک نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کے سمجھانے کا یہی طریقہ بہتر ہے کہ وہ جن معائب میں مبتلا ہوں

قصہ انھیں کے رنگ کا چھیڑا جائے۔ ہم مشربی و ہم رنگی اُن کی توجہ کو کامل طور سے مبذول رکھیگی۔ لیکن جب کہ آخر میں نتیجہ رسوا کن نکلیگا تو اُن کو یقیناً خود بخود یہ خیال پیدا ہوگا کہ جس طرح ہمارے ہم مشرب کو رسوا ہونا پڑا ہوسکتا ہے کہ ہمیں بھی رسوائی نصیب ہو۔ بہرحال اس بحث کا یہ محل نہیں۔ یہاں تو صرف اسقدر بیان کرنا ہے کہ خُذ مَا صَفَا دَعْ مَا کَدَرَ۔ ہزل بگزار جدا ز و بردار گو پیش نظر رکھکر اگر مطالعہ کیا جائے تو بہت کچھ زر و جواہر خرابہ سے بھی مل سکتے ہیں۔ کیسے مبارک نفوس تھے مسلین سلف کے جن کے ہزل میں بھی فوائد و منافع تھے۔

مقابلہ ہفت پیکر و ہشت بہشت

اس سے پیشتر کہ مقابلہ میں دونوں کا رنگ دکھایا جائے یہ کہدینا مناسب ہے کہ مقصود دونوں حضرات کے لطف کلام کا اظہار ہے نہ کسی کی پستی و بلندی دونوں کا کلام اپنے اپنے رنگ میں ارفع و اعلیٰ۔ پستی کا کسی جانب گزر کہاں۔ دونوں ہمارے ہر حیثیت سے پیشوا و مقتدا۔ ہاں جس کے کلام میں جو لطف و نزاکت کہ فقیر نے سمجھی ہے اُسے اپنی فہم کے مطابق اہل وطن کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اگر انھیں بھی پسند آئے تو

چشمِ ما روشن و رنہ دلِ ما شاد۔ یہ تو اپنا اپنا مذاق ہے اور اپنا اپنا معیار ہے ؎

نہ مرا نوش ز تحسین نہ مرا نیش ز طعن	نہ مرا گوش بہ مدحے نہ مرا ہوش ذمے
منم و کنج خمولی کہ نگنجد دروے	جز من و چند کتابے و دواتے و قلمے

حمد | حمد کا مضمون ایسا دلچسپ ترانہ اور دلکش نغمہ ہے کہ تمام عالم حیوان، نبات وجماد کی زبان قال وحال کا ساز اوس کے کیف ولطف سے ترنم ریز مستی وسرور ہی جس کی سبحہ گردانی کا اظہار خود محمود کے اس روح افزا صوت وصدا سے ہو رہا ہے کہ یسبح للہ ما فی السموات وما فی الارض مگر جس کو دیکھئے ایک نئی دھن سے گا رہا ہے اور جس پر نظر کیجئے ایک عجیب بیخودی کے جوش میں الاپ رہا ہی الحق ؎

اے ترا با ہر دلے رازے دگر   ہر گدا را بر درت نازے دگر

پھر انسان جس کی دستار فضیلت پر علمہ البیان کی کلغی سجائی گئی ہو اس کی شیوہ بیانی کا کیا پوچھنا۔ علی الخصوص رہروان سلوک ومعرفت تو کچھ ایسے دلکش ساز میں حمد کی صدا سنا جاتے ہیں کہ صدیوں بعد جب کبھی ان کے کلام کا اعادہ کیا جاتے تو ارباب ظاہر وغفلت شعار بنی آدم بھی تھوڑی دیر کے لئے وجد میں آکر بیخود ہو ہی جاتے ہیں۔ اس وقت حضرت نظامی وحضرت امیر خسرو (علیہما الرحمۃ) کی مثنوی ہفت پیکر وہشت بہشت سے چند اشعار لیکر پیش کرتا ہوں تاکہ یہ معلوم ہو کہ اوس قادر مطلق نے ان شیریں بیانوں کو کیسی قوت وقدرت عطا فرمائی تھی کہ باوجود امتداد دہر وتغیرات گوناگوں آج بھی ان کے کلام کی حلاوت اوسی طرح ذوق نواز ہے۔

حمد کے ارکان | حمد میں چند باتیں ہیں جنھیں ایک باکمال سخنور علی الترتیب بیان کیا کرتا ہے سب سے پہلے واجب الوجود وقدیم بالذات کا مسئلہ آتا ہی اس کے بعد

ربوبیت و تخلیق کا مضمون۔ پھر عبد و معبود کا علاقہ اور آخر میں نیاز مندی و مدعا طرازی
انھیں عناصر اربعہ سے ایک حمد کامل حمد کہی جاتی ہے جس کا طریقہ خود اوس جل مجدہٗ
نے سورۂ فاتحہ میں بتادیا ہے۔

اس وقت تفصیلی بحث تو ان دونوں باکمالوں کے مضمون حمد پر مقصود نہیں
لیکن جستہ جستہ بعض اشعار ہدیۂ ناظرین ہیں جس سے اقلیم سخن پر اُن دونوں سخنوروں
کے سلطنت کی نوعیت معلوم ہوگی۔

مسئلہ وجوب و قدم

خسرو	نظامی
اے کشایندۂ خزانۂ جود	اے جہاں دیدہ بود خویش از تو
نقش پیوند کارگاہ وجود	ہیچ بودے نبود پیش از تو
بودنی راہمیشہ بود از تو	آفرینندۂ خزانۂ جود
بودنابود را وجود از تو	مبدع و آفریدگار وجود

مولٰنا نے جس خوبی سے ذات عزاسمہٗ کا وجوب و قدم اور خالق جملہ کائنات
ہونا بیان فرمایا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ جس سادگی سے دلیل لائی گئی ہی اور ایک کے
تسلیم سے دوسرے کا لزوم جس خوبی سے پیدا کیا ہے اوس کے سامنے حکماء و متکلمین کے
دلائل ہیچ ہیں اوس پر بود و نبود اور جود و وجود میں صنعت تجنیس و اشتقاق صنائع
لفظی کی عمدہ مثال۔

لیکن اسی مضمون کو جس روانی و سلاست سے کہ خسرو کہتے ہیں اوس کی برتری و بلندی صاف عیاں ہے۔ پہلا شعر دوسرے شعر کا جواب ہی اور دوسرا شعر پہلے شعر کا نقش ثانی وہی الفاظ ہیں اور اوسی صنعت تجنیس و اشتقاق کے التزام کے ساتھ اوسی مضمون کی تکرار ہے مگر قابل لحاظ یہ امر ہے کہ چند نئے الفاظ کی نئی ترکیب نے اصل مضمون کو کس درجہ اوج کمال پر پہونچا دیا ہے۔ خاص کر دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ "بودنی را ہمیشہ بود از تو" جہاں ذات باریتعالیٰ کے خالق ہونے کا اقرار ہی وہاں مادیین کے ایک ملحدانہ مسئلہ کا جواب بھی ہے۔

یہ حق ناشناس فرقہ کہتا ہے کہ جس قدر اشیاء کا ظہور عالم میں ہو رہا ہے وہ تنوعات حرکت اور مادۂ قدیم کی جنبش کا نتیجہ ہے خسرو اس خیال باطل کا رد کرتے ہیں اور صحیح فلسفہ یوں بیان کرتے ہیں کہ ہر ایسی شئے جو ہست ہونے کی قابلیت رکھتی ہے وہ ہمیشہ ہر آن و ہر زمان تجھی سے خلعت وجود پہن رہی ہے تیرے سوا کوئی خالق کسی شئے کا ہو نہیں سکتا۔ اسی شعر کا دوسرا مصرعہ "بود نابود را وجود از تو" لطف صنعت تضاد کے ساتھ تمام ماسویٰ اللہ کے وجود امکانی کو جو نیستی سے فضائے ہستی میں آیا ہے جس طرح وجود واجب کی تجلّیات کا مظہر بتا رہا ہے وہ بھی قابل ہزار داد ہے۔ مولانا نظامی نے جس قدر مضمون کہ اپنے پہلے شعر کے دونوں مصرعوں میں کہا تھا اوس سے بہت زیادہ اس دوسرے شعر کے ایک مصرعہ میں موجود ہی۔

اب ایک نظر اس پر ڈالنی چاہیئے کہ خسرو نے ان خوبیوں کے علاوہ بندش

ؤ الفاظ میں کیا ترقی کی ہے مولانا نظامی نے خداوند کریم کو خزانہ جود کا آفرینندہ اور امیر خسرو نے خزانۂ جود کا کشایندہ قرار دیا ہے اس وقت فیصلہ طلب یہ امر ہے کہ خزانہ جود کے لئے اوس کو کشایندہ کہنا زیادہ فصیح اور بلاغت کا پہلو لئے ہوتے ہے یا آفرینندہ کہنا کوئی خاص لطف پیدا کرتا ہے ۔ہم امید کرتے ہیں کہ اہل مذاق صحیح خزانہ کے لئے فتح وکشود کو زیادہ مناسب سمجھیں۔

اسی طرح مولانا نظامی کے کلام میں مبدع کا لفظ جس کی تفسیر عطف تفسیری کے ساتھ لفظ آفریدگار نے کی ہے وہ لطف نہیں پیدا کرتا ہے جو امیر خسرو کے پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں صرف ایک لفظ نقش پیوند نے اپنی چست بندش سے ایک خاص خوبی پیدا کر دی ہے۔

قاعدہ ہے کہ جب کوئی مقلد کسی مضمون میں کسی موجد کی تقلید اس طرح کرے کہ وہ اوسی مضمون خاص کو اونھیں الفاظ میں ادا کرنا چاہے جس کو پیش رو نے اختیار کیا تھا تو اکثر دیکھا جاتا ہے کہ مقلد چاہے جس قدر کوشش کرے لیکن اوس اصل کے مقابل اہل معنی یہ ضرور امتیاز کر لیتے ہیں کہ وہ اصل ہے اور یہ نقل۔مگر خسرو میں یہ خاص کمال اور اہل فن ہونے کی دلیل ہے کہ وہ اپنے حسن کلام اور زور بیان میں مقلد نہیں سمجھے جا سکتے۔بلکہ ہر موقع پر یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ اپنی روش خاص میں اس بندش و ترکیب کے خود موجد ہیں۔

دوسری خصوصیت خسرو کی یہ ہے کہ جس مضمون کو مولانا نظامی نے انتہائے بلندی تک پہونچا دیا ہے اور اس میں کوئی پہلو کمال کا باقی نہیں رہا تو وہاں سے خسرو صاف آگے نکل جاتے ہیں اور اُسے ہاتھ تک نہیں لگاتے لیکن جہاں مضمون تشنہ ہی تو پھر وہاں یہ مینہ برسا دیتے ہیں خسرو کی یہ دونوں خصوصیتیں آپ کو جابجا ملینگی۔

وحدت الوجود

نظامی	خسرو
سازمند از تو گشت کار ہمہ	لائے توحید اژدہاست بپائے
اے ہمہ آفریدگار ہمہ	کہ خدایاں خورد بغیر خدائے
ہستی و نیست مثل و مانندت	اندر آں لائے معرفت پیشہ
عاقلاں جز چنیں ندانندت	لام الف گشت پائے اندیشہ
	ہست بی نیست آشکار و نہفت
	ہم تو بی لجز ترانشاید گفت

مولانا کے شعر میں ہست و نیست مثل و مانند میں جو لفظی تناسب ہے اس کا لطف ظاہر ہے لیکن عقلاء کے علم و عرفان کا (ہستی و نیست مثل و مانندت) میں انحصار جیسا کہ واقعہ ہے ویسا ہی دلکش طرز میں ادا بھی ہوا ہے مگر پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ وحدت الوجود کا ایک سرجوش جرعہ ہے جو ہزاروں خم کا نشہ رکھتا ہے

ایک ہی مصرعہ میں ایسے اہم مسئلہ کو اس صفائی و سادگی سے بیان کرجانا مولنا نظامی کا حصہ ہو گیا اس مسئلے کی تحقیق جسے حاصل ہو گی وہ (رائے ہمہ آفریدگار ہمہ) کی جب تکرار کرے گا ایک لطف تازہ پائیگا امیر خسرو نے بھی اس مسئلہ کو بیان کیا ہے لیکن آپ نے یہاں بھی وہی طرز اختیار کیا جس طرز کے وہ خود موجد و امام ہیں یہ طرز بیان کچھ اس مثنوی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ سرکار خسروی کی اقلیم سخن کا یہ بے بہا جواہر اکثر اصناف نظم میں درخشاں و تاباں ہے چنانچہ وہ معرکۃ الآرا قصیدہ مرأۃ الصفا جو خاقانیؒ کے جواب میں ہے اوس میں فرماتے ہیں ؎

زدریائے شہادت گر نہنگ لا برآرد سر تیمم واجب آید نوح را در عین طوفانش

اس شعر کی شرح میں مولنا جامی کا ایک رسالہ بھی ہے۔ مذکور الصدر اشعار مثنوی کو پڑھئے قطع نظر اس تجنیس و تناسب کے جو بہ پا اور پائے اندیشہ لا و لام الف میں ہے مقام نفی و اثبات کو کس عارفانہ و مجددانہ طرز سے بیان کیا ہے۔

کلمۂ توحید لا الٰہ الا اللہ کے جو رموز و دقائق ائمۂ تصوّف نے بیان کئے ہیں اُن میں یہ بھی بیان کیا ہے کہ توحید الوہیت عین وحدت الوجود ہے۔ افسوس کہ اوس شرح کی یہ تنقید متحمل نہیں ہو سکتی۔ بہر حال یہ اشعار وحدت الوجود کے لیے ایک بلاغت کے ساتھ گویا ایک حق نما آئینہ ہیں فہم من فہم۔

اب خسرو کا تیسرا شعر ملاحظہ ہو ؎

ہست و نیست آشکار و نہفت　　ہم توئی جز ترا نشاید گفت

یہ شعر دراصل مولنا کے دوسرے شعر کا لاجواب جواب ہے فن معقول میں واجب کی تعریف یہ ہے کہ جس کی ہستی ضروری اور نیستی محال ہست بے نیست اوسی کا ترجمہ ہے۔ ماسوی کا ترجمہ جز ترا واقع ہوا ہے اب شعر پھر پڑھو ہست و نیست آشکار و نہفت میں صنعت تقابل و تضاد کی خوبی عالم امکان کی بے ثباتی وجود واجب کا صورتاً و معناً ثبوت، ہوالاول والآخر والظاہر والباطن کی طرف رہبری ایک مضامین گوناگوں کا ہجوم اس شعر میں پاؤ گے۔

ربوبیت

خسرو	نظامی
شب فرستی و شب فروزی ہم	تو دہی صبح را شب افروزی
روزی آری فراخ روزی ہم	روز را نور و مرغ را روزی

مولنا کے یہاں روز و شب کا مقابلہ افروزی و روزی کا تناسب قابل تعریف مگر صبح و شب اور روز و نور کے سلسلے میں روزی مرغ کا ذکر کسی قدر اجنبی مرغ کی صبح سے مناسبت ظاہر لیکن روزی مرغ کی تخصیص ذرہ غریب۔

امیر خسرو کے شعر میں شب و روز کے تقابل اور فروز و روز کے تناسب کے ساتھ اصل مضمون ایک خاص خوبی سے ادا ہوا ہے جس طرح شب افروز ماہ ہے اوسی طرح فراخ روز آفتاب جس کا تقابل تناسب معنوی کا عمدہ پہلو ہے مگر بحالت یاے مجہول

آفتاب کو فراخ روز اور بحالت یاے معروف فراخ روزی کہنا اس ترکیب
میں دو معنی کا ایہام ہے جن میں ہر ایک بجاے خود لطف سے خالی نہیں اوّل
فراخ روز اُس شخص کو کہتے ہیں جو بخت و دولت میں اوروں سے زیادہ حصّہ
رکھتا ہو۔ اس اعتبار سے تمام کواکب کے مقابل آفتاب اس صفت میں مخصوص
ہے۔ دوم فراخ روز و فراخ روزی کی ترکیب لفظی دلالت کرتی ہے کہ جو شخص
روز یا روزی کا ذریعہ ہے وہ فراخ روز یا فراخ روزی سمجھا جائیگا ایسی حالتیں
جبکہ آفتاب ہر روز کی روشنی کا ذریعہ اور مربی نباتات ہے بہرنوع وہ فراخ روز یا
فراخ روزی ہوسکتا ہے۔

خسرو	نظامی
گر بجاں زندگی ست حیواں را	اے بتو زندہ ہر کرا جانیست
زندگانی تو مید ہی جاں را	وز تو نور تو ہر کرا نانیست
جاں کہ او را بہا نداند کس	بحیات ست زندہ موجودات
رایگانش دہی بمور و مگس	زندہ لیک از وجود تست حیات

مثنوی کی سلاست موجود رکھتے ہوے خدا کی رزاقی و حیات بخشی کو معمولی
طور پر بیان کیا ہے پہلے شعر میں اس کے سوا کوئی خاص خوبی نہیں ہے ہاں دوسرا
شعر مولنا کے کمال کا شاہد ہے اور آپ کی خلاقی مضمون کا نمونہ۔ لیکن خسرو کے
یہاں یہی مضمون ایسے طرز سے ادا ہوا ہے کہ اس میں جان پڑ گئی۔ زندگی و زندگانی

کا تناسب اور مور و مگس کا مقابلہ جان کے عزیز و بے بہا ہونے کو تیسرے مصرعہ میں ثابت کرتے ہوئے خزانہ کریم کی بے دریغ بخشش کو "رایگانش دہی" کے ساتھ بیان کرنا عجیب جاں نواز انداز ہے۔

خسروؒ کا پہلا شعر مولنا کے دوسرے شعر کا نقش ثانی ہے جس کے خط و خال زیادہ دلپذیر ہیں لیکن دوسرا شعر خاص خزانہ خسروی کا درشاہوار ہے۔

مدعا طرازی

نظامی	خسرو
چوں کہ بر درگہہ تو گشتم پیر	آمدم بر درِ تو بے خود وار
زانچہ ترسیدنی ست دستم گیر	باخودم دار و بیخودم مگذار
چہ سخن کیں سخن خطاست ہمہ	بکرم رخت خواجگیم بسوز
تو مرائی جہاں مراست ہمہ	بندہ ام خوانؒ بندگی آموز
منِ سرگشتہ راز کار جہاں	دُور کن باد خسروی زسرم
تو توانی رہاند باز رہاں	پُرکن از خاک بندگی بصرم

مولنا کے اشعار دعائیہ پڑھو۔ اُن سے یہ معلوم ہوگا کہ ایک وہ بندہ جسکی عمر آستانہ خالق پر بسر ہوئی ہے پیری کی حالت میں جب مقام خوف کی سیر کرتا ہے تو (زانچہ ترسیدنی ست دستم گیر) کی صدا بلند کرتا ہے پھر جب مقام رجا پر پہونچتا ہے اوس وقت (تو مرائی جہاں مراست ہمہ) کا جلوہ اوس کے پیش نظر

ہوتا ہے ان سب سے اوس بندے کی شکستگی وخاکساری اور توکل وقناعت کلی صاف ظاہر ہے لیکن یہی دعا جب خسرو کی زبان سے نکلتی ہے تو سوز و گداز سوختگی و برشتگی بیہوشی وخود فراموشی میں ڈوبی ہوئی نکلتی ہے پھر دعا کا خاتمہ جس مدعا پر کیا ہے وہ کمال بلندی حوصلہ سے مشعر ہے۔

بیخود و باخود خاک و باد کا تقابل و تناسب باد خسروی کا ایہام اور خواجہ و بندہ کا تلازم گویا صنایع لفظی و رعایات معنوی کا گنجینہ ہے اور نفس مضمون کو جس خوبی سے بیان کیا ہے اوس کا پورا لطف اہل معنی کو آسکتا ہے۔ خاص کر تیسرے شعر میں جس مدعا کی خواستگاری کی گئی ہے وہ تصوف وسلوک کے ایک بڑے مقام کی آرزو ہے بظاہر اس کے یہ معنی ہیں کہ کبر ونخوت کو میرے دماغ سے دور کردے اور نیازمندی و بندگی کی خاک سے میری نگاہ کو بھردے لیکن حقیقتاً غرض یہ ہے کہ خودی وہستی کے خیال کو میرے سر سے نکال تاکہ میں خود کو مٹا کر فضاے خدائی کی سیر کرسکوں جسے اصطلاح صوفیہ میں سیر فی اللہ کہتے ہیں اور میری آنکھوں کو جو لوازم بندہ وحادث کی دیکھنے والی ہیں اونھیں لوازم بندگی کی خاک سے پُر کردے تاکہ مجکو لوازم بندگی بالکل نظر نہ آئیں اور یہ قاعدہ ہے کہ جب خاک سے بصر پُر ہوجاتی ہے تو بینائی کچھہ کام نہیں دیتی ہے۔ حمد کے یہ چند اشعار جو ان دونوں باکمالوں کے پیش کیے گئے اُن میں اتحاد مضمون تھا جس سے یہ ظاہر کرنا تھا کہ ایک ہی مضمون ومفہوم کو ن کس نکتہ سنجی سے ادا کرتا ہے

اب چند اشعار بلا مقابلہ ایسے نقل کئے جاتے ہیں جن کا مضمون باہم متحد نہیں ہے

نظامی	خسرو
نام تو کابتدائے ہر نام ست	از تو خاکی خوش آتشی ناچیز
اوّل آغاز و آخر انجام ست	بولہب خوار و بوتراب عزیز
اوّل الاولی بسبق و شمار	ہر کرا شکر گوے خویش کنی
آخر الآخر بآخر کار	نعمتش را بشکر بیش کنی
ہر کسے نقشبند پردہ تست	وانکہ باشکر نبودش خویشی
ہمہ ہیچند کردہ کردہ تست	گوشمالی دہی بدرویشی
ہمہ را روے با خدا دیدم	
واں خدا بر ہمہ ترا دیدم	

مولانا نے دوسرے شعر میں ہوالاوّل وہوالآخر کے مضمون کو جس سہل ممتنع الفاظ میں فصاحت وسلاست کے ساتھ بیان کیا ہے اوس کی خوبی ذوق سلیم چاہتی ہے اسی طرح دیگر اشعار بھی اپنی اپنی روش میں ایک خاص معنی رکھتے ہیں۔

خسرو کے یہاں بھی پہلے شعر میں لف ونشر مرتب اور خاک و آتش خوار و عزیز کے تقابل کے سوا جو معنوی تناسب بولہب و بوتراب میں ہے اوس کی خوبی بیان نہیں ہوسکتی پھر خاک کی خوشی اور آگ کی ذلت پر بوتراب کی عزت اور بولہب کی ذلت کو شاہد بنانا ایسی حسن التعلیل ہے کہ اوس کا اظہار غیر ممکن ہے۔

نعت شریف

حمد کے بعد نعت کا مضمون گویا لازم و ملزوم کے مثل ہے ایک نکتہ داں شاعر
نعت میں ایسے مضامین رنگینی کے ساتھ بیان کرتا ہے جن سے خاتم النبیین صلی اللہ
علیہ وسلم کی محبوبیت آپ کی شان کی عظمت و جلالت ظاہر ہوتی ہے نیز وہ کمالات
جو پیغمبر روحی فداہ کے ساتھ مخصوص ہیں اوس کا بیان بھی جذب قلوب کے لئے نعت
کا ایک عنصر قوی ہے۔ اگر مضامین نعتیہ کی تحلیل کی جاے تو حسب ذیل اجزا اُس
کے قرار پائیں گے۔

(۱) مرتبہ ایجاد میں ذات مقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل و اوّل ہونا۔
(۲) رسالت و نبوت کا ذات اقدس پر خاتمہ۔
(۳) آپ کی رسالت کا عامہ و تامہ ہونا۔
(۴) آپ کی شریعت کا تمام شعبہاے حیات انسانی کے لیۓ ایک کامل دستور العمل ہونا۔
(۵) آپ کے اخلاق مثل شفقت، رحم، عطا، سخا، شجاعت، ہمت وغیرہ وغیرہ اور
معجزات۔ انہیں مضامین سے رنگیں بیان شاعر نعت کا ایک روح پرور گلدستہ تیار کرتا ہے۔
اِس مختصر تمہید کو یاد رکھتے ہوئے بلبلان گلزار مدینہ کی نغمہ سرائی سننا چاہیے۔

نظامی	خسرو
نقطۂ خطّ اوّلیں پرکار	روشنائی دہ چراغ یقیں
خاتم کار آفرینش کار	نور پیشین و شمع باز پسیں

نظامی	خسرو
نو بر باغ ہفت چرخ کہن	نور او کز سپہر صد چندست
دُرۃ التاج عقل و تاج سخن	مہ شگاف و سپہر پیوندست
	انبیا پیش آں خجستہ چراغ
	طفل گہوارہ در مقام بلاغ

مولانا نے اوّل ما خلق اللہ نوری اور خاتم النبیین کے مضمون کو نہایت پسندیدہ طور پر بیان کیا ہے اوّل و آخر کا مقابلہ نقطہ و خط کا تناسب نو و ہفت میں ساقۃ الاعداد کا التزام جیسا کہ قادر البیانی کا مولنا کے ثبوت ہے ویسا ہی عقل و تاج سخن کا درۃ التاج کہنا ایک نکتۂ جاں نواز ہے۔

یہی مضامین اشعار خسرو میں ہیں یہاں مقصود کا بیان بدلالت التزامی ہے جس کا لطف ظاہر ہے پیشین و پسیں شگاف و پیوند کا تقابل روشنائی چراغ، نور و ماہ و سپہر کا تناسب مہ شگاف و سپہر پیوند کی تلمیح ایسے صنایع ہیں کہ شعرا کو جن کی بندش میں طرح طرح کی دشواریاں واقع ہوتی ہیں اور یہاں بے تکلف زبان قلم سے نکلا پڑتا ہے ان محاسن کے علاوہ مولنا کے مطلع کا پورا مضمون ایک خاص بلاغت کے ساتھ امیر خسرو کے یہاں صرف ایک مصرعہ میں ادا ہو جاتا ہے نور پیشین و شمع باز پسیں پھر یہ کیسی بلیغ نعت ہے اور الخلق کلھم من نوری و سراجاً منیرا کی کیسی معنی خیز تفسیر بیشک اسی ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کی تجلیاں ہیں جو انبیاے سابقین کی معصوم و مقدس حیات اور اُن کے

چشمۂ تبلیغ کی روانی و شیرینی ہمیں محسوس ہو رہی ہے اور بیشک یہ واقعہ ہے کہ ایک شمع سے ہزاروں شمعیں جگمگا اُٹھتی ہیں۔ پس وہ شمع جسے اُس حیّ و قیّوم نے عرب کے دو سوکھے پہاڑوں میں روشن کیا اُس سے بیشمار شمعیں روشن ہوئیں اور ہوتی رہیں گی ؎

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں ہر کجا مے نگری انجمنے ساختہ اند

پھر مہ شگاف کے لفظ میں معجزہ شق القمر اور سپہر پیوند میں آسمان کے خرق و التیام کی تلمیحیں حسنِ بیان کا نمک ہیں۔ تیسرے شعر کی چستی اور الفاظ کا باہم دست و گریباں ہونا ایسی وجدانی کیفیت ہے کہ اُس کا لطف بیان میں نہیں آسکتا۔ مضمون اس شعر کا ایسا بلیغ ہے جس پر صد آفرین و مرحبا۔ دیکھو تمام انبیا علیہم السّلام کی تبلیغ ایک خاص قوم تک محدود تھی اور اُن کی شریعت ایک خاص دور ایّام کی مصلح۔ ان انبیا علیہم السّلام کا کیا ذکر جن کی تبلیغ و تعلیم سے اُمّت محروم رہی اور اُنھیں اپنی اُمّت ہی کے ہاتھوں جامِ شہادت پینا پڑا۔ اُن اولوالعزم انبیا علیہم السّلام کو دیکھو جن کی دعوت تبلیغ کو لبیک کہا گیا کہ افرادِ اُمّت میں سے کسقدر اُن کے متبع ہوئے اور متبعین پر کہاں تک اُس تعلیم کا اثر تھا۔ بنی اسرائیل کا موسیٰ سے یہ کہنا کہ یا موسیٰ اجعل لنا الٰہاً کما لھم آلھۃ۔ (یعنی اے موسیٰ ہمارے لیے بھی تو ایک ویسا ہی معبود تیار کر جیسا کہ اُن لوگوں کا معبود ہے) اور عیسائیوں کی تثلیث کیا ظاہر کرتی ہے۔

نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں جل مجدہ نے خاتم النبیین، کافۃ للناس، رحمۃ للعالمین فرما کر آپ کے دامنِ رسالت کو ایسا وسیع فرما دیا کہ تمام عالم علوی و

سفلی اوس کے سایۂ رحمت میں تا یوم محشر آ گئے دعوت تبلیغ و تاثیر توحید کا نقش دیکھنا ہو تو مہاجرین و انصار کا تصوّر کر لو۔ آغاز اسلام میں کیا کچھہ مصائب ان نفوس قدسیہ پر نہ گذر گئے مگر توحید سے ذرہ برابر جنبش نہ ہوئی آج بھی کلمۂ شہادت کا اقرار خالص توحید کا ثبوت دے رہا ہے اس شعر کو اب پھر پڑھو ؎

انبیا پیش آں خجستہ چراغ　　طفل گہوارہ در مقام بلاغ

رسالت ختم المرسلین کے کیسے دقیق نکتوں کی طرف اشارہ ہے فتدبروا یا اولی الابصار

خسرو	نظامی
خاتم چرخ زادہ زانگشتش	اولیں گل کہ آدمش بفشرد
پدر او چکیدہ از پشتش	صاف او بود دیگراں ہمہ دُرد
اوست جانے کہ قالبش بریقیں	وآخریں دور کاسماں راند
جان روح اللہ ست و روح امیں	خطبۂ خاتمیت او خواند
	ایں جسد را حیات ازاں جان ست
	ہمہ تختند و او سلیمان ست

مولانا کے اشعار میں اول و آخر صاف و درد جسد و جان کا تقابل اور خاتم و سلیمان و تخت کا تناسب لفظی و معنوی نہایت ہی پسندیدہ ہے۔ وجود باجود کو اصل الاصول اور بدایت و نہایت کا ذات اقدس سے تعلق ثابت کرنے کے لئے جو الفاظ جمع کئے ہیں ہر ایک اون میں سے ایک در خوش آب (ہمہ تختند و او سلیمان ست) ہیں

ایک نئی ترکیب سے سلطان کونین کی حکمرانی ظاہر و باطن کا اظہار۔

مگر خسرو نے اس موقع پر نازک خیالی اور مضمون آفرینی کی جدّت کو اوج کمال پر پہونچا دیا ہے دونوں کے پہلے شعر کو پڑھو ذات گرامی روحی فداہ کے اصل ہونے کو جس طرح خسرو نے بیان کیا ہے اوسکی بلندی علانیہ پاؤ گے۔ کنت نبیا و آدم بین الماء والطین۔ انا من نور اللہ والخلق کلہم من نوری کی تلمیح کیسی لطیف ہے حضرت عیسیٰ جن کا لقب روح اللہ اور حضرت جبرئیل جن کا لقب روح الامین ہے اون کی جانوں کو جان نازنین کا قالب قرار دینا اشعار نعتیہ کی روح ہے۔

نظامی	خسرو
امّی و امہات را مایہ	امّی و حرف سنج تخت کن
عرش سایہ است عرش را سایہ	قلمش راست کار و راست سخن
پنج نوبت زن شریعت پاک	کاف و نون یک قلم ز نامۂ او
چار بالش نہ ولایت خاک	لوح محفوظ زیر جامۂ او
ہمہ ہستی طفیل او مقصود	بہترین نقطۂ رسل بشمار
او محمد رسالتش محمود	آسماں دائرہ است و او پرکار

مولانا کے اشعار میں امّی و امہات محمد و محمود کا اشتقاق پنج نو اور چار میں سیاقۃ الاعداد مثنوی کا زیور ہے۔ لیکن آپ کے اُمّی ہونے پر آپ کو مایۂ اُمہات جو کہا ہے ایسی عجیب و غریب نعت ہے کہ مولانا غالباً اُس کے موجد ہیں۔ فقیر کے علم میں

کسی دوسرے شاعر نے اس لفظ کو اس طریق سے نہیں باندھا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ علم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح ان دونوں فدائیان رسول نے نظم میں بیان کیا ہے نثر میں ایسی تصویر کشی کی جائے کہ تمام خط و خال اُس کے واضح ہو جائیں لیکن مدعی متعصب کا خیال قلم روکتا ہے اس لئے صرف ایک اشارہ کرتا ہوں کہ اصطلاح شعرا لفظ امہات میں ارباب فلاسفہ سے الگ ہے حکما کی اصطلاح میں امہات سے مراد اربعہ عناصر ہوتے ہیں لیکن شعرا کے نزدیک کبھی اس کا اطلاق عالم علوی و عالم سفلی پر ہوتا ہے اور کبھی امہات سے امہات اسماء مراد ہوتے ہیں جو موافق مذہب صوفیہ الاوّل والآخر والظاہر والباطن یہ چار اسماء الٰہیہ ہیں ان لطیف اشارات کا لحاظ رکھتے ہوئے شعر پڑھیے اور ہزاروں داد دیجئے۔

خسرو بھی علم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرماتے ہیں۔ امّی ہونے پر عالم ماکان و مایکون ہونا لوح محفوظ کا آپ کے زیر خامہ ہونا بہترین نعت ہے اس پر لوح و حرف تختہ و قلم کاف و نون نقطہ و دائرہ و پرکار کا تناسب نہ پنچ میں سیاقۃ الاعداد ان صنائع نے مثنوی کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے لیکن مایہ امہات جو تاثیر بے اختیار پیدا کرتا ہے وہ لطف کہاں۔

نظامی	خسرو
شاہ پیغمبراں بہ تیغ و بہ تاج	ختم پیغمبران یار خدائے
تیغ او شرع و تاج او معراج	گمرہاں را بصدق راہ نمائے

خسرو	نظامی
منکر شرع را ز اصل و فرع	امر و نہیش براستی موصوف
سر زدہ ہم بتازیانۂ شرع	نہی او منکر امر او معروف
بہدایت دلیل بے دیناں	ہر کہ برخاست میفگندش پست
بشفاعت پناہ مسکیناں	وانکہ او فتاد میگرفتش دست
چون بحجّت زہر دعوی خاست	تیغ ازیں سو بقہر خوں ریزی
حجّت او را درست دعوی راست	رفق ازاں سو بمرہم آمیزی
درجہاں گیری از زبر تا زیر	مرہمش جاں نواز تنگ دلاں
ہم زبانش درست و ہم شمشیر	آہنش بند سای سنگ دلاں

سیاست نبوی کا سیاست سلطانی سے جس خوش اسلوبی سے فرق بتایا ہے وہ قابل لحاظ ہے جس نے غزوات کا کچھ بھی مطالعہ کیا ہوگا اس مقام کا لطف اوسے آئیگا ستم شعاروں کی سرکوبی کے ساتھ مجروح دلوں پر رحمت وشفقت کا کیسا پھایا رکھا ہے۔ ان باکمالوں نے حمد ونعت میں مسائل صحیحہ کی ایسی تعلیم فرمائی ہے کہ اگر صحیح مذاق سے ان کی کتابیں پڑھی جائیں تو بہت کچھ عقل کی روشن کرنے والی باتیں معلوم ہوں باعتبار مضمون ومفہوم دونوں حضرات کے اشعار یکساں ہیں لیکن شاہ پیغمبراں میں وہ قوت نہیں جو ختم پیغمبراں میں ہے۔ اسی طرح خسرو کے اس مصرعہ میں کہ "بشفاعت پناہ مسکیناں" جو شان رافت و رحمت عیاں ہے وہ "مرہمش جاں نواز تنگ دلاں" سے زیادہ ہے۔

نعت میں بھی تقریباً وہ اشعار لکھ دیے گئے جن کے مضمون باہم مشترک تھے
اب خسرو اقلیم سخن کے اوس نعتیہ مضمون کو دیکھو جس کے یہ خود موجد ہیں اور تمام
متاخرین اسی چمن ہمیشہ بہار کے گلچین ہیں۔

میم احمد کہ در احد غرق ست — کمر خدمت از پئے فرق ست
احمد اندر احد کمر بند ست — یعنی ایں بندہ آں خداوند ست

احد و احمد کی تجنیس زائد بندہ و خداوند کا تقابل این و آں اور کمر و کمر بند کا
تناسب گویا انکار وزمرہ ہے لیکن دوسرے مصرعہ کے پئے و فرق کے الفاظ صنعت
تقابل کے ساتھ ممکن کو واجب سے حادث کو قدیم سے عبد کو معبود سے جس طرح
ممتاز کر رہے ہیں اوس کی داد دی نہیں جاسکتی۔

قران کریم نے جہاں کہیں مراتب مخصوصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان
فرمائے ہیں وہاں ذات اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو لفظ عبد سے یاد فرمایا ہے مثلاً معراج
کا جہاں بیان ہے وہاں یوں ارشاد ہے سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام
اسی طرح انتہائے مقام قرب و اختصاص کو یوں فرمایا ہے فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ۔
اس نکتہ کو ملحوظ رکھ کر اس بیان کی داد دیجئے کہ احمد کا میم جو احد کے وسط میں
ہونے کی وجہ سے گویا احد میں فنا ہو گیا ہے فی الحقیقت وہ میم احد و احمد خداوند و بندہ
کے فرق و امتیاز کے لئے خدمت و عبادت کا پٹکہ ہے تاکہ خلق جان لے کہ احمد بندہ
اور احد خداوند ہے اور احمد ہر وقت بندگیِ خداوند میں کمر بستہ و مستعد ہے۔

منقبت

جس طرح حمد کے بعد نعت کا مضمون لازم ہے اسی طرح مضامین نعتیہ کا ایک قوی عنصر خلفاے اربعہ و دیگر اصحاب کرام کی منقبت ہے کوئی نعت اصحاب کی مدح سے خالی نہیں ہوتی مولنا نظامی نے چار یار با صفا کی منقبت صرف ایک شعر میں مجملاً بیان فرمائی ہے ؎

چار یارش گزیں با صل و بفرع	چار دیوار گنج خانۂ شرع

لیکن خسرو علیہ الرحمۃ نے یہاں بھی حسن بیان و زور کلام کا دریا بہا دیا ہی ملاحظہ ہو ؎

چار یارش بچار سوے زمیں	چار رکن و چہار صفۂ دیں
اوّل آں اولین خلیفۂ کار	ثانی اثنین اذ ہما فی الغار
دوم آن کز شکوہ پایۂ او	دیو بگریختہ ز سایۂ او
سوم آں جامہ جریدۂ پاک	چاشنی گیر خوان ارسلناک
چارم آں قصر وحی را دہلیز	در علم و کلید خیبر نیز
آنکہ پا کند و پاک کیشانند	رضی اللہ عنہم ایشانند

مذکورہ اشعار میں صنایع لفظی و معنوی تناسب و تقابل سیاقۃ الاعداد و تلمیحات عجیبہ جس قدر موجود ہیں اون کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ہاں دوسرا شعر جو خلیفۂ اوّل کی مدح میں لکھا ہی وہ خسرو کا حصّہ ہو گیا منقبت میں پوری آیۂ کریمہ ثانی اثنین اذ ہما فی الغار کو بحر مثنوی میں موزوں کر کے تلاوت کرنا دراصل اس مدح کی کرامت اور ہمہ،

فیاض کے فیض خاص کا اثر ہے اوّل کو ثانی قرار دیکر لاثانی ثابت کرنا خسروِ اقلیمِ سخن کا وہ انداز بیان ہے جس میں غیر کی شرکت پائی نہیں جاتی۔ علیٰ ہذا خلیفہ چہارم حضرت مولیٰ علی کی منقبت میں قصر و دہلیز و در کا تناسب اور آپ کو درِ علم و کلید خیبر کہنا ایک بے مثل بیان ہے آپ کے عقد میں جگر پارۂ نبوی بضعۃ منّی حضرت سیدۃ النسا فاطمۂ زہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں اور حضرت مولیٰ حضورِ اقدس کے ساتھ اخوت کی قرابت بھی رکھتے تھے اسلئے آپ کو وحی الٰہی کے محل عرش منزل کا صحن خانہ کہنا اور انا مدینۃ العلم و علی بابہا کے اعتبار سے درِ علم قرار دینا ایسا ہی بیان واقعہ ہونے پر روحانی لطیفہ ہے جس طرح خیبر کشائی کی صفت کو کلید خیبر کے استعارہ سے ظاہر کرنا ایک رنگین دقیقہ ہے۔

اہل معانی کے نزدیک کسی آیۃ یا حدیث یا دعا کے پورے جملے کو بے تبدل و تغیر کسی شعر میں موزوں کر دینا شاعر کا کمال سخن سمجھا جاتا ہے اس کمال کی بہترین مثال یہاں دوسرے شعر کے دوسرے مصرعہ اور آخر شعر کے آخر مصرعہ میں موجود ہے۔

معراج

معراج کا مضمون فی الحقیقت نعت اقدس کا ایک جز ہے لیکن شعرا نے اسے ایک مضمون مستقل قرار دیکر علیحدہ عنوان سے بیان کیا ہے اس میں حسب ذیل مقاموں کے بیان سے داد نازک خیالی و سخن آفرینی دیجاتی ہے (۱) شب معراج کی تعریف (۲) جبریل علیہ السلام کی تشریف آوری اور اُن کی گذارش (۳) وصف براق (۴) مقامات سیر منازل سیّارگان (۵) سیر عرش (۶) مقام قاب قوسین (۷) لامکان (۸) وصل و وصال و تکمیل و کمال (۹) رجوع بعالم صورت

باہزاراں دولت (۱۰) و قف دولت معراج برامت گنہگار۔

معراج کا عنوان قایم کرتے ہوئے دونوں حضرات کی شاعرانہ قوت نے جو عروج اختیار کیا ہے اوس بلند خیالی تک تو اس بینوا کی فہم پہونچنے سے قاصر ہے۔ بادۂ توحید مئے عرفان کا وہ جوش ہے کہ اوبلی پڑتی ہے منسلک نظم میں الفاظ کے موتی نہیں ہیں بلکہ حقایق و معارف کے خم کے خم ہیں زہے قسمت اگر اُس کا ایک جام روحانی کسی کو نصیب ہو جاے ارباب فہم و ذکا اگر صحیح مذاق کے ساتھ دونوں حضرات کے پورے کلام کا مطالعہ کریں تو لطف بیان سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں۔

فن شاعری میں یہ بھی ایک خاص صنعت ہے کہ کسی مضمون کا اختتام اس طرح ہو کہ آیندہ مضمون کا اوس سے اظہار ہو جاے اور ماسبق کی انتہائی کڑی مالحق کے ابتدا سے ملکر سلسلۂ کلام کو مسلسل کر دے قصیدے میں اسی صنعت کو گریز کہتے ہیں اس صنعت کا لحاظ رکھتے ہوے مولنا نظامی نعت شریف کا خاتمہ اس شعر پر فرماتے ہیں ؎

چوں نگنجید در جہاں تاجش ۔۔۔ بخت بر عرش کرد معراجش

اسکے بعد جبریل آمیں کی تشریف آوری اور اُن کی گذارش بیان کرتے ہوے اُس رات کی تعریف صرف ایک شعر میں تمام کر دیتے ہیں ؎

شب شب قدر وقت وقت دعاست ۔۔۔ یافت خواہی ہر انچہ خواہی خواست

خسرو علیہ الرحمۃ نعت گرامی اس شعر پر ختم کرتے ہوئے کہ ؎

گر بود ہر دم آسماں را تاج ۔۔۔ جز محمدؐ کراست ایں معراج

شب معراج کے وصف میں فرماتے ہیں ؎

فرخ آں شب کہ آں چراغ دو کون | زد بقندیل عرش پرتو عون
شب چو بر سر نہاد چتر سیاہ | چتر اسریٰ کشید بر سر ماہ
جلوہ گر شد بہ لاجوردی سریر | دولتش زیں سرائے دامنگیر
شب او گشتہ زیور ماہش | نور او گشتہ مشعل راہش
در دل شب ز پرتو آں نور | حرف باریک غیب خواندہ زدور

شب۔ چراغ۔ قندیل۔ نور مشعل و پرتو کا تناسب۔ چتر اسریٰ کا ایہام و تلمیح گویا عارض نظم کے رخ افروز خط و خال ہیں بظاہر اشعار کا یہ مفہوم متبادر ہوتا ہے کہ رات کی سیاہی اور چاند کے سریع السیر ہونے کا بیان ہے (اصطلاح عرب میں سرے و اسریٰ رات کے سفر کرنے کو کہتے ہیں) لیکن حقیقتاً چوتھے شعر میں شب، ماہ و نور کا جو استعارہ ہے اُس کے لحاظ سے بطریق ایہام اشعار کے معنی یہ ہوے کہ جب شب کی تاریکی عالم پر چھا گئی اور ماہ فلک تیزروی سے قطع منازل کر کے روپوش ہو گیا اس وقت ماہ دنیٰ فتدلیٰ نے سر پر تاج سبحان الذی اسریٰ بعبدہ کا رکھ کر عالم بالا کا سفر شروع کیا اور آپ کی شاہد دولت یعنی ذات اقدس جس وقت آسمان کے تخت لاجوردی پر جلوہ آرا ہوئی تو اوس وقت گیسوے عنبریں جو واللیل اذا سجیٰ کے مظہر تھے ماہ رخسار پر جو والشمس والضحیٰ کا پرتو ہیں تجلّی آرا ہوے۔ آپ کے پرتو انوار سے وہ شب سیاہ اس قدر منور و تاباں ہو گئی کہ غیب کے اسرار خفیہ بھی دور سے پڑھے جاتے تھے۔ ان

اشعار میں جن کمالات محمدیہ کی طرف اشارہ ہی اوسے فطرت سلیم ہی سمجھہ سکتی ہی۔
مولانا نظامی علیہ الرحمۃ نے جبریل امین کی گذارش چند اشعار میں بیان کی ہے
اور رات کے متعلق صرف ایک شعر پر ختم کر دیا ہی۔ خسرو علیہ الرحمۃ نے جبریل کی گذارش
میں صرف ایک شعر پر اکتفا کیا ہی اور رات کے متعلق چند اشعار لکھے ہیں۔ اس کی کوئی
خاص وجہ نہیں کہی جا سکتی۔ بہر حال جبریل علیہ السلام کی تشریف آوری یا براق کی صفت
یا منازل سیّارگان میں جو شاعرانہ قوت کا اظہار کیا گیا ہی اوسے ترک کرتا ہوں اور
صرف اون مقامات پر جہاں زور طبیعت کا اصلی جوہر کھلتا ہی اکتفا کرتا ہوں۔

سیر عرش

خسرو	نظامی
عرش بر داز جنیبہ بارش را	قطرہ قطرہ ازاں محیط گذشت
پاے گم شد جنیبہ دارش را	قطرہ بر قطرہ ہر چہ دید نوشت
رویش افگند زآفتاب حضور	چوں درآمد بساق عرش فراز
بر قنادیل عرش پرتو نور	نردباں ساخت از کمند نیاز

سیر عرش اگرچہ دونوں حضرات نے ایک نئے انداز سے شروع کی ہی اور ہر ایک
اپنے اپنے انداز میں کامل ہی لیکن مولانا کا اوّل شعر اوس کمال کا نمونہ ہی جس میں کسی
غیر کی شرکت ممتنع تسلیم کی گئی ہی۔ ہاں خسرو کے دوسرے شعر میں البتہ مولانا کے دوسرے
شعر سے ترقی نمایاں ہی لیکن مولانا کے پہلے شعر کا سرور ایسا غالب ہی کہ اوس کی لذت

کسی دوسری طرف متوجہ نہیں ہونے دیتی صاحب معراج صلی اللہ علیہ وسلم کا تمام افلاک سے ایک چشم زدن میں گذر جانا اور پھر ہر ایک کا تفصیلی ملاحظہ کس بلاغت وسلاست سے بیان ہوا ہی سبحان اللہ۔

اصطلاح میں قطرہ قطرہ اور ذرہ ذرہ کسی کام کا کرنا اوس وقت کہا جاتا ہی جبکہ اوسے بالاستیعاب اس طرح انجام دیا جاے کہ ذرہ برابر بھی اوس کے تکملہ سے رہ نہ جاے اور قطرہ بر قطرہ کی اصطلاح نہایت ہی تیزروی و تیزدوی کے معنون میں مستعمل ہے اب شعر پڑھئے پہلا مصرعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مقام سیر میں کیا فلک اور کیا سیّارہ اوس سے اس طرح گذرے کہ ایک ذرہ برابر بھی ملاحظہ سے نہ چھوٹا اور دوسرا مصرعہ اوس تیزروی کو بتاتا ہی جس سرعت سے یہ مقامات طے کئے گئے کسی محیط سے قطرہ قطرہ گذرنا اور اوس کے ہر حصّہ کو قطرہ بر قطرہ طے کرنا کیسا بلیغ استعارہ ہی

مقام قاب قوسین

خسرو	نظامی
جلوہ کرد از برای کونینش	قاب قوسین او در آں اثنا
سر بدرگاہ قاب قوسینش	از دنیٰ شد بقابِ او ادنیٰ

اس مقام کا بیان دونوں حضرات نے سرسری طور پر معمولی الفاظ میں کیا ہی۔ کوئی خاص لطف کہیں نہیں ہی لیکن عبودیت کی شان خسرو کے شعر میں نمایاں ہی اس بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ خسرو کا شعر بہتر ہے۔

مقام وصل و وصال و تکمیل و کمال

خسرو	نظامی
شد بجائے کہ جاں نمی گنجد	چوں حجاب ہزار نور درید
خود ہم اندر میاں نمی گنجد	دیدہ در نور بے حجاب رسید
دیدہ را نور لا یزالی داد	گامے از بود خود فراتر شد
سینہ را سر ذوالجلالی داد	تا خداوندیش پیستر شد
چوں ز عالم بروں نہاد قدم	از نبی جز نفس نبود آنجا
پیش رو شد بہ پیشگاہ قدم	ہمہ حق بود کس نبود آنجا
یافت در خود متاع موزوں را	شربتے خاص خورد و خلعت خاص
دید بیشک خدائے بےچوں را	یافت از قرب حق زہے اخلاص
نکتہ برخواند بیوکالت ہوش	جامش اقبال و معرفت ساقی
قصہ بشنید بمیانجی گوش	ہیچ باقی نماند از باقی
گوش کے سر غیب را سنجد	
بحر اندر صدف کجا گنجد	

اس مقام کا بیان جہاں کہیں بھی پایا جاتا ہے وہاں اسی طرح کے اشارات و کنایات ہیں سب سے پہلے قرآن کریم کی طرف دیکھو مقام قرب کا کس طرح بیان فرمایا ہے فکان قاب قوسین او ادنیٰ۔ پہلے امکان و حدوث کا وجوب و قدم سے قرب کا ان

قابَ قوسین سے تعبیر فرمایا اُس کے بعد او ادنیٰ کہہ دیا جہاں پہونچکر فہم گم عقل حیران تکمیل وکمال کا بیان بھی اسی طرح ہی فاوحیٰ الیٰ عبدہ ما اوحیٰ احادیث مصطفویہ بھی اسی انداز خاص سے آیات کی مفسّر ہیں۔ جہاں تک سیر کا تعلق ہے وہاں الفاظ صاف، بیان واضح لیکن جہاں اس مقام کا بیان آیا وہاں پر عقل خیرہ اور علوم متداولہ بیکار۔ جس نے جو کچھ سمجھا اور جو کچھ کہا وہ نتیجہ اُن علوم کا نہ تھا جو نقوش وخطوط سے حاصل ہوتے ہیں پھر اونھیں نقوش والفاظ میں کیونکر ظاہر کیا جاے یہ حضرات جو کچھ فرما گئے اور مراتب وآداب جس طرح ملحوظ رکھے وہ اُن کی پاکیٔ نفس کی دلیل ہے۔

مولٰنا نظامی نے فنائیت ومحویت مطلقہ کے ساتھ وحدت وجود کے پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے عبد ومعبود کے فرق کو جس بلاغت و نازک خیالی سے ادا فرمایا ہی اس سحر آفرینی کی داد دی نہیں جاسکتی۔ دوسرے شعر کو پڑھو ؎

گامے از بود خود فراتر شد　　　تا خداوندیش میسّر شد

یعنی جب وہ نور ہزاروں حجابات نورانی طے کرتا ہوا بے حجاب نور تک پہونچا تو اپنے بود سے ایک قدم اور آگے بڑھا یہاں تک کہ اوسے خداوندی حاصل ہوئی لفظ بود جو مصرعہ اوّل میں ہی یہ لفظ وجود کا فارسی ترجمہ ہی وجود کے معنی مختلفہ کی طرف غور کرو پھر لفظ خداوند وخدا کے حقیقی معنی میں جو فرق ہی اوسے سوچو علواً کبیرا کی تفسیر واضح ہو جائیگی بارگاہ قدم کے عظمت وجلال کا نقشہ آنکھوں میں پھر جائیگا اور بے اختیار دل سے آداب مراتب کی داد نکلے گی۔ پانچویں شعر میں جو کیف وسرور ہی وہ صرف لفظ

باقی سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہاں پر لفظ باقی جو قافیہ ہے اوس سے جن معانی کا ایہام ہوتا ہے
اُن میں سے ہر معنی موج خیز خمیازۂ مستی و سرور ہے۔

اب خسرو کے اشعار پڑھو اسی مقام کا بیان ہے کلام کی فصاحت، بیان کی سلاست
الفاظ و ترکیبوں کا باہمی پیوند، بندش کی چستی اور معانی کی آمد ایک بحرِ زخار ہے کہ موجیں
مارتا چلا آرہا ہے اس مقام کے بیان میں کمال بلکہ بیان کی جان آداب مراتب کا پاس و لحاظ
ہے اس کی نگہہ داشت مولانا کے اشعار میں تم دیکھ چکے۔ خسرو کے اشعار میں اگرچہ وہ رنگینی
و مرصع کاری نہیں جو مولانا کے اشعار میں ہے لیکن بیان کی روح جس روانی و صفائی کے
ساتھ یہاں پاؤگے وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ پہلے شعر کو پڑھو۔ لفظ شُد جس سے بیان شروع ہوتا ہے
اُس کو ذہن میں رکھتے ہوئے دوسرے مصرعہ کو سوچو مقام وصل کو کس ادب سے بیان کیا
ہے علیٰ ہذا چوتھے شعر کا پہلا مصرعہ ایک خاص بلاغت کا نمونہ ہے متاع موزوں کو اپنے آپ میں
پانا کیسا نادر لطیفہ ہے۔ اب دوسرا مصرعہ اسی شعر کا پڑھو اور ہزار مرحبا کہو وصل و وصال کا بیان
ختم ہوتا ہے سب کچھ کہہ گئے اور آخر میں یہ فرماتے ہیں کہ "بحر اندر صدف کجا گنجد" یعنی صدف
بحر میں پایا جاتا ہے بحر کی سمائی صدف میں کہاں ممکن۔ صرف اس ایک ہی مصرع میں آداب
کے تمام مراتب طے کر دیئے اور معارف و حقایق کا ایک دریا بہا دیا۔ مجھ میں بیان کی
کہاں طاقت ہے تم خود سوچو اگر مسائل و مقامات تصوف کے صحیح معلومات ہیں تو بے
اختیار کہہ اٹھوگے کہ یہ کسی بشر کا کلام نہیں بلکہ کوئی ہاتفِ غیبی بول رہا ہے۔

رجوع بعالمِ صورت

نظامی	خسرو
بامداراے صد ہزار درود	با ہزاراں ہزار نقد مراد
آمد از لوح آں مدار فرود	در شبستانِ دولت آمد شاد
ہر چہ آورد بذلِ یاراں کرد	بہرہ داد از رہِ جوانمردی
وقف کار گناہ گاراں کرد	رہ رواں را ازاں رہ آوردی
کرد چوں بخشش خاصگاں ہمہ چیز
داد بخشش گناہ گاراں نیز

روایات معراج اگر محفوظ ہوں تو ان تلمیحات کا لطف ہے جس وقت دربار احدیت سے السلام علیک ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ کا خلعت خاص عطا ہوا اُس وقت اُس اُمت نواز پیغمبر نے فرمایا السلام علینا و علی عباد اللہ الصالحین یعنی یہ سلام ہم سب پر اور خدا کے صلحا بندوں پر۔ بجاے عَلیّ یعنی مجھ پر کے جو علینا یعنی ہم سب پر فرمایا اس رحمت و سلامتی کے دامن میں تمام امت گنہگار کو چھپالیا۔ اشعار مذکورہ میں انھیں بذل و نوال کی تلمیح ہے دونوں کے اشعار میں ایک ہی مضمون اور ایک ہی مفہوم لیکن خسرو نے الفاظ ایسی روش سے آراستہ کئے ہیں جس سے تاثیر زیادہ ہوگئی۔

⁂

مدح سلطان

حمد نعت و معراج کے بعد شعرا نے مدح سلطان وقت بھی ضرور لکھی ہے اور یہی وہ مضمون ہے جو سارے کلام میں روکھا پھیکا اور سیٹھا ہوتا ہے۔ علی الخصوص متاخرین کے کلام میں تو ایسی بدمزگی پائی جاتی ہے کہ منھ بگڑ جاتا ہے۔ ممدوح کی تعریف میں مبالغہ و اغراق کرتے ہوئے انبیا علیہم السلام پر فضیلت دیتے ہیں پھر اس سے سیری نہیں ہوتی تو صفات اُلوہیت اُس میں ثابت کرتے ہیں کلمات کفریہ کہنے سے بھی باک نہیں رکھتے۔

جب اُس کے سراپا کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اُن کا قلم ایسا حلیہ کھینچتا ہے جو کسی معشوق طناز سراپا ناز و ادا کی شکل موزوں ہو۔ بیان جب واقعات سے اس قدر مبائن ہوگا تو لازمی نتیجہ بدمزگی ہے۔ مثلاً اگر پانی کی یہ تعریف کی جائے کہ وہ زرد رنگ منجمد مثل پتھر کے سخت آگ کی طرح جلانے والا ہے تو یہ کوئی تعریف پانی کی نہوئی بلکہ کائنات میں سے کسی ایسی موجود کی یہ تعریف کی گئی جس کا اسم مجہول ہے۔ بہرحال متقدمین کا کلام پھر بھی کچھ جان رکھتا ہے اسی بنا پر چند اشعار جستہ جستہ دونوں حضرات کے جو مدح سلطان میں لکھے گئے ہیں پیش کرتا ہوں۔

تمہید مدح

نظامی	خسرو
چوں اشارت رسید پنہانی	مشتری گوست کاروان سپہر
از سراپردہ سلیمانی	دوشش سوے من آمد از سرِ مہر

نظامی	خسرو
بر گرفتم چو مرغ بال کشائے	گفت کاے از ضمیر دریا کار
تاکنم بر در سلیماں جائے	گشتہ بازارگانِ دریا بار
در اشارت چناں نمود برید	زآتش طبع یافتہ جاوید
کہ ہلالے برآورد شب عید	روز بازار گرم چوں خورشید
آنچناں کز حجاب تاریکی	آدم تا رواج دُرِّ ثمیں
کس نہ بیند درو زباریکی	سوے گردوں برم متاع زمیں
تاکند صید سحر سازی تو	گوہرے دہ کہ چرخ تاب بود
جادواں را خیال بازی تو	درخور گوش آفتاب بود
عطسۂ دہ ز کلک نافہ کشائے	آں گہرہا کہ آسماں تابست
تا شود باد صبح غالیہ سائے	کہنہ وزرد و خورد وبے آبست

دونوں حضرات کی تمہیدیں اپنی اپنی روش میں جداگانہ انداز رکھتی ہیں۔ حضرت نظامی کے یہاں قاصد کی زبان سے مدح کی فرمائش ہے اور دربار خسروی میں مشتری جو قاضی فلک ہے وہ حاضر ہو کر آسمان کی زیب و زینت کے لئے گوہر گرانمایہ کا ملتمس ہے۔ مولانا کا چھٹا شعر خاص بلاغت کا نمونہ ہے لیکن بحیثیت مجموعی خسرو کی تمہید مولانا کی تمہید سے افضل ہے۔ مگر آئندہ مولانا نظامی نے تمہید کو بہت زور دے کر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

خسرو	نام ممدوح	نظامی
جم ثانی علاءِ دنیا و دیں		عمدۃ الملک علاؤ الدیں
آسماں خاتم آفتاب نگیں		حافظ و ناصر زمان و زمیں
بادشاہ جہاں محمد شاہ		نامِ او زینتِ علا دارد
سائبانِ جہاں بچترِ سیاہ		گر گزشت از فلک روا دارد
مہ سپہر منورش خوانده		فلکِ بے علاقہ دار دپست
دیں علاے مصورش خوانده		در علاءِ فلک بلندی ہست

دونوں کے ممدوح میں اتفاق سے مشارکت اسمی ہے اس لئے موازنہ کا موقع پورا ہے کہ کس نے نام کس طرح موزوں کیا اور اُس سے کیا کیا نکات پیدا کئے اگرچہ امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی طبیعت بادشاہوں کی مدح میں کند ہو جاتی ہے اسی لئے ان کے قصائد میں بھی خاص مدح کا حصہ کمزور ہوتا ہے یہی حال ان کا مثنوی میں بھی ہے کہ بادشاہ کی تعریف میں جوش و خروش نہیں پایا جاتا۔ باوجود اس کے کہ اُسی ممدوح کے رعایا ہیں اراکین دولت میں شامل ہیں پھر بھی قلم شاعرانہ انداز سے مدح سلطان میں رواں نہیں پایا جاتا۔ لیکن اگر کہیں متوجہ ہو گئے ہیں تو کسی سے کم بھی نہیں رہتے ہیں جیسا کہ اس مقام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں پلّے برابر ہیں کسی کو کوئی ترجیح نہیں دی جا سکتی۔

سخاوت

خسرو	نظامی
ابر با ایں ہمہ زبر دستی	بادشاہاں کہ در جہاں ہستند
کرد در پیش دست تو پستی	ہر یک ابرے بدست بر بستند
داد دریا کفِ تو دُر بہوس	دست ابرِ تو ابرِ نیسانست
کفِ دریا چہ داد مشتے خس	واں دگر ابرہا زمستانست
ابر باری تو زاں کفے چو سحاب	آبِ چشمہ کہ آبِ پاکی شد
ابر بارد و لے سوا رک آب	با تو چوں آبِ چشم خاکی شد

مولٰنا نظامی نے ممدوح کے ہاتھ کو ابر نیساں اور دوسروں کے ہاتھوں کو ابرہاے زمستان جو کہا ہے وہ عجب لطیف استعارہ ہے۔ اسی طرح چشموں کے آب کو پاک وصاف مان کر آب چشم و سرشک بنا دینا اور پھر اُن کا خاکی ہوجانا نہایت ہی پسندیدہ اور لطیف خیال ہے اُس پر چشمہ و چشم کی تجنیس سبحان اللہ۔ خسرو کے یہاں زبردستی و پستی کا تقابل پیش و پستی سے پس کا تضاد، لفظ کف کی تجنیس تام مماثل بے مثل ہے۔ نفس مفہوم کسی طرح مضمون سابق سے کم نہیں

کمال تیراندازی

خسرو	نظامی
نوک پیکانش در مقام ہنر	نوک تیرش بہر کجا کہ نشتافت
بردہ داغِ کلف ز روے قمر	گہ جگر دوخت گاہ موے شگافت

نظامی

تیرش از دست گرگ و پائے پلنگ
بر سم گور کردہ صحرا تنگ

مولٰنا نظامی کے اشعار میں دست و پا و سم اور گرگ و پلنگ و گور کا تناسب پسندیدہ ہے اور نفس مضمون سے ایک خاص خوبی ظاہر ہے یعنی اُس کی تیراندازی کا کمال میدان جنگ اور صید وحوش و سباع دونوں میں بے نظیر ہے۔ خسروؒ نے ایک ہی شعر میں غلو و اغراق کے ساتھ نوک تیر کے کمال کو اپنے فن و ہنر میں اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ اُس سے زیادہ اوج دشوار سمجھا جاتا ہے۔

تیغ زنی

نظامی	خسرو
بازی خرس بردہ از شمشیر	تیغش ار برکہ سلیم شدہ
خرس بازی درآورندہ بہ شیر	کوہ چوں آسیا دو نیم شدہ
شہ چو دریاستے دروغ دریغ	تیغ در محش کہ خصم را سودند
جز رو مدش بہ تازیانہ و تیغ	مار مسکوب و ظل ممدودند
ہر چہ آرد بزخم تیغ فراز	زد بیک چاشنیِ تیغ چو آب
بسرِ تازیانہ بخشد باز	فتنہ در خواب رفت مست و خراب

نظامی

فتح بر خاکِ پائے او زدہ فرق

فتنہ در آبِ تیغِ او شدہ غرق

مولٰنا نظامی نے ایک نئے انداز سے تلوار کے جوہر دکھائے ہیں پہلے شعر کا مفہوم بالکل نیا اور تازہ ہے بازی خرس و خرس بازی کی ترکیب و تقلیب سے ایک خاص لطف پیدا کیا ہے خرس بازی وہی خرسک بازی ہے جو اساتذہ کے کلام میں موجود ہے اور وہ لڑکوں کا ایک خاص کھیل ہے۔ خرس مکر و حیلہ میں ضرب المثل ہے اس لئے لفظ خرس بازی مکر و فریب کی جگہ بولا جاتا ہے علی ہذا دوسرے شعر میں تازیانہ و تیغ کا جزر و مد بطریق لف و نشر مرتب و تقابل ایک بے مثل بیان ہے مگر آخر شعر کا آخر مصرعہ "فتنہ در آبِ تیغِ او شدہ غرق" ایسا سہل ممتنع واقع ہوا ہے کہ اُس کا جواب نہیں ہوسکتا۔

خسرو علیہ الرحمۃ کے پہلے شعر میں کوہ و کاہ کا اشتقاق و تقابل تیغ و آب فتنہ و خواب کا تناسب قابل تعریف دوسرے مصرعہ میں آیۃ کریمہ کی تلمیح اور پھر تلوار و نیزے کی تعریف میں جواب الجواب بلکہ لاجواب ہے۔ چاشنی کا لفظ بطریق ایہام یہاں جرعۂ شراب کے معنی میں نہایت مناسب واقع ہوا ہے آخر شعر کا مضمون مولٰنا نظامی کے آخر شعر سے بہت زیادہ اعلیٰ ہے "فتنہ در خواب رفت و مست و خراب" فتنہ کے لئے جس قدر کہ خواب موزوں ہے غرق مناسب نہیں۔ بہرحال میدان شمشیر زنی میں دونوں کی تلواریں یکساں رواں

ہیں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں۔

مولنا نظامی نے بادشاہ کی مدح میں پوری قوت سے زور کلام کا جوہر دکھایا ہے لیکن خسرو علیہ الرحمۃ نے مدح کرتے ہوئے ایسا ناصحانہ پہلو بدلا ہے جس سے اسلاف کی حق گوئی کا ایک بے نظیر جلوہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے جزاھم اللہ خیر الجزا۔

سببِ نظمِ کتاب

مولنا نظامی نے سبب تصنیف کا کوئی خاص عنوان قرار نہیں دیا ہے بلکہ تمہید مدح سلطان میں جو قاصد سے گفتگو ہوئی ہے اُس کے کچھ اشعار سبب تصنیف قرار دیئے جا سکتے ہیں مگر خسرو علیہ الرحمۃ نے سبب تصنیف کا ایک خاص عنوان قرار دیا ہے اور ایسی طرز جدید سے اپنے شاعرانہ کمال کا اظہار کیا ہے کہ دل بے اختیار ہو جاتا ہے۔ دونوں کی روش اس طرح جدا ہے کہ اُن کا صحیح مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے تقریباً خسرو ہی کے اشعار پر اکتفا کرنا ہوگا۔

نظامی

گفتمش گفتنی کہ بہ پسندند — نہ کہ خود زیرکاں بر وخندند

گفتم ایں نامہ را چو دیر مجوس — جلوہ دادم ازاں ہفت عروس

تا عروسانِ چرخ اگر یک راہ — در عروسانِ من کنند نگاہ

از ہم آرایشی و ہمکاری — ہر یکے را یکے کند یاری

آخر از ہفت خط کہ یار شود — نقطۂ بر میانِ کار شود
نقشبندے کہ نقش دہ دارد — سر یک رشتہ رانگہ دارد

طوالت کے خوف سے تمام اشعار نقل نہیں کئے گئے پورے مضمون کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی فکر رسا بحر مواج کی ایک طوفان خیز موج ہے جو دمبدم جوش مارتی ہوئی چلی جا رہی ہے اور رہ گزر کے نشیب و فراز اس کے سدراہ ہو نہیں سکتے۔ اشعار مذکور الصدر میں عروسانِ چرخ سے مراد وہی سبعہ سیارہ ہیں جن کی نسبت کو ہفت گنبد بہرام کی تعمیر میں ملحوظ رکھا ہے ہفت خط جام جمشید کے وہ ساتوں خط ہیں جو علم نجوم کے موافق ہفت افلاک و ہفت اقلیم سے تعلق رکھتے ہیں۔

نقش دہ سے مراد نقش دہ در دہ ہے جو اصول تکسیر کے موافق تسخیر کا اثر رکھتا ہے۔ ان اصطلاحات کے مفہوم ذہن میں ہوں اور پھر اشعار پڑھے جائیں تو کلام کی خوبی اچھی طرح سمجھ میں آئے۔

امیر خسرو علیہ الرحمۃ نے سببِ تصنیف کی اس طرح ابتدا کی ہے۔

توصیف ایام

شبے از روز بیغمی خوشتر — وقتے از نو بہار دلکش تر
ہفت و نہ گرد ماہِ چہاردہ روز — ماہتابی شدہ جہاں افروز
برکشادہ ہولے نورانی — آسماں راگرہ ز پیشانی

ہفت، نہ اور چہاردہ میں صنعت سیاقۃ الاعداد جس خوبی سے موزوں کی ہے وہ قابل ہزار داد ہے ہفت و نہ کردن بمعنی آراستگی تمام جسے اہل ہند سولہ سنگار

کہتے ہیں ماہ چہاردہ روز بدر کامل ہے جو چودھویں تاریخ کو پورا ہوجاتا ہے اس کے علاوہ شب کو روز بینی سے خوش ترکہنا اور بدر کامل کی آرائش تمام و کمال کے بعد اس کی چاندنی کو جہاں افروز قرار دینا کیسا لطیف خیال ہے۔

موسم بہار

زحمت از باغ بردہ باد خزاں — بادِ نوروز نرم نرم وزاں
گل ز شبنم پُر از نسیم شدہ — پردہ دارِ دُرِ یتیم شدہ
جنبشِ بادہائے مشک سرشت — بازکردہ دریچہائے بہشت

ان اشعار میں باد خزاں اور باد نوروز کا تقابل شبنم و نسیم کا تناسب دُر اور در کا اشتقاق و تجانس قابل لحاظ ہے۔ موسم کی خوش گواری کا ایک عجب دلکش انداز میں بیان ہے خزاں کے جھونکے باغ و راغ کو ویران و سنسان کردیتے ہیں نہ پھولوں کی شگفتگی رہتی ہے نہ بلبلوں کی زمزمہ سنجی، طبائع مضمحل جذبات افسردہ لیکن شاعر یہاں یہ ثابت کرتا ہے کہ باد خزاں کا جانا چمن دنیا کی تر و تازگی کا باعث ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ ہر قسم کی زحمت و بیرونقی خزاں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ گلزار عالم ایک لہکتا مہکتا چمن قدرت بن گیا تھا۔

کیفیت شاعر

من در احرام کعبۂ دل خویش — نخل بر دست و چاہِ زمزم پیش
گشتہ کلکم کلید سینۂ من — داد بیروں ہمہ خزینۂ من
در گریباں فرو د رفتہ سرم — پرگہر گشتہ دامن ہنرم

شعر اوّل میں چند الفاظ جو تناسب کعبہ کے لئے جمع کئے گئے ہیں اور دیگر اشعار

ہیں جو استعارات نمکیں اور بلاغت رنگیں موجود ہے وہ شاعر فصیح اللسان کے قادر الکلام ہونے کا کافی ثبوت ہے۔

تقریر بزبان ہمنشیں علی نامی

کامد آں ہمنشین جانی من	ناقدِ سکۂ معانی من
ہم علی نام و ہم بہ بینائی	چوں علی در کشائے دانائی
گفت اے جادوئے طلسم انگیز	موشگاف از زبانِ خامۂ تیز
گاہ فکرت چو خوے گذر دیت	صد عطارد چکد ز ہر مویت

حضرت امیر خسرو نے اس عنوان کے تحت میں ، ، شعر لکھے ہیں جن میں سے ہر ایک انتخاب و لاجواب ہے زورِ سخن قوت کلام جدت شاعری میں ہر ایک شعر چشمۂ صافی کی طرح رواں ہے چوتھا شعر جو شاعر کی مشقت علمیہ کا مظہر ہے اُس کی قادر الکلامی کے کمال کا کیسا آئینہ ہے یعنی وہ ہمنشیں شاعر سے یہ کہتا ہے کہ مشقت فکر کے وقت جو پسینہ آئے وہ ایسا ابرِ نیساں ہو کر نہ برسے جس سے موتی پیدا ہوتے ہوں بلکہ ہر بن مو صدہا عطارد کا مینھ برسا دے اس مقام کا بالاستعاب جو صاحب ذوق سلیم مطالعہ کرے گا اُسے شاعر کی طبع کامل کا ایسا زور دکھائی دے گا کہ بحر مواج بھی اُس کے سامنے ایک قطرہ سے زیادہ بے حقیقت ہے۔

ہر یکے رقعہ را کہ کردی نشر	دو دختی دامنش بدامنِ حشر
ہر جریدہ کہ ساز کردہ تست	درے از لطف باز کردہ تست
سکۂ معنی از چہار سواد	کردی آراستہ چو سبع شداد

چوں لعنوانِ پنجم آمد حرف　　　　تا چہ گنجینہ کرد خواہی صرف

رقعہ کا ایہام اور پھر اُس کے دامن کا دامن حشر سے پیوند چہار، سبع، پنج کا سیاق ایک ایسا وجدانی کیف ہے جو بیان میں نہیں آسکتا۔

پہلے شعر کا مفہوم شاعر کی کس درجہ قوتِ متخیلہ کی بلند پروازی کو ظاہر کرتا ہے یعنی جس داستان کہنہ کو تو نے اپنی تازہ بیانی سے شہرت دی ہے اُس کے دامن کو دامن حشر سے وابستہ کردیا۔ اب اُس کا آوازہ قیامت تک آدیزۂ گوشِ روزگار رہے گا۔

ترتیب خمسہ

دادی اوّل بہ گنبدِ دوّار　　　　روشنائی ز مطلع الانوار

کردی آنگاہ با نشاط تمام　　　　شہد خسرو و شیریں اندر جام

باز در عالم خردمندی　　　　شورِ مجنوں و لیلےٰ افگندی

پس دہاں پر دُرِ دری کردی　　　　شرحِ رازِ سکندری کردی

ایں زماں کز جواہرِ انجم　　　　ق　　　　مے نگاری صحیفۂ پنجم

کوش کیں خط چناں نگاری چست　　　　کہ فزوں آید از چہار نخست

ان اشعار میں پنج گنج کے چار خزائن جو پہلے گوہرِ معانی سے معمور ہو چکے تھے اُن کا تذکرہ اُن کے ناموں کے ساتھ ہی چونکہ حضرت نظامی نے سکندر نامہ میں جو آپ کی آخری مثنوی ہے اپنی تصانیف سابقہ کا اسی طرح ذکر کیا ہے اس لئے امیر خسرو بھی خمسہ کی آخری مثنوی میں اُس کے دیگر ارکان اربعہ کا ذکر فرماتے ہیں۔ نظامی کے اشعار اس موقع پر اگر نقل کردیئے جائیں تو کچھ نامناسب نہ ہونگے اگرچہ اُس کی

بحر غیر ہی مگر باعتبار مضمون پورا مقابلہ ہی کہ کس نے کس طرح کتابوں کے نام شمار کئے ہیں

سوے مخزن آوردم اوّل بسیج | کہ سستی نکردم دریں کار ہیچ
وزو چرب و شیریں بر انگیختم | بشیرین و خسرو در آمیختم
وزانجا سراپردہ بیروں زدم | در عشق لیلیٰ و مجنوں زدم
چو از عشق مجنوں بپرداختم | سوے ہفت پیکر فرس تاختم
کنوں بر بساط سخن گستری | زنم کوس اقبال اسکندری

ہر شعر کا مولٰنا نظامی کے خسرو کے اشعار سے مقابلہ کرلو۔ خسرو کی برتری اس مقام پر ایسی نمایاں ہی کہ محتاج تشریح و بیان نہیں۔ مولٰنا نظامی کا پانچواں شعر البتہ لطیف ہے باقی اشعار معمولی ہیں خاص کر پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ تو بہت ہی سست ہی۔

اب اس عنوان کا صرف ایک مضمون اور لکھنا ہی جس میں مصنف نے کتاب کا نام اور اُس کا موضوع ایک خاص بلاغت کے ساتھ بیان کیا ہی۔ فرماتے ہیں ؎

گویم افسانہاے طبع فزاے | از لب لعبت فسانہ سراے
ہر فسانہ صراحیِ ز شراب | دور مستی و بلکہ داروے خواب
ہر یکے را بہشت نام کنم | جام و کوثر درو تمام کنم
ہفت باشد بہشت و گوہر ہفت | ہشتم آں کاندرو بود ہر ہفت
پس نوشتم ز کلک مشک سرشت | نام ایں ہشت خانہ ہشت بہشت
تا کسے کاندرو گزر یابد | بے قیامت بہشت در یابد

صنعت سیاق و اشتقاق وغیرہ تو شاعر کا روزمرہ ہی اُس پر طبیعت کا جوش لطف زبان و سلاست بیان کے ساتھ کوثر و سلسبیل کی روانی کا مزہ دیتی ہی۔

آغاز قصّہ بذکر بہرام

خسرو	نظامی
گنج پیمائے ایں خزانۂ پر	گوہر آمائے گنج خانۂ راز
از خزانہ چنیں کشاید دُر	گنج گوہر چنیں کشاید باز
کآفتابِ جمال بہرامی	کاسماں راتراز وے دوسرست
چوں شد از نور در جہاں نامی	در یکے سنگ و در یکے گہرست
پدرش رخت زندگانی بست	گاہ آید چو گوہر از سنگے
اوبجائے پدر بہ تخت نشست	گاہ لعلے چو کہربا رنگے
سر موئے کجی زدہر نخاست	گوہر و سنگ شد بہ نسبت تام
جز سرے کو بشانہ گرد دراست	نسبت یزد گرد با بہرام

آغاز قصّے کی تمہید دونوں باکمالوں کی ایک ہی طرز سے شروع ہوتی ہے۔ گزشتہ ایام کا واقعہ ہے اس لئے عہد سلف کا مورخ دونوں کے دربار میں بہرام کی تاریخ بیان کرتا ہے۔ صنائع و بدائع دونوں کلاموں میں یکساں۔ پہلا شعر بھی ایک دوسرے کا جواب ہے۔ لیکن امیر خسرو عہد بہرام کے امن وامان سکون و قرار کو عجب لطف سے بیان فرماتے ہیں ؎

سر موئے کجی زدہر نخاست ۔۔۔ جز سرے کو بشانہ گرد دراست

یعنی اُس کے عہد میں زمانہ سے کجی بالکل دُور ہوگئی تھی کسی جگہ بال برابر بھی فتنہ فساد نہ پایا جاتا ہاں ارباب نعمت کے سرشانہ کشی کے وقت البتہ کج دکھائی دیتے تھے جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ ملک آباد تھا اور اہل ملک ناز و تنعم میں زندگی بسر کرتے تھے۔

تیر اندازیِ بہرام

خسرو		نظامی	
آہنِ تیر چوں محک کردی		پیش تیرش گرار زنے بودی	
خطِ گوراں ز پشت حک کردی		بسنانش چو حلقہ بربودی	
ور ز آہو بُدے نشانۂ او		تیرش از حلق شیر حلقہ ربائے	
موئے بشگافتے ز شانۂ او		تیغش از قفل گنج حلقہ کشائے	
ور شدی در نشانہ سخت انداز		در نظر گاہ راست اندازی	
رخنہ در ناف کوہ کردی باز		بیلکش را بموئے بُد بازی	
زانش باران تیر محکم بود			
کہ کمانش کمان رستم بود			

مولنا نظامی بہرام کی قدر اندازی اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ اگر دانہ ارزن کو جسے ہندی میں چینا کہتے ہیں وہ اپنے تیر کا نشانہ قرار دیتا تو اُسے حلقہ کی طرح بنا لیتا تھا۔ اور اگر شیر کی طرف تیر ڈالتا تو اُس کے حلق سے اُس حلقہ کو جو قمری و فاختہ کی طرح اُس کا طوقِ گلو ہوتا ہی اُڑا لیتا تھا پھر اس پر مولنا ترقی فرماتے ہیں اور اُس کے کمال کا یوں اظہار فرماتے ہیں کہ اُس کا پیکان تیر بال کو بھی دو حصوں میں چیر دیتا تھا۔ مبالغہ میں اغراق وغلو کا جو لطف ہی اُس پر حلق و حلقہ کا اشتقاق و تجانس اور بھی لطیف ہی۔

امیر خسرو نے جس انداز سے جواب دیا ہی اُس کا لطف بیان سے باہر ہے

پہلا شعر خسرو کا مولنٰنا کے دوسرے شعر کا لاجواب جواب ہی۔ وہاں حلقہ حلق شیر کو بہرام کا تیر نشانہ بنا کر اُڑاتا تھا اور یہاں گورخروں کی پشت خط کو جو بعینہٖ حلقہ حلق شیر کی طرح ایک قدرتی سیاہ سیلی ہوتی ہی اُس کا تیر امتحان کے وقت ملتا ہی وہاں راست اندازی کے وقت موشگافی کی جاتی ہے یہاں شانہ آہو کے بال کو چیرا جاتا ہی۔ غرض یہ کہ دونوں کا بیان لاجواب ہی۔

صفتِ اسپِ بہرام

نظامی	خسرو
اشقرے بادپائے بودش چُست	گرچہ بودش چو برق کوہ گزار
بہ تگ آسودہ و بگام درست	صد طویلہ بہر طویلہ ہزار
پر برآورد پائے زاند امش	لیک بود اشقرے گزیدۂ شاہ
دست ہر کس شکستہ از گامش	چیرہ تر زابلق سپید و سیاہ
رہ نوردے کہ چوں نوشتے راہ	بادپائے کہ چوں بگام شدی
گوئی بردے زچرخ و مہر و زماہ	تگ زدن بر صبا حرام شدی
اشقرے گو سم چو زیں کردی	ور بآہنگ تگ بروں جستے
گور بر گردش آفریں کردی	وہم را دست و پائے بربستے

مولٰنا نظامی نے گھوڑے کی تیزروی و تیزدوی کو نہایت لطف سے بیان کیا ہی فرماتے ہیں کہ وہ گھوڑا ایسا سریع السیر تھا کہ اُس کے پاؤں کو پاؤں نہ کہنا چاہیئے بلکہ وہ پر تھے

کہ اُس کے جسم سے نکلے تھے۔ کسی کا ہاتھ اُس کے قدم تک نہیں پہنچ سکتا تھا گورِ صحرائی جن کی تیزی ضرب المثل ہے وہ بھی اُس گھوڑے کی گردپر آفریں خواں تھے۔ اظہارِ سرعت کے لیے جس قدر مبالغہ کیا جاسکتا تھا انھیں چند اشعار میں ادا کر دیا گیا۔ اُس پر دست و پا کا تقابل چرخ و مہر و ماہ کا تناسب، آسمان و مہر و ماہ کے مقابل لفظ گو کا لانا نظم کا زیور ہے۔

خسرو علیہ الرحمۃ کے یہاں بھی وہی اشقر ہے اور وہی اُس کی تیز روی مگر بندشیں جُدا ترکیبیں نئی خیالات نرالے مضامین انوکھے۔ خصوصیت کے ساتھ یہ صفت آپ کے ساتھ مخصوص ہے کہ یہ ہرگز امتیاز نہیں کیا جاسکتا کہ کسی کتاب کے مقابلہ میں آپ کوئی دوسری کتاب لکھ رہے ہیں یہاں وہ اشقر سریع السیر ابلق لیل و نہار سے زیادہ تیز ہے صبا اُس کے سامنے قدم نہیں اُٹھا سکتی دوڑ کے وقت وہم تک کے بھی ہاتھ پاؤں باندھ دیتا ہے پَر ہونے پر مُرغ تیز کا کام کرتا ہے اس کے علاوہ اشقر و ابلق کا تقابل اور باقی الفاظ کا تناسب قابل تعریف ہے۔

زندہ گرفتاریِ گور

نظامی	خسرو
چوں کمندِ شکار برگرفتے	بعد ازاں چوں بروں شدی بشکار
گور زندہ ہزار برگرفتے	کم رسیدی رمندہ را آزار
نام خود داغ کردہ بر رانش	در کمندش بحکم بربستے
دادہ سرہنگیِ بیابانش	باز گشتے و شاد بنشستے

خسرو	نظامی
گرم بررانش داغ فرمودے	چوں کہ داغِ ملک براں دیدے
خطِ آزادیش ہماں بودے	گردِ آزار او نگر دیدے
چرخ زاں گور گیریِ بہرام	بندۂ راز بند بکشادے
گورخانہ زمانہ کردش نام	بوسہ بر داغ گاہ او دادے
تا دریں کہنہ گورخانہ پست	در چنیں گورخانہ مورے نیست
گورخاں ہم ز داغ گور نہ رست	کہ برو داغ دست زورے نیست

مولانا کا مقصود یہ ہے کہ آخر میں بہرام گورخروں کو زندہ گرفتار کرتا اور اُن کی ران پر اپنے نام کا داغ ڈال کر چھوڑ دیتا۔ دوسرے شکاری جب شاہی مہر اس پر دیکھتے تو اُس کا ادب کرتے اور کسی طرح کی تکلیف اُسے نہ پہنچاتے۔ آخر شعر میں ایک عبرتناک نتیجہ ظاہر فرمایا ہے کہ عالمِ فنا میں ایک چیونٹی بھی نہ ملے گی کہ وہ کسی زبردست کی داغ دار نہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اسی مضمون کو سادگی کے ساتھ مقابلہ کی حالت میں امیر خسرو کس خوبی سے ادا کرتے ہیں۔ خسرو کے اشعار پڑھو اُسی مضمون کی سادگی و صفائی کے ساتھ ایسی خوبی سے تکرار ہے کہ باہم مقدم و موخر کا فرق غیر ممکن ہے لیکن نتیجہ جو خسرو نے بیان کیا ہے وہ اُس نتیجہ سے زیادہ عبرتناک ہے یعنی اس دُنیا کے پرانے گورخانے میں خود زمانہ کا گورخان بھی داغِ گور سے نہ بچا اور آخر کار وہ بھی قبر کا غلام بنا۔

واقعہ نگاری

بہرام نے اپنی معشوقہ دلارام سے پوچھا کہ تو فرمایش کر کہ کس طرح ہرن کو اپنے تیر سے شکار کروں نظامی علیہ الرحمۃ نے دلارام کی یہ خواہش بیان فرمائی ہے کہ ایسا تیر لگایا جائے جو گورخر کے سر کو اُس کے سُم کے ساتھ بخیہ کردے۔ خسرو یہ بیان کرتے ہیں کہ دلارام نے کہا کہ کمال جب ہے کہ تیر آہوئے نر کو مادہ بنائے اور مادہ کو جامۂ نر۔ دونوں کے اشعار یہ ہیں۔

خسرو	نظامی
باز گو تا زنم بدانائی	گورے آمد بگو کہ چوں تازم
ہر یکے را چنانکہ فرمائی	وز سرش تا سمش چہ اندازم
سیمبر ہم بر خصت شاہی	گفت باید کہ رُخ برافروزی
گفت ایں خواہش از من خواہی	سرِ آں گور بر سمش دوزی
ناوکِ زن بر آہوئے سادہ	شاہ چوں دید پیچ پیچی او
کہ بود مادہ نر، نرش مادہ	چارہ گر شد ز بد بپیچی او
شاہ دریافت خوردہ دانی او	
تاخت مرکب بہم عنانی او	

دونوں کے اشعار موجود ہیں اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو دونوں پلّے برابر ہیں۔ اگرچہ فرمایشِ دلارام دونوں کے یہاں غیر غیر ہے مگر صفائی و بے ساختگی میں دونوں کا

کلام مساوی ہے۔ہاں آخر شعر مولنا نظامی کا اہلِ زبان ہونے کو بتا رہا ہے اور خسرو کا آخر شعر اُن کے زبان داں ہونے کا مقر ہے پہلے میں بے پیچا پیچی اور بد پیچی خاص اہلِ زبان کا لب ولہجہ ہے خسرو کے یہاں لفظ خوردہ دانی واقع ہوا ہے ارباب مذاق صحیح امتیاز کر سکتے ہیں کہ اہلِ زبان و زبا ندان ہونے میں اسی طرح کا ایک فرق لطیف پایا جاتا ہے۔

نظامی	خسرو
خواست اوّل کماں گروہہ چو باد	بخدنگے دو شاخ آہوئے نر
مہرۂ در کماں گروہہ نہاد	بردہ زاں گونہ کو نداشت خبر
صید را مہرہ در فگند بگوش	چو بہ بر فرق او بداں ساں اند
آمد از تاب مہرہ مغز بجوش	کہ ازاں نر بمادہ فرق نماند
سم سوئے گوش برد صید زبوں	دو یک انداز را بہم پیوست
تا ز گوش آرد آں غلولہ بروں	پس بر آہو روانہ کرد زشست
تیر شہ برق شد جہاں افروخت	ہر دو در سر چناں نشاندش غرق
گوش و سم را بہ یکدگر بردوخت	کہ دو شاخش پدید کرد بہ فرق
چوں سر و سم بدوخت شاہ زیتر	زاں دو شرط ہنر کہ در خور کرد
بسر و سم در آمداں نخچیر	کرد نرمادہ۔مادہ را نر کرد

واقعہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ اُس کے اجزا و لوازم اس طرح بیان کئے جائیں کہ سامع کی نگاہ میں اُس کی ہو بہو تصویر کھنچ جائے۔مولنا نظامی نے دلارام کی ایک

انوکھی فرمایش بیان کی تھی بہرام کی قدر اندازی اسی کی مقتضی تھی کہ عجیب سے عجیب تر فرمایش بھی پوری کی جائے۔ انھیں امور کا لحاظ رکھتے ہوئے مولٰنا بہرام کے کمال کو یوں بیان فرماتے ہیں کہ بہرام نے بجائے تیر و کمان کے پہلے غلیل کو اُٹھا کر ایک غُلہ اُس گورخر کے کان میں پہنچایا جس سے اُس کا مغز جوش مارنے لگا۔ گورخر نے اپنے سم سے کان کھُجلایا بہرام کا برق رفتار تیر فوراً آپہنچا اور گورخر کے سم کو اُس کے سر سے بخیہ کر دیا۔

چند اشعار میں واقعہ کی تصویر کھینچ کر صورت حال کو اس طرح دکھا دینا کہ گویا ہم اُس کو بچشم سر دیکھ رہے ہیں مولٰنا کا حصّہ ہے۔

خسرو علیہ الرحمۃ کے یہاں بھی برابر کا جواب ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ وہاں گور کو شکار بنایا ہے اور یہاں ہرن کو نشانہ ٹھیرایا ہے۔ بہرام نے ایک خدنگ سے آہوئے نر کے دونوں شاخوں کو سر سے ایسا اُڑایا کہ اُس کو خبر بھی نہوئی۔ اور دوبارہ اپنے تیر دوشاخہ کو دوسری آہوئے مادہ کے سر پر ایسا جمایا کہ گویا وہ اُسی کی دو شاخیں ہیں اس طرح چشم زدن میں آہوئے مادہ نر اور نر مادہ کر کے دکھا دیا۔

تشبیہ و استعارہ مبالغہ و اغراق جو عروس سخن کے زیور ہیں ان کی چند مثالیں گزر چکیں انھیں نمونوں سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ خسرو علیہ الرحمۃ کو نظامی جیسے ملک الکلام کے ساتھ ان انواع میں پہلو بہ پہلو رہنے کا پورا استحقاق ہے۔ اور یہ محض بہتان ہے کہ خسرو صنائع لفظی کے ایسے دل دادہ ہیں کہ اس کے التزام سے لطف معنی خاک میں مل جاتا ہے۔

واقعہ نگاری جسے مثنوی کی جان کہا جا سکتا ہی اُس میں خسرو کا پلہ نظامی سے ہرگز کم نہیں۔ اب ایک موقع مرقعہ نگاری کا دکھایا جاتا ہی جس میں ایک شاہد ناز کا سراپا کھینچا گیا ہی۔

مولنا نظامی کا یہ کمال خصوصیت کے ساتھ ہر مقام پر نمایاں و بے مثل تسلیم کیا گیا ہی آپ کا خامۂ فکر ایسی تصویر بت طناز کی کھینچتا ہے جس کے مقابل مانی و بہزاد کے اصنام بھی سربسجود ہو جاتے ہیں۔

نظامی	خسرو
داشت باخود کنیزکے چوں ماہ	خاصہ ترزاں ہمہ کنیزے بود
چست و چابک بہم رکابئ شاہ	آفتابے بزیر چرخ کبود
فتنہ نامی ہزار فتنہ درو	اصلش از چین و رُخ چو صورت چیں
فتنہ شاہ و شاہ فتنہ برو	گیسوش چوں سواد چیں مشکیں
تازہ روئے چو نوبہار بہشت	قامتے در خوشی چو عمر دراز
خوش خرامے چو باد بر سرکشت	ہوس انگیز تر ز عشق مجاز
انگبینی بروغن آلودہ	
چرب و شیریں چو صحن پالودہ	

مولنا نظامی نے اختصار کے ساتھ جو کچھ کہا ہے خوب کہا ہی بالخصوص دوسرے شعر میں فتنہ کا انقلاب لاجواب ہی اُس کے شیریں لب و شکر گفتار ہونے کے لیے جو تشبیہیں لائی گئیں سب کی سب حلاوت بخش ہیں۔

خسرو علیہ الرحمۃ کے اشعار پڑھو وہی کنیز یہاں بھی ہے لیکن ادائیں نرالی۔ غمزے نئے۔ کرشمے جدید۔ مولٰنا نے اُس کے رُخِ دلفروز کو ماہ کہا ہے۔ خسرو نے "آفتاب بزیرِ چرخِ کبود" فرما کر سرکارِ حُسن کے عجیب و غریب کرشموں کا خاکہ کھینچ دیا۔ پھر تیسرے شعر میں قامت کی ایک نئے انداز سے تعریف کرتے ہوئے "ہوس انگیز ترزِ عشقِ مجاز" صرف اسی ایک مصرعہ میں ایک دفتر کا دفتر لکھ دیا۔ انصاف شرط ہے ایک مصرعہ میں اس جامعیت کے ساتھ جس کے قلم نے سراپا کشی کی ہو اُس کے خسروِ اقلیمِ سخن ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔

ایک اور موقع

	نظامی	خسرو	
قامت و عارض	خرمنِ گل وے بقامتِ سرو	روئے گل رنگ داد گل را رنگ	عارض و دہن
	شستہ روئے وے بخونِ تذرو	دہنش تنگ با شکر ہم تنگ	
غمزہ	خوبیِ غمزہ اش سحر گہِ خویش	نرگسش دُور باش غمزہ خدنگ	چشم و لب
	بستہ خوابِ ہزار عاشق پیش	لعل در آشتی و عشوہ بجنگ	
لب	لبِ لعلش چو برگِ تر باشد	خالِ او گو ہزار پردہ درید	خال
	برگ آں گل پر از شکر باشد	عالمے را بگنجدے نخرید	
چشم	چشمِ چوں نرگسی کہ خفتہ بود	گیسوئے پیچ پیچ از سرِ ناز	گیسو
	فتنہ در خوابِ او نہفتہ بود	داد در دستِ فتنہ رشتہ دراز	

خسرو	نظامی	
رگ نمودہ بروں ز لطف بدن	عکس روشن بزیر زلف بہ تاب	عکسِ عارض
ہم چو رشتہ درون دُرِّ عدن	چوں حواصل بزیر پرِّ عقاب	
بر چو نارنج نو بشاخ درخت	خالش از زلف عنبر افشاں تر	خال و چشم
سخت رستہ ز صحبتِ دلِ سخت	چشمش از خال نامسلماں تر	

مولٰنا نظامی کے پہلے شعر میں استعارہ کی لطافت اور حسنِ تکرار کا لطف قابلِ دید ہے
قامت و عارض کی تعریف چونکہ ایک ہی شعر میں کی گئی ہے اس لئے دوسرا شعر
جہاں چہرہ کی تازگی و سُرخی کو ظاہر کرتا ہے وہاں خوش رفتاری سے بھی مشعر ہے عموماً
شعرا کے کلام میں شراب سے مُنہ دھونا چہرہ کو زیادہ گل گوں کرنے کے معنی میں
آتا ہے۔ لیکن نظامی نے اُس گلِ رُخسار کے رنگیں چہرے کو شراب سے نہیں دھویا ہے
بلکہ خونِ تدرو سے دھوتے ہیں جس میں لطیف اشارہ اس طرف ہے کہ تدرو جس کی
خوش رفتاری ضرب المثل ہے اُس کے خرامِ ناز نے اُس کا خون کر دیا تھا۔ اسی طرح
تیسرے شعر میں لبِ لعل کو برگِ گلِ تر کہکر پر شکر کہنا موصوف واحد کے لیے صفات متعددہ
ثابت کرنے کی ایک عمدہ مثال ہے۔

پانچویں شعر میں عکسِ رخسار اور گیسوئے تاب دار کے لئے جو تشبیہ مولٰنا نے بیان کی
ہے غالباً اُس کے موجد خود مولٰنا ہیں کسی دوسرے اہلِ زبان کے کلام میں یہ نادر
تشبیہ دیکھی نہیں گئی۔

زلف عنبر بو جو اُس کے گلابی چہرے پر بار بار جھوم جھوم کر آجاتی ہے اُس نظارے کو یوں تشبیہ سے سمجھاتے ہیں "چوں حواصل بزیر پرِ عقاب" حواصل ایک بحری پرند ہی سفید و چمکدار عقاب سیاہ شکاری پرند ہے۔ اب مصرعہ پڑھئے اور اقلیم سخن پر مولنا کی پر جلال آزادانہ سلطنت کی ہزاروں داد دیجئے۔

اب خسرو کے اشعار پڑھو دوسرا شعر ان کی جدت پسند طبیعت اور قادر الکلامی کا پورا ثبوت دے رہا ہی ایک ہی شعر میں مضامین گوناگوں بیان کرنا خصوصیات خسرو ہے۔ چشم مخمور و نیم باز کو دورباش قرار دیتے ہوئے غمزہ کو دل و جگر کے شکار میں مصروف رکھنا لب لعلین کو صلح جو و آشتی پسند کہتے ہوئے عشوۂ فتنہ انگیز کا جنگ و جدال سے باز نہ آنا کس خوش اسلوب و جدت طرازی سے بیان ہوا ہے خال و گیسو کے اشعار پڑھو چار مصرعوں میں کس قدر محاورات جمع کر دیے گئے ہیں اُس پر خال و کنجد گیسو پیچ پیچ اور فتنہ و رشتہ کی درازی میں تناسب لفظی و معنوی کس قدر قابل تعریف ہی۔ اگر ناظرین غور کریں گے تو خسرو کے اکثر اشعار میں تشبیہیں نہ صرف لطیف و نادر اُنھیں ملیں گے بلکہ اکثر کو جدت و ایجاد خسروی کا نمونہ پائیں گے خاص کر پچھلا شعر اُس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے وہ تھوڑی ہی۔ غرض سراپا لکھنے میں بھی خسرو اپنے مقابل سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔

موضوع کتاب اور اُس کے اجزا

ابھی بیان ہو چکا ہی کہ ہفت گنبد بہرام کی ہفت اقلیم کی شاہزادیوں سے زیب و زینت

ہی ہر گنبد کا رنگ مختلف ہی اُس رنگ کی مناسبت سے بہرام و شاہزادی کا لباس
بھی رنگین ہوتا ہی۔ بہرام شاہزادی سے کسی قصہ کی فرمایش کرتا ہے وہ بادشاہ کو
دعا دیتے ہوئے ایک قصہ کہتی ہے ختم داستان پر بہرام ہم آغوش ہو کر داد عیش دیتا ہے
اس طرح ہر قصے میں پانچ چیزیں ہوتی ہیں ایک تو بہرام کا داخلہ دوسرے
شاہزادی کی دعا تیسرے شاہزادی کی زبان سے داستان۔ چوتھے رنگ کی
بوقلمونی۔ پانچویں استراحت بہرام۔

داستانیں دونوں کتابوں میں بالکل مختلف ہیں اس لئے اُن میں مقابلہ نہیں
ہوسکتا پھر یہ بھی ہے کہ واقعہ نگاری و داستان نویسی میں خسرو کی برتری ایسی نمایاں
ہی جو مقابلہ سے بے نیاز ہی باوجود اختصار و ایجاز کے ہر داستان کے اجزا و لوازم
اس استیعاب سے خسرو نے بیان کئے ہیں کہ اس کمال کی داد نہیں دی جاسکتی۔ اب
مقابلہ میں صرف داستان کے بقیہ چار ارکان سے بعض نمونے مقابلتہً پیش کیے جاتے ہیں

رنگ سیاہ گنبد اوّل

نظامی	خسرو
در سیاہی شکوہ دارد ماہ	رنگ مشکیں شعار عباسی ست
چتر سلطاں ازاں کنند سیاہ	زیور آرائے چرخ شماسی ست
ہیچ رنگے بہ از سیاہی نیست	ظلمتِ شب کہ مشک فام بود
راست ماہی چو پشت ماہی نیست	بہر آرایشِ تمام بود

نظامی	خسرو
از جوانی بود سیہ موئی	خون تر در میان نافۂ خشک
وز سیاہی بود جوان روئی	تا نگرد د سیہ نباشد مشک
بسیاہی جہاں بصر بیند	خط و خالے کہ دلستاں دارد
ہر کسے بر سیاہ بہ نشیند	مشک رنگ ست زیب ازاں دارد
گر نہ سیفور شب سیاہ شدی	
کے سزاوار مہر و ماہ شدی	
ہفت رنگے ست زیر ہفت اورنگ	
نیست بالاتر از سیاہی رنگ	

فضیلت سیاہی پر جو دلائل قائم کیے ہیں اگرچہ واقعی ہیں مگر طرز بیان زیادہ چست نہیں لیکن خسرو علیہ الرحمۃ کے دلائل زیادہ دلپذیر اور طرز بیان بہت ہی چست ہے۔

گنبد چہارم رنگ سرخ

نظامی	خسرو
سُرخی آرایشِ نو آئین ست	رنگ گلنار دل کشائے بود
گوہرِ سُرخ را بہا این ست	چوں مے لال جاں فزائے بود
چونکہ آمیزشِ رواں دارد	زیب باغ ست رنگ گلناری
سُرخ زاں شد کہ لطف جاں دارد	چوں شفق بر سپہر زنگاری

نظامی

زرکہ گوگرد سُرخ شد لقبش
سُرخی آمد نکوترین سببش

خسرو

ہر کہ شد بخت و دولتی یارش
رُخ بسرخی بود چو گلنارش
ہست گلنار ہمچو نار کلیم
گل نارست باغ ابراہیم

اس مقام پر بھی مولنٰنا کے دلائل وطرز بیان سابق کی طرح سادہ اور جدت وچستی سے خالی ہیں برخلاف اس کے خسرو کے دلائل میں جدّت اور طریقہ نہایت ہی چست ومعنی خیز ہو اُس پر صنعت تقابل وتناسب لفظی ومعنوی نے اور بھی بیان کو رنگین بنا دیا ہو صنائع لفظی کا ایسی صنعت سے لانا جس سے معنی میں رنگینی ولطافت پیدا ہو جائے خسرو کا حصّہ ہی۔

گنبد ہفتم رنگ کافوری

نظامی

ہر چہ ز آلودگی شود نا مید
پاکیش را لقب کنند سپید
در پرستش بوقت کوشیدن
سنت آمد سپید پوشیدن

خسرو

جامہ کافور گوں بہ ست بساز
کہ بخیر الثیاب یافت طراز
پاک رنگ ست رنگ کافوری
تا مہار ابیاض مغفوری
چوں شود مشک آدمی کافور
موے اورا خدائے خواند نور

خسرو

روز روشن کہ سر بسر نورست
ہمہ نورش برنگ کافورست

اس جگہ بھی سابق کی طرح خسرو کے دلائل میں قوت و افضلیت موجود ہے۔ سات رنگوں میں سے تین کا مقابلہ کر کے کمال خسرو کا نمونہ دکھا دیا گیا۔ ایک اوّل اور دوسرا وسط اور تیسرا خاتمہ کا رنگ اختیار کیا ہے۔ چونکہ ان مقامات کا بیان نہایت صاف و سلیس ہے اس لئے وجوہ افضلیت کا تفصیلی اظہار غیر ضروری سمجھکر ترک کر دیا گیا۔

خواب بہرام با معشوقانِ طنّاز

اس موقع کو کہ شاہزادی جب قصہ ختم کرتی ہے تو بہرام اُس سے ہم آغوش ہو کر سو رہتا ہے دونوں حضرات نے بیان کیا ہے۔ لیکن نظامی کے یہاں عموماً بہرام کا خواب ایک معمولی خواب ہے لیکن خسرو علیہ الرحمتہ جب بہرام کو سُلاتے ہیں تو عاشق و معشوق کے سونے کا نقشہ نگاہوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ دو تین نمونے اس کیف کے بھی مقابلتہً لکھے جاتے ہیں۔

داستان اوّل خواب با ملکہ ہندی

نظامی	خسرو
چونکہ بانوئے ہند با بہرام	شاہ کز نازنین مشکیں موے
باز پرداخت ایں فسانہ تمام	ایں فسانہ شنید روے بروے

خسرو	نظامی
خفت در خواب گاہ حور العین	شہ بران گفتۂ آفرینش گفت
گل در آغوش مشک بر بالین	درکنارش گرفت شاہ و بخفت

خسرو کے اشعار میں جو لطف و کیف ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ موئے و روئے۔ عین و آغوش و بالیں کے تناسب کے علاوہ اُس محبوبہ ہندی کو مشکیں موے سے موصوف کرنا اور حالت خواب کو مشک بر بالیں قرار دینا ایک خاص صنعت طرازی ہے۔

داستان دوم ملکہ گنبد زعفرانی

خسرو	نظامی
شاہ را چوں نگار شکر خاے	شہ چو ایں داستاں شنید تمام
زعفراں وار شد نشاط افزاے	درکنارش گرفت و خفت بکام
در بر آورد شاہ زرد قباش	
زعفراں سائے گشت بر حلواش	

خسرو علیہ الرحمۃ نے اس مقام پر بلیغ و دقیق استعارہ کے ساتھ جس طرح مضمون بیان کیا ہے اُس کا صحیح اندازہ کافی مذاق سخن چاہتا ہے۔

خواب بہرام با ملکہ گنبد سُرخ

خسرو	نظامی
ماہ گلنار چہرہ چوں بہ تمام	روے بہرام ازاں گل افشانی
گفت افسانہ خفت با بہرام	سُرخ شد چوں گلاب ریحانی

نظامی

دست بر سُرخ گل کشید دراز
درکنارش گرفت و خفت بہ ناز

یہاں خسرو نے سادگی و اختصار سے کام لیا ہے اور مولنا کے اشعار میں رنگ آمیزی ہے لیکن پھر بھی دونوں نے رنگینی کے جو پہلے اشعار خسروی میں دکھائے گئے ہیں اُن کے مقابل میں یہ سُرخی پھیکی ہے۔ بہرحال من حیث المجموع خسرو کا پلّہ اس مضمون میں بھی راجح ہے۔

داخلۂ بہرام بہ گنبد

شام ہوتی ہے اور بہرام معشوقۂ دلنواز کے گنبد میں داخل ہوتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ مولنا نظامی کا یہ بیان گنبد سُرخ میں نہایت ہی بلیغ ہے۔ اس لئے صرف مقابلہ میں اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

نظامی	خسرو
شب چو منجوق بر کشید بلند	شب چو پرویں نمائے گشت سپہر
طاق خورشید در کشید بلند	ماہ بر خویش لبست زیورِ مہر
شاہ زاں سُرخ سیب شہد آمیز	داد فرماں خدائیگان سریر
خواست افسانۂ نشاط انگیز	کاید آں ماہروے در تقریر
	بہ فسون و فسانۂ چو نبات
	مغز شہ تر کند بآبِ حیات

مولانا کے ہاں لفظ منجوق کا ایہام ایسا دقیق اور لطف انگیز ہی اور اُس کو یہاں ایسے مخفی استعارہ کے پہلو سے بیان کیا گیا ہی کہ اُس کا مذاق اہل زبان سے دریافت کیا جا سکتا ہی۔

پھر لفظ درکشید و برکشید میں ایسی فصاحت موجود ہے جو سہل ممتنع کی ایک بے مثل مثال ہی۔ مقصود یہ ہے کہ سورج غروب ہوا۔ اور آسمان پر چاند نکلا۔ اس کے لئے جو اہتمام کیا گیا اور جس آمد و بے تکلفی سے ادا کر دیا وہ مولانا کے کمال کا نمونہ ہے

خسرو علیہ الرحمۃ کا بھی وہی مقصد یعنی یہی سورج چھپ گیا رات ہوئی اور چاند نکلا لیکن انصاف طلب یہ امر ہی کہ مقابلہ میں منہ کھولنا اور وہ بھی مولانا جیسے اہل زبان کے سامنے اور پھر بازی میں پیچھے نہ رہنا سوائے خسرو کے اور کس کو نصیب ہوا۔

پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ اوّل مصرعہ کے ساتھ ہمکناری کا جو لطف ظاہر کر رہا ہی اُس کے علاوہ ایسے خاص لطیف استعارہ کا حامل ہے کہ اُس کی داد مولانا نظامی ہی دے سکتے ہیں۔

خسرو کا ہر ایک شعر مقابل کا جواب الجواب بلکہ لاجواب واقع ہوا ہے۔ لیکن نگاہ منصفانہ شرط ہی۔

ایک اور موقع

اگرچہ ایک مثال بھی اپنے مقام پر کافی ہوتی ہے لیکن بعض اہلِ خیال کا خیال کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور مثال بھی پیش کر دی جائے۔

خسرو	نظامی
چوں شب تیرہ گشت گوہر سنج	چوں پری سبزۂ زمرد وار
در زمیں در شد آفتاب چو گنج	باغ انجم فشاند برگ بہار
شاہ مست و حریف ہم سرمست	زاں خردمند سروِ سبز اورنگ
رفتہ بیروں عنانِ ہر دو ز دست	خواست تا پر شکر فشاند تنگ
گفت فرمان دہ سریر بلند	
کہ شکر لب ز پستہ ریز د قند	

مولنا نظامی کے یہاں اوّل شعر میں شب کا ہونا اور دوسرے شعر میں اُس نازک اندام محبوبہ سے قصہ کی فرمایش جس آب وتاب سے بیان ہوئی ہے وہ تمام الفاظ کے تناسب و تقابل سے ظاہر ہے خاص کر بہرام کو سروِ سبز اورنگ کے ساتھ استعارہ کرتے ہوئے اُس کی زبان سے یہ کہنا "خواست تا پر شکر فشاند تنگ" کس قدر باحلاوت وشیریں تقریر ہے۔ خسرو علیہ الرحمۃ کے اشعار میں اگرچہ گنبد سبز کے تلازم کو نظر انداز کر دیا گیا ہی مگر ایک ہندی شاعر ایک ایرانی کے مقابل کہتا ہی کہ (در زمیں در شد آفتاب چو گنج) اور قند مکرر کی شکر ریزی یوں کرتا ہے (کہ شکر لب ز پستہ ریزد قند) واقعہ ہے کہ اگر ارباب سماع پر کیف ہوں تو یقیناً یہ سمجھیں گے کہ یہ طوطی ہند نہیں ہے بلکہ بلبل شیراز چہک رہا ہی۔

خسرو کے اسی زور قلم کا نیتجہ ہے جو اہل زبانوں نے بھی ان کے سامنے سر تسلیم

ختم کر دیا ورنہ اہلِ زبان کب کسی زبان داں کو خاطر میں لاتے ہیں۔

اشعار دعائیہ

ہر شاہزدی نے جو آغاز داستان سے پہلے بہرام کو دعائیں دی ہیں ایک دو نمونے اُس کے بھی ہدیۂ ناظرین ہیں۔

ملکہ گنبد ریحانی

نظامی	خسرو
پری آنگہ کہ بردہ بود نماز	لعبتِ سیم با ہزار نشاط
بر سلیماں کشادہ پردۂ راز	سو درخ را بہ پائگاہ بساط
گفت کاے جانِ من بجانِ توشاد	گفت شاہا جہاں بکام تو باد
ہمہ جانہا فدائے جان تو باد	در جہاں ہر چہ ہست رام تو باد
خانۂ دولت ست خرگاہت	ہر کہ بد بیندت چو بدبیناں
تاج و تخت آسمان درگاہت	دوزخی باد ہمچو بے دیناں
تاج را سر بلندی از سرِ تست	
تخت را بادشاہی از درِ تست	
گوہرت عقد مملکت را تاج	
ہمہ عالم بدر گہت محتاج	

مولنا کے اشعار میں نماز بردن خاص اہلِ زبان کا محاورہ ہے جو اُن کی ہی زبان سے

بھلا معلوم ہوتا ہے معنی اس کے اطاعت کرنے کے ہیں۔ پری وسلیمان کا تقابل وتناسب بھی اک خاص لطف پیدا کرتا ہی باقی مضمون دعا معمولی ہے کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں۔

اشعار خسروی کی بندش صاف اور چست ہی مگر دعا کا مضمون یہاں بھی معمولی وسادہ ہی لیکن دوسرے مصرعہ میں جو محاورہ آداب بجالانے کے معنی میں ذکر کیا ہے وہ مولنا نظامی کے پہلے شعر کے اُس محاورہ کا جواب ہی جو اہل زبان کے ساتھ خاص ہی۔

ایک اور مثال

نظامی	خسروؔ
چوں ز فرماں شہ گزیر نبود	نازنیں بر زمیں نہاد جبیں
عذر با نار دلپذیر نبود	گفت کاے شہریار روے زمیں
گفت رومی عروس چینی راز	بخت ہموارہ ہم عنان تو باد
کاے خداوند روم و چین طراز	سر بدخواہ بر سنان تو باد
تا شدی زندہ دار جان ملوک	ہر مرادی کہ بشمری زانگشت
عز نصرت خدائگان ملوک	یک بیک جملہ بادت اندر مشت
ہر کہ جز بندگیت راے کند	شرم دارم کہ پیش دُرّ دُری
سر خود را نثار پاے کند	کہربا را کشم بجلوہ گری

مولنا کے پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ "عذر بانار دلپذیر بنود" آپ کی فصیح البیانی کا خاص نمونہ ہے طراز ترکستان کے شہروں میں ایک حسن خیز شہر ہے جس کا ذکر اس جگہ ایک لطف پیدا کر رہا ہے۔ دعا کا پہلو جو اختیار کیا گیا ہے اُس کی بلاغت بھی قابل تحسین ہے بظاہر کوئی فعل دعا پر دلالت نہیں کرتا ہے اور حقیقت میں سب دعا ہے۔

امیر خسرو کا تیسرا شعر ہزاروں اشعار دعائیہ کا جواب ہے تمامی مرادات کے حصول کے مضمون کو شاعر قادر الکلام نے جس خوبی سے بیان کیا ہے اُس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو جس صنعت و خوبی کے ساتھ بیان کرنا چاہے بے تکلف اُسے ادا کر سکتا ہے۔

پھر آخر شعر میں دُر دُری کا باہمی صنعت تجنیس و اشتقاق کی جلوہ گری اُس پر کہربا کے ساتھ تقابل قابل دید ہے دری بضم دال مہملہ بمعنی ستارہ روشن کے ہے اضافت تشبیہی کے نسبت سے دربالضم کا مضاف الیہ بنانا کیسی پاکیزہ ترکیب اور زبان دری کی کیسی چست بندش ہے۔

ساتوں قصّوں میں مضامین مشترکہ کا مقابلہ ضرورت سے زیادہ کر کے دکھا دیا گیا جس سے ثابت ہے کہ مولنا نظامی کو تقدم زمانی کا شرف خسرو علیہ الرحمۃ پر حاصل ہے۔ ورنہ خسرو کی مثنوی کسی طرح اپنا پایہ کم نہیں رکھتی ہے۔ کہیں نظامی کو ترجیح ہے اور کہیں خسرو کو ہاں کہیں کہیں بعض محاورات اہل زبان کی خصوصیت البتہ ظاہر کرتے ہیں مثنوی کا خاتمہ دونوں حضرات کے یہاں بہرام کی موت نے کر دیا ہے۔ گورخر کے

تعاقب میں بہرام کوئیں میں گر کر موت کا خود ہی شکار ہو جاتا ہے مولنا نظامی اپنی کتاب بادشاہ کے دُعائیہ اشعار پر ختم فرماتے ہیں۔

نظامی

دولتی باش ہر کجا باشی | در رکابت فلک بفرّاشی
دولتت را کہ از دیادت باد | خاتمِ کار با سعادت باد
این دعا را ز قدسیاں آمین | میرسد ہر زمان بعلیین

خسرو علیہ الرحمۃ کی مثنوی جہاں ختم ہوئی ہے وہاں ناصحانہ اشعار لکھتے ہوئے اپنے شیخ طریقت کی طرف عجب اخلاص و ارادت سے ملتفت ہوئے ہیں۔

خسرو

خسروا پائے نیک مرداں گیر | با مسیحا نشین و پیش بمیر
باید ت خانۂ حیات درست | از خضر باید آب حیواں جست
خواہی از خاک بر سپہر خرام | خاک شو زیر پائے شیخ نظام

اس کے بعد خسرو نے اپنی کتاب کا تمام ہونا سنہ تصنیف تعداد اشعار وغیرہ بیان کئے ہیں آخر میں اپنے اُستاد علاّمہ شہاب کا شکریہ ادا کیا ہے مولنا شہاب علاء الدین خلجی کے عہد میں ایسے جامع معقول و منقول فاضل جلیل الشان تھے کہ اکثر فضلا نے آپ کے تلمذ سے شرف حاصل کیا تھا۔

خسرو علیہ الرحمۃ کا معمول تھا کہ اپنی تصنیف جس طرح کہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے

سامنے فاتحہ کی غرض سے پیش فرماتے، اُستاد علاّمہ کے ہاتھوں سے بھی اُسے مشرف کرتے تھے۔ یہ خصوصیت کچھ خمسہ کے ساتھ نہیں ہے۔ اعجازِ خسروی کے متعلق بھی ایسے ہی کلمات خسرو علیہ الرحمۃ نے تحریر فرمائے ہیں کہ شہاب نے تمام اغلاط کے جنون کو اپنے قلم اصلاح سے بند کر دیا ہے اب کوئی اس میں کسی طرح کی غلطی نہ پائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ خسرو علیہ الرحمۃ کی تصانیف عجیب گوناگوں فوائد و برکات سے مالا مال ہیں اُنھوں نے اشعار کے ضمن میں بہت سے اہم اخلاقی مسائل کی تعلیم فرما دی ہے کہیں والدہ ماجدہ سے جو ملے ہیں اُسے نظم کیا ہے تاکہ لوگ شفقتِ مادری کو جانیں اور ماں کا حق اپنی سعادت سے ادا کریں کہیں بھائی کا مرثیہ لکھکر اخوت کے حقوق بتائے ہیں کہیں اُستاد کی تعلیم کا شکریہ ادا کیا ہے۔ چنانچہ اس مثنوی میں حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے اُستاد کے فضل و کمال کا ایک بلیغ خطبہ پڑھتے ہیں اُس کے بعد فرماتے ہیں ؎

نور دل چوں بعالم افگندہ	سایہ بر کار من ہم افگندہ
من بدو عرضہ کردہ نامۂ خویش	او باصلاح راند خامۂ خویش
چوں ہمہ عیب دید دشمن وار	شستہ چوں دوستانِ آئینہ وار
ہرچہ او گفت می نہادم گوش	برکشیدم مگس زشربتِ نوش
وانچہ بنمود من نجستم پے	عیب آں بر من ست نے بر وے
انچہ او دید بس نہایت دید	خس و خارے زگلشنے برچید

یارب او چوں بہ پنج نامۂ من　　بر و بیروں خطائے نامۂ من

نامۂ او کہ حرز جانش باد　　در قیامت خطِ امانش باد

امیر خسرو علیہ الرحمۃ کے کلام کا مقابلہ امام مثنوی گویان مولنا نظامی کے ساتھ جب دکھا دیا گیا تو اب کسی اور کے کلام سے مقابلہ کرنا ایک عبث فعل ہوگا۔

اس لئے کہ خسرو کے بعد اگر کسی نے مثنوی کا حق ادا کیا ہے تو وہ صرف جامی علیہ الرحمہ ہیں لیکن اُنھوں نے اس داستان کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ اس بحر میں آپ کی مثنوی سلسلۃ الذہب ہی لیکن وہ خالص صوفیانہ رنگ میں ہی۔ حمد و نعت بھی اُس مثنوی میں مولنا نے گہرے صوفیانہ رنگ میں لکھی ہی۔ بعضوں نے ہموزن کو ہم رنگ سمجھ لیا اس لئے وہ لکھ گئے کہ سلسلۃ الذہب ہفت پیکر و حدیقہ کے ہم رنگ ہی۔ خیر اس طرح کی غلطی مقلدین سے نقل کرنے میں ہو ہی جاتی ہی۔

یہاں یہ مقصود ہی کہ خسرو کے کلام کا مقابلہ ان کے مابعد کے شعرا سے کرنا ایک فضول امر ہے بدیں وجہ ہاتفی کی ہفت اورنگ سے مقابلہ نہیں کیا گیا لیکن بہ نظر مقابلہ خواجو کرمانی اور ہاتفی دونوں کی مثنویاں مطالعہ کی گئی تھیں اس لئے محض چند اشعار دونوں کے حمد و نعت سے نقل کرتا ہوں ناظرین کرام اسی سے ایک سرسری اندازہ کرسکیں گے۔

ہفت منظر ہاتفی

حمد

سایۂ آفتاب نہ خورشید　　آفتابِ تو سایۂ جاوید

مسجد و دیر را تو کردی ساز | در ایمان و کفر کردی باز
دیری و مسجدی ترا جویند | گرچه هر یک درِ دگر کوبند
جمله موجود را توی معبود | هستی و بودهٔ و خواهی بود
پشّه را دہی ز مطبخ جود | طعمه از مغز کلّهٔ نمرود
از پئے دیدن سیاه و سفید | نے چراغت بکار و نے خورشید
دیدنِ تو چو دیدنِ ما نیست | وان شنیدن شنیدنِ ما نیست
تاج شاہان و خسروانی کوس | ہست بر درگہت چو تاج خروس

مناجات

روزِ محشر که سر زنم از خاک | سینه صد پارهٔ و گریباں چاک
پیش آیم ز جرم فرسوده | پائے تا سر گناه آلوده
نکنی کردهٔ مرا منظور | رحمتِ خویش آوری بظہور
دانم ایں را که جمله بد کردم | بد من سر نوشت خود کردم
در ازل ہر چه کرده ام تقصیر | بنود غیر کردنش تدبیر
رحمت از ہاتفی دریغ مدار | ز فنایش بزیر میغ مدار
نیز طبعش کنی ز جمله غنی | در ثنائے محمّدِ مدنی

نعت و معراج

اے بلند از تو پایهٔ معراج | انبیا را سر اولیا را تاج

قریشی تخت و ہاشمی افسر — ابطحی رائے و یثربی مہتر
شہ بطحا محمدِ عربی — پے شرار تو شرار بولہبی
ماہ مشرق طلوع عالمگیر — نور گیر از تو آفتاب منیر
نہ نشست کسے بہ بالا دست — زیر دست تو بود ہر کہ نشست
خضر آبِ رواں ز جوئے تو یافت — سوئے آں چشمہ رہ بسوئے تو یافت
رفت عیسٰی اگر بچرخ کبود — بودی از وے ہزار پایہ فزود
اے خوش آں شب کہ آں ہلال صبا — سوئے اقصا نہاد رخشت پائے
سر و طورِ تجلّی ذاتی — بہر ماہِ رخ تو مرآتی
آں شنیدی ہزار گونہ کلام — نہ زباں بود در میان نہ کام
سخنانش نداشت پیش وے لبے — ہمہ بودند جمع ہم نفسے
خواہش دل ز حد برونت داد — انچہ می خواستی فزونت داد
شد یقینت کہ خانہ بے غیرست — مژدہ دادت کہ عاقبت خیرست
سفرت بود طرفۃ العینی — آں شد آمد نداشت مابینی
کس و بیکس گناہگارے چند — بامیدِ شفاعت خرسند
گر شفاعت گری بجا آری — نیست اندیشہ از گنہگاری

خواجو کرمانی

حمد

بسمِ من لا الٰہ الّا ہُو — صنع لفظی و زین معناہ

قادرے کو منزہ است از عیب | صانع کو مقدس است از ریب
رزمہ پرداز کارگاہ وجود | نقش بند نگارخانۂ جود
آنکہ ہم اوّل است وہم آخر | وانکہ ہم باطن است وہم ظاہر
روح در کیش اوست قربانی | کفر در دین او مسلمانی
عقل قاصر ز کنہ آلایش | وہم عاجز ز حصر نعمایش
خلعت جاں بہ انس و جاں دادہ | وآب حیواں بخضر جاں دادہ
حسن ذاتش نگر بحسن صفات | در صفاتش ببیں تجلی ذات
آنکہ روزی بمور و مار دہد | روشنائی بہ نور و نار دہد
برقع از صورت سخن بکشاد | شمع معنی بدست خواجو داد
اے ز دل کردہ شمع منظر گل | وے ز گل کردہ برج اختر دل
بدر لالہ کہ ہست قاصد شام | در رہت بندۂ منیرت نام
مہدی مہد خاک یعنی روح | یافتہ از تو زندگانی روح
اے ز عشق تو عقل شیدائی | ہمہ پنہانیت ز پیدائی
ابتدائے ترا نہایت نیست | وانتہائے ترا بدایت نیست
من دل مردہ را حیاتی بخش | وز غم نیستی نجاتی بخش
بے نوایم مرا نوائے ساز | در دمندم مراد وائے ساز
شربت از مشرب یقینم دہ | میوہ از بوستان دینم دہ

در توحید بر دلم بکشائے — رہِ ایوان وحدتم بہ نمائے

خانۂ غفلتم زبر برکش — دامنِ عصمتم بسر درکش

عالمِ ہستیم بباد مده — خرمنِ ہستیم بباد مده

مُرغ طبع مرا بگلشن راز — بلبلِ پردہ سازِ معنی ساز

ظلمتِ ظلم از رواں بفزائے — وآب حیوانم از زباں بکشائے

ملک معنی مسخرم گرداں — حکم و حکمت میسرم گرداں

دلِ خوآجو ز شمع دل بفروز — چشم تجریدش از جہاں بردوز

نعت

اے رُخ ماہ مطلعِ لولاک — وے بقد سرو گلشنِ افلاک

سیدِ انبیا پناہ رسل — مقصدِ کن فکاں امام رسل

نبیِ ہاشمی رسول خدائے — مُرغ دستاں سرائے ہر دو سرائے

حجۃ حق خلاصۂ کونین — رحمتِ خلق و ہادیِ ثقلین

شمع بطحی چراغ بیت حرم — صدر و بدرِ جہاں جہان کرم

راہ بنمائے الذی اسریٰ — مجلس آرائے قصر ما اوحیٰ

مروہ را زینت و صفا از تست — رونقِ ملک اصطفا از تست

تو کماں دار قاب قوسینی — عرش را زیب و فرش را زینی

بوالبشر خوشہ چینِ خرمنِ تو — روضہ خرم بہ بوئے مسکنِ تو

شرفِ بامِ کبریائت مہر	کاسہ ریزِ مطبخ تو سپہر
تو مہ و مطلع تو اوجِ فلک	توشہ و لشکر تو فوج ملک
خادمِ خوانِ دعوتِ تو خلیل	مرغِ باغِ نبوتت جبریل
کشتۂ تیغِ غمزۂ تو ذبیح	وز دمت روح پروریدہ مسیح
آستانِ تو سجدہ گاہ فلک	و آستیں تو بوسہ جائے ملک
سدرہ رامنتہا تو دیدن وبس	گل باغِ دنا تو چیدن وبس
گر یتیمی چہ غم کہ از تعظیم	بیش باشد بہائے درِّ یتیم
دمبدم چشم ما کہ رفت برود	می فرستد بروضۂ تو درود
رفتم از دست عذر من بپذیر	سر براور زخاک و دستم گیر
در حریم شفاعتم بہ نشاں	و آستیں بر بضاعتم مفشاں
کار خواجو چنیں خراب مہل	زو رقش درمیان آب مہل
بکشایش درِ سرائے اماں	برسانش بمنتہائے رساں

خواجو کرمانی کی یہ مثنوی اخلاقی و صوفیانہ ہے چھوٹے چھوٹے اخلاقی مضامین پند و موعظت کے اس میں لکھے ہیں۔

حمد و نعت میں جو اشعار کہ ہم معنیٰ و مضمون واقع ہوئے ہیں اُنھیں اگر خسرو سے ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ تمام مثنوی نگار خسرو سے بمراحل دور ہیں۔

تائید تنقید از بہارستان جامی

بہارستان جامی میں سخن سنج جام نے امیر خسرو علیہ الرحمہ کی قادر الکلامی کی جو داد دی ہے وہ فقیر کے دعوی پر ایک روشن برہان ہے۔ فرماتے ہیں۔

"امیر خسرو علیہ الرحمہ در شعر متفنن است قصیدہ و غزل و مثنوی ورزیدہ و ہمہ بکمال رسانیدہ۔ تتبع خاقانی می کند ہر چند در قصیدہ بہ وے نہ رسیدہ امّا غزل از وے گذرانیدہ وغزل ہائے بواسطہ معنی آشنا کہ ارباب عشق و محبت بحسب ذوق و وجد آں خود را در می یابند. مقبول ہمہ کس افتادہ است خمسہ نظامی بہ از وے کسے در جواب نگفتہ و ورائے آں مثنویہا دیگر دارد ہمہ مطبوع و مصنوع"

اب بعد اس کے کہ ایسی زبردست شہادتیں کمال خسروی کے متعلق پیش کی جاچکیں۔ اصناف سخن کا بھی ایک نمونہ پیش کر دیا گیا خصوصیت کے ساتھ صنف مثنوی میں مولنا نظامی کے کلام سے مقابلہ بھی کر کے دکھا دیا گیا ان مراحل کے بعد شاید اس دعوی کی تصدیق میں کہ خسرو کا وجود نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلام میں ایک جوہر فرد ہے کوئی شک و شبہ نہیں رہ جاتا۔ اب رہی یہ بحث کہ اس طرح کی جامعیت اور کمالات گوناگوں کے کیا وجوہ ہوئے اس کے لئے صرف حضرت سعدی کا مشہور فیصلہ کفایت کرتا ہے ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

کمال خسروی کے متعلق روایات عجیبہ کی وجہ

ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام سے پیشتر دنیا اس خبط میں مبتلا ہے کہ جہاں کسی فرد بشر میں کوئی قوت عامۂ ناس سے زیادہ ہوئی بس اوسے خدا یا خدا کا بیٹا قرار دیا گیا

چنانچہ حکماے یونان میں سے فلاطون وغیرہ اسی لقب کے مستحق سمجھے گئے۔ آج یورپ باوجود اس کے کہ علم وفن میں اپنے کو انتہا مرتبۂ کمال پر سمجھتا ہے لیکن کیا مجال کہ اوس قدیم خبط سے ہوش میں آسکے وہی رٹ لگی جاتی ہے کہ عیسی خدا ہے خدا کا بیٹا ہے۔

لیکن تعلیمات اسلامیہ نے جبکہ دنیا کے عقول صحیح کر دیے تھے تو کسی کو یہ جرأت تو نہو سکی کہ کسی صاحب کمال کو اس لقب سے یاد کر سکے لیکن پھر بھی جب کسی کے لئے غیر معمولی کوئی وصف ثابت کیا جاتا تو اوس کے لئے غیر معمولی وجوہ بھی تراشے جاتے۔

اگر خسرو علیہ الرحمہ جیسا شخص اسلام سے قبل دنیا میں آیا ہوتا تو اوس کے محیر العقول کمالات بھی ملک و قوم سے اوسی لقب کی سفارش کرتے جو ایسی باکمالوں کو ملک و اہل ملک کی جانب سے ملا کرتا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ کسب واکتساب تعلیم وتعلّم سے جہاں تک طبیعت میں ملکہ اور قوائے دماغی کی تربیت علی العموم ہوسکتی ہے اوس مقدار خاص سے اگر کسی کی طبیعت میں ملکہ یا دماغی قوت میں نشو ونما زیادہ پایا گیا تو پھر اوس کے بیان وجوہ میں عجیب غریب رنگ آمیزی کی جاتی۔

خواجہ حافظ شیرازی اور مولانا نظامی کے متعلق جو روایات کہ عوام میں مشہور ہیں وہ اثبات دعوی کے لئے کافی ہیں۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ اکتساب کمال کے لئے جہاں صحیح استعداد طلب کامل محو و انہماک شرائط و لوازم ہیں وہاں نفوس قدسیہ اور ارواح زاکیہ کی توجہ و دعا بھی ایک اثر خاص رکھتی ہے۔

خواجہ حافظ و مولانا نظامی وغیرہ چونکہ زمرۂ صوفیہ میں ہیں اس لئے ان حضرات نے اپنے عہد کے شیوخ سے ضرور استفادہ و استفاضہ دعاے مقبول کا فرمایا۔ یہ اونھیں بابرکت دعاؤں کا اثر ہے کہ ان حضرات کے قلم نے معارف و حقائق کے ایسے مینہ برسائے کہ آج تک رہروان معرفت اُن سے سیراب ہو رہے ہیں۔

عوام نے اونہیں برکات و فیوض کو اپنے الفاظ میں اس طرح شہرت دی جس سے رفتہ رفتہ واقعہ طلسمی افسانہ بن گیا۔ اور اصل حقیقت مخفی ہو گئی یہ نتیجہ اوسی استعجاب کا ہے جو حافظ و نظامی کے شاعرانہ کمال نے عوام میں پیدا کر دیا تھا اس طرح کی روایات سے گو واقعہ کی صورت مٹ جاتی ہے لیکن یہ ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ اوس کا کمال غیر معمولی تسلیم کیا گیا۔

ایسی صورت میں پھر اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ خسرو علیہ الرحمہ جیسے جامع کمالات کے متعلق اس طرح کی روایتیں مشہور نہ کی جاتیں عوام میں کیا کیا مشہور رہے اوسے ہم عوام ہی کے حوالہ کرتے ہیں ہاں جو واقعہ نفس الامر ہے اس مقام پر ہدیۂ ناظرین ہے۔

امیر سیف الدین جو خسرو علیہ الرحمہ کے والد ماجد ہیں اونہیں قصبہ پٹیالی عرف مومن پور یا مومن آباد ضلع ایٹہ میں جاگیر عطا ہوئی تھی۔ وہاں ایک ولی کامل مجذوب

حال رہا کرتے تھے خسرو علیہ الرحمہ کے والدین اون کے معتقد و خدمت گذار تھے جب
خسرو علیہ الرحمہ پیدا ہوے تو آپ کے والد ایک خرقہ میں لپیٹ کر اس مولود مسعود کو اوس
صاحب ترک و تجرید کے پاس لے گئے وہ واقف اسرار دیکھتے ہی یہ الفاظ زبان پر لایا
"آوردی کسے را کہ از خاقانی دو قدم پیش خواہد برد"

یہ روایت تقریبًا ہر اوس کتاب میں موجود ہے جس میں خسرو علیہ الرحمہ کا تذکرہ ہے
شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اخبار الاخیار میں مجذوب کے اس جملے کو نقل فرما کر
اس کا مطلب یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ "قصد آں مجذوب از دو قدم مثنوی و غزل باشد" یعنی
خاقانی صرف قصائد میں اوستاد تھا اور اس کا کمال علاوہ قصائد کے مثنوی اور غزل میں بھی ہوگا۔

اس روایت کی نقل سے مدعا یہ ہے کہ ایک صاحب حال واقف اسرار آگاہ
حقیقت ولی کامل کے منہ سے ایسے بابرکت مژدہ کا نکلنا ایک ایسی دعاے مستجاب تھی
جس کے حاصل کرنے کے لئے خسرو ہی جیسا بلند طالع مولود ہو سکتا ہے۔

دوسری یہ روایت ہے کہ جب خسرو علیہ الرحمہ تعلیم سے فارغ ہوئے اور آپ کی
شاعری کا عہد شباب شروع ہوا تو اوس وقت آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ
اگر حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت نصیب ہوتی تو اُن سے لعاب دہن کی التماس کرتا تاکہ
اوس کی برکت سے کلام میں حلاوت و شیرینی پیدا ہوتی۔

اعجاز سخن اور شیخ طریقت کا فیض

چنانچہ ایک روز جب کہ دولت زیارت حضرت خضر کی نصیب ہوئی تو اُن سے
اپنی دلی تمنا کا اظہار نیاز مندانہ کیا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا
کہ "ایں بچہ شیراز برد" یعنی شیرینی سخن کی دولت

شیخ سعدی شیرازی کو نصیب ہو چکی۔ اس مایوس کن جواب سے خسرو علیہ الرحمۃ شکستہ خاطر ہوئے اور شیخ طریقت حضرت سیدنا نظام الدین محمد سلطان الاولیا قدس اللہ سرہ العزیز کی خدمت میں صورت واقعہ دردانگیز لہجہ میں عرض کی۔ شیخ رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ شکستہ خاطر ہونیکی کیا بات ہے حلاوت سخن میں عطا کئے دیتا ہوں چنانچہ آپ نے چند پارے مصری کے خسرو کی سر سے نچھاور فرمائے اور ایک ٹکڑا آپ کے منہ میں بھی ڈالدیا۔

بعض یہ کہتے ہیں کہ خسرو علیہ الرحمۃ جب حضرت شاہ بوعلی قلندر پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اوس وقت اون سے لعاب دہن کی التماس کی ہی شاہ بوعلی قلندر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ شیرینی تو سعدی کے حصہ کی ہو چکی نمکینی باقی ہے یہ فرمایا اور ایک کنکری نمک کی اپنے منہ میں ڈالکر پھر اوسے خسرو کے منہ میں ڈالدیا۔

جب شاہ بوعلی قلندر رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت سے خسرو واپس تشریف لائے تو اسوقت اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کیا اور شیرینی سخن کے طالب ہوئے اُسوقت حضرت نظام المشائخ نے مصری کھلائی اور حلاوت سخن عطا فرمائی۔

صاحب سیر الاولیا مولنا سید محمد کرمانی المعروف بامیر خرد جو امیر خسرو علیہ الرحمۃ کے معاصر ہیں اور شیخ المشائخ حضرت سلطان الاولیا کے مرید و خلیفہ بھی ہیں سیر الاولیا میں تحریر فرماتے ہیں کہ "روزے در مدح سلطان المشائخ پیش سلطان المشائخ شعرے گذرانید فرمان شد کہ چہ میخواہی چون ہوس سخن در نظم داشت شیرینی سخن خواست فرمان شد کہ آں طاس شکر کہ زیر کھٹ ست بیار و سر خود نثار کن و قدرے ازاں بخور امیر خسرو ہم چناں کرد لاجرم شیرینی سخن او شرق و غرب عالم گرفت" سیر الاولیا کی روایت الختاف اصل حقیقت میں سب روایتوں سے زیادہ

قابل وثوق ہے۔ اگرچہ بہت ممکن ہے کہ عطاے شیرینی کی دولت چند بار نصیب ہوئی ہو اور جس کو جو روایت پہونچی اوس نے اوسی کو نقل کیا۔

لیکن خود امیر خسرو علیہ الرحمہ مثنوی نہ سپہر میں ایک اشارہ کرتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ جامعیت اور زور کلام خود شیخ طریقت حضرت نظام المشایخ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی بذل و نوال کا صدقہ ہے فرماتے ہیں

من از وے لعاب دہاں یافتم — کزاں گونہ آب دہاں یافتم

دو قطرہ ازاں در دوات افگنم — تظلم در آب حیات افگنم

اسمیں کوئی شک نہیں کہ خسرو علیہ الرحمہ نے جہاں اور برکات مخصوصہ اپنے شیخ سے حاصل کیں وہاں حلاوت سخن بھی شیخ کی دعاء مقبول کی بدولت حاصل کی۔ رہی یہ بحث کہ خاصان خدا کی دعا یا لعاب دہن میں یہ قوت و تاثیر ممکن بھی ہے یا نہیں اس مقام پر ایک امر زاید ہے اور موضوع سے بہت دور جاتا ہے جس سعید ازلی کو نفوس قدسیہ کی مقدس و مقبول دعائیں نصیب ہوئی ہیں وہی خوب جانتا ہے کہ "رب اغبر اشعث لو اقسم باللہ لابرہ" جو ایک زبردست بشارت صادق و مصدوق ہے وہ کیا کچھہ قوت و تاثیر رکھتی ہے اور جو شخص اس نعمت عظمیٰ سے محروم ہے وہ اگر انکار کرتا ہے تو اوس کی محرومی اوس کی عذر خواہ ہے ع

ہر کہ ایں کار ندانست در انکار بماند

واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی نبیہ الکریم وعلی الہ واصحٰبہ اجمعین ط

حررہ بعبد تسلمہ
فقیر محمد سلیمان اشرف عفی عنہ
بہار شریف۔ محلہ میرداد ضلع پٹنہ